محاکمہ

دیوانِ غالب نسخۂ لاہور (مسروقہ)

مرتبین
پروفیسر جعفر بلوچ
رفاقت علی شاہد

محاکمہ

دیوانِ غالب نسخۂ لاہور (مسروقہ)

جلد اوّل حصّہ اوّل

مرتبین

پروفیسر جعفر بلوچ رفاقت علی شاہد

عِلم و عرفان پبلشرز

C-7 ماتھر سٹریٹ لوئر مال روڈ لاہور فون: 7352332

E-mail:waqas_g_1999@yahoo.co.uk

کتاب	محاکمہ (جلد اول، حصہ اول)
	دیوانِ غالب نسخۂ لاہور (مسروقہ)
مرتبین	پروفیسر جعفر بلوچ، رفاقت علی شاہد
ناشر	علم و عرفان پبلشرز لاہور
کمپوزنگ	فراز کمپوزنگ سنٹر اردو بازار لاہور
مطبع	رحمانیہ پرنٹرز، لاہور
اشاعت اول	جون 2001ء
قیمت	=/200 روپے

ملنے کا پتہ

علم و عرفان پبلشرز

C-7 ماتھر سٹریٹ لوئر مال روڈ لاہور۔ فون: 7352332

E-mail:waqas_g_1999@yahoo.co.uk

Scanned with CamScanner

انتساب

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے نام

جنہوں نے دیوانِ غالب نسخہٗ لاہور کا پہلا تعارف لکھا

فہرست

حصہ اول : کتابچے

حصہ دوم : مضامین اور تبصرے

حصہ سوم : کالم

حصہ چہارم: متفرقات

حصہ پنجم: ضمیمہ

سرِ متن — پروفیسر جعفر بلوچ

مقدمہ — خلیل الرحمٰن داؤدی

سرِ متن

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

حضرت غالب کے یہ ارشادات بجا ہیں لیکن ذرا وضاحت طلب ہیں۔ تیسرا مصرع واضح طور پر 'نہی عن المنکر' کی ترجمانی کرتا ہے لیکن باقی تین مصرعوں کے مضامین ذاتی اور انفرادی حوالے ہی سے درست ہیں اور یہی غالب علیہ الرحمہ کا منشا معلوم ہوتا ہے۔ جس برائی کا اثر اجتماع یا سوسائٹی پر پڑتا ہو، اس سے انفرادی طور پر اعراض و اغماض کرنے یا اسے انفرادی طور پر بخش دینے کا اختیار کسی کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

ادبیات میں سرقہ و دزدی اور جعل سازی کی روایات بہت پرانی ہیں لیکن انھیں کسی زمانے اور کسی خطے میں جائز یا مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ ادب کے نام پر ہونے والی بدعنوانیوں پر گرفت، مختلف اسالیب میں، ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ فارسی اور اُردو زبانوں کے ادب میں بھی اس مواخذہ کی بیسوں یا پچاسوں نہیں، سیکڑوں مثالیں موجود ہوں گی۔ موجودہ زمانے میں تو علمی چوریوں چکاریوں، ادبی ڈکیتیوں، فکری و ذہنی اٹھائی گیریوں اور لفظی و معنوی اچک بازیوں کا گراف کچھ اور بھی بلند ہوا ہے، اور یہ صورت حال علمی و ادبی اور تہذیبی ارتقا کے حوالے سے نہایت برا شگون ہے۔

ہمارے ''ممدوح'' ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب، جو سوءِ اتفاق سے ''ایشیا'' کی عظیم درس گاہ گورنمنٹ کالج، لاہور کے صدر شعبہ اُردو بھی ہیں، ایک طویل عرصے سے متعدد سنگین علمی و ادبی بدعنوانیوں میں ملوث چلے آتے ہیں اور ان کی ان نا مطبوع بلکہ

مذموم وارداتوں کا طویل سلسلہ، گزشتہ کئی برسوں سے ارباب علم و ادب کے لیے عبرت و اذیت کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان کی صغیرہ لغزشوں سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں ان کے چند کبائر کی طرف صرف سرسری اشارے کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

(i) انھوں نے ذوق شعر وسخن سے بے نصیب ہونے اور تحسین شعر کی صلاحیت سے بے بہرہ ہونے کے باوجود غالب اور اقبال جیسے عظیم اور آفاقی شعرا کو اپنی ہوس نقد ونظر کا نشانہ بنایا ہے۔

(ii) انھوں نے اپنی ایک شاگرد بشریٰ باسط کے ایم اے کے مقالے" ادا جعفری ---- شخصیت اور شاعری" کے بعض ابواب کو اپنے نام سے رسالہ "نقوش" لاہور میں شائع کرایا ہے۔

(iii) انھوں نے بھارت کے معروف غالب شناس پرتھوی چندر کی محنت شاقہ اور خوش سلیقگی سے مرتب کی ہوئی ایک مطبوعہ مگر نایابی کی حد تک کمیاب کتاب "جاگیر غالب" کے ٹائٹل سے پرتھوی چندر کا نام غائب کر دیا اور اس کے بجائے بطور مرتب اپنا نام داغ دیا۔

(iv) موصوف کا تازہ کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۹۸ء میں انھوں نے "دیوان غالب" کے ایک قلمی نسخے کو، جس پر خود حضرت غالب کے ہاتھ سے بعض ترامیم و اصلاحات بھی ہیں اور جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی ملکیت تھا، "دیوان غالب، نسخۂ خواجہ" کے نام سے اپنی تحقیق اور دریافت کے طور پر شائع کر دیا۔ یہ اہم اور گراں بہا نسخہ قبل از ۱۹۵۴ء سے پنجاب یونیورسٹی کی ملکیت چلا آرہا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے جولائی ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ "ماہ نو" کراچی میں اس نسخے کا تعارف کرایا تھا اور تعارفی مضمون کے ساتھ اس نسخے کے دو صفحوں کے عکس بھی شائع کرا دیے تھے۔ بعد میں معروف اور نامور محقق قاضی عبدالودود اسی نسخہ "دیوان غالب" کا روٹو گراف بھارت لے گئے تھے اور انھوں نے بھی اس نسخے کا تعارف "نقوش" لاہور کے شمارہ ۶۹-۷۰ (بابت اکتوبر ۱۹۵۸ء) میں کرایا تھا۔ غالبیات کے ایک اور ممتاز محقق و نقاد جناب امتیاز علی خاں عرشی نے بھی ۱۹۵۸ء ہی میں "دیوان غالب۔ نسخۂ عرشی" مرتب کیا تو انھوں نے قاضی عبدالودود صاحب کے حاصل کردہ

روٹو گراف کی مدد سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری والے نسخۂ دیوان غالب پر ایک مفصل نوٹ لکھا اور اس نسخے کو انھوں نے ''نسخۂ لاہور'' کا نام دیا۔ یہ اہم نسخہ دیوان غالب ۶۳-۱۹۶۲ء کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہو گیا۔ ۱۹۹۸ء میں اسی نسخے کو سید معین الرحمٰن صاحب نے اپنے تحقیقی کارنامے کے طور پر شائع کرایا تو اس شان کے ساتھ کہ نسخے کے آخری صفحے پر لگی ہوئی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مدور مُہر کو چیپی لگا کر چھپا دیا گیا تھا اور نسخے کے صفحہ ۲۲ پر درج لائبریری کے ایکسیشن نمبر (۶۸۱۲) کو کھرچ دیا گیا تھا۔ کھرچنے اور چھیلنے کے اس عمل میں نسخے کی جدول بھی کھرچی گئی۔

اس مخطوطۂ دیوان غالب کو ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ'' کے نام سے شائع کرانے کے بعد سید معین الرحمٰن نے اسے پاکستان، بھارت اور دیگر ممالک کے کئی قابل ذکر غالب شناسوں اور اہل قلم خدمت میں بھیجا اور اپنے اس کارنامے پر داد کے متقاضی ہوئے۔ جواباً بعض حضرات نے رسماً، بعض نے مروتاً، بعض نے سہواً، اور بعض نے مجبوراً موصوف کی اس ''کولمبسیت'' کی تعریف و توصیف کر دی لیکن بعض ثقہ اور عاقبت بین محققین نے توصیف و تحسین کے اس ارتجالی عمل میں بھی احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ ایسے صاحبان نظر میں رشید حسن خان اور پروفیسر ڈاکٹر حنیف نقوی کے اسمائے گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر معین صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے اس کسبی انبارِ توصیف و ستائش کو ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ ------ تجزیہ و تحسین'' کے نام سے تین سو اٹھائیس صفحات کی ایک ضخیم کتاب میں شائع بھی کر دیا۔ مدح اندوزی کی حرص کی انتہا یہ ہے کہ موصوف نے نہ صرف ان لوگوں کی آرا کو بھی اپنے لیے سند قرار دے لیا ہے جن کا غالب شناسی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ بعض ایسے حضرات کے دامان اقتدار میں بھی پناہ لینے کی کوشش کی ہے جو غالب شناس تو کیا، سرے سے ادب شناس ہی نہیں ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس صورت حال کا ردِ عمل ظاہر ہونا تھا اور ہوا۔ پہلے تو حق اندیش اور باطل ناپذیر اربابِ ادب میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ اپریل ۲۰۰۰ء میں پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ --- اصل حقائق'' کے نام سے معین صاحب کے مرتبہ دیوان

غالب کا مکمل تجزیہ کیا۔ ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیا (اس تجزیے و جائزے کی تفاصیل ڈاکٹر تحسین کی کتاب میں آ چکی ہیں)، اور بالآخر یہ ثابت کر دیا کہ معین صاحب کا مبینہ ''نسخہ خواجہ'' دراصل وہی نسخہ ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مملوکہ تھا اور غالباً ۱۹۶۲ء کے بعد لائبریری سے غائب / چوری ہو گیا تھا، اور یہ وہی نسخہ ہے جس کا تعارف پہلے ہی ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی رام پوری کرا چکے تھے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ بحث بھی اُٹھائی ہے کہ ''نسخہ لاہور''، یا بقول سید قدرت نقوی ''نسخہ جے پور'' کو پروفیسر خواجہ منظور حسین سے موسوم کر کے ''نسخۂ خواجہ'' قرار دینے کا کوئی ادبی یا اخلاقی جواز نہ تھا۔ ڈاکٹر تحسین کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ اس تسمیہ سے پروفیسر خواجہ منظور حسین کے مقام و احترام میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں ہوا، بلکہ چوری کے مال کو ان کے نام سے موسوم کرنے سے ان کی تخفیف اور توہین ہوئی ہے۔

معین صاحب مدعی ہیں کہ انھوں نے یہ نسخہ ''دیوانِ غالب'' قریباً سترہ سال کی عرق ریزی کے بعد مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ معین صاحب ذوق شعر و سخن سے بے بہرہ اور فارسی زبان سے نابلد ہونے کی بنا پر ''دیوان غالب'' کو مرتب کرنے کے اہل ہی نہ تھے۔ انھوں نے معین صاحب کے مرتب کردہ نسخے میں نقل حرفی (Transcription) ترجمے اور املا کی پچاسوں فاش غلطیاں گنوا کر اپنے موقف کو ناقابل تردید بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی اس صدائے احتجاج کی گونج پوری ادبی دنیا میں سُنی گئی اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کے غیر علمی رویوں پر افسوس اور غم کا اظہار کیا گیا۔ کتابچوں، کالموں، انٹریوز، مذاکروں، نظموں اور ادبی گفتگوؤں میں ڈاکٹر تحسین کے موقف کی تائید و توثیق کی گئی۔

مئی ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر معین نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچے کے جواب میں اپنا ایک کتابچہ ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ .... صحیح صورت حال'' کے نام سے شائع کرا دیا۔ معین صاحب ڈاکٹر تحسین کے اٹھائے ہوئے کسی علمی اور تحقیقی سوال کا مناسب اور اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ معین صاحب کا یہ جوابی کتابچہ کٹ حجتی، کج بحثی اور تلبیسانہ انداز فکر کی افسوس ناک مثال ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، معین صاحب سے پوچھتے ہیں کہ حضرت! آپ نے نسخۂ مذکورہ کو اپنی دریافت بتانے اور اس کی اشاعت سے پہلے یہ تحقیق کیوں نہ کی

کہ یہ نسخہ آیا کہاں سے؟ نسخے کے آخری صفحے پر چپپی لگی ہوئی تھی (جس کے نیچے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مدور مہر تھی) تو آپ نے یہ جاننے کی زحمت کیوں گوارا نہ کی کہ یہاں کیا چیز چھپائی جا رہی ہے؟ قلمی نسخے کے ص ۲۲ کے زیریں حصے کی جدول (جس پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایکسیشن نمبر ۶۸۱۲ درج تھا) ''نسخۂ خواجہ'' کے پہلے ایڈیشن (۱۹۹۸ء) میں کھرچی ہوئی کیوں ملتی ہے؟ اور دیباچہ نیر ورخشاں کے اردو ترجمہ کی تشکیل میں آپ نے جا بہ جا ٹھوکریں کھائی ہیں اور قارئین کو گمراہ کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیا مخطوطے پر سترہ سال کی محنت کا یہی حاصل ہونا چاہیے تھا؟ اور بنیادی سوال یہ ہے کہ ذوق شعر و سخن سے فطری طور پر بے بہرہ ہونے کے باوجود آپ نے دیوان غالب کی ترتیب کا کام اپنے ذمے لیا ہی کیوں؟ ڈاکٹر تحسین کے ان تمام سوالوں کے جواب میں معین صاحب کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ مجھ سے یہ کیا پوچھ رہے ہیں؟ بس آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ میرے بارے میں الف نے کیا فرمایا ہے اور ب نے کیا کہا ہے؟ ج کے تاثرات کیا ہیں اور د نے کیا رائے دی ہے؟ وغیرہ۔ معین صاحب کے جوابی کتابچے کو پڑھ کر ہمیں بے ساختہ حضرت علامہ اقبال کی مشہور نظم ''شیر اور خچر'' یاد آ گئی جس میں شیر پوچھتا ہے:

ساکنانِ دشت و صحرا میں ہے تو سب سے الگ
کون ہیں تیرے اب وجد کس قبیلے سے ہے تو

اور خچر جواب دیتا ہے:

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار شاہی اصطبل کی آبرو

دیوانِ غالب کے اس نسخۂ مسروقہ کے بارے میں ایک اہم کتابچہ برگزیدہ محقق اور ماہر غالبیات سید قدرت نقوی (متوفہ دسمبر ۲۰۰۰ء) نے اگست ۲۰۰۰ء میں شائع کرایا۔ انھوں نے اپنے تحقیق مباحث میں ڈاکٹر معین کے اس دعوے کو مردود ٹھہرایا ہے کہ ان کا شائع کردہ نسخہ دیوانِ غالب اور نسخہ دیوانِ غالب متعارفہ ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ ہم الگ الگ نسخے ہیں۔ سید قدرت نقوی کا پیش کردہ یہ تحقیقی نکتہ نہایت قابل داد ہے کہ نسخہ مسروقہ کے تاریخی سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جو غالب

نے ۱۸۵۲ء میں جے پور کے راجا کے لیے بڑے اہتمام سے تیار کرایا اور راجا کو بھجوایا تھا۔ جناب قدرت نقوی کا پیش کردہ یہ تحقیقی نکتہ ان مباحث کی بھول بھلیوں میں، جو متنازعہ نسخہ دیوانِ غالب کی اصل کے بارے میں چھیڑے گئے ہیں، فتح باب کا درجہ رکھتا ہے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر عارف ثاقب نے ایک کتابچہ لکھ کر ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر معین کے کتابچوں کا نہایت معروضی انداز میں تقابلی جائزہ لیا۔ ڈاکٹر عارف ثاقب نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے سوالات ترتیب وار درج کر کے ثابت کیا کہ ڈاکٹر معین نے اکثر سوالوں کے جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے اور جہاں کسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، وہاں مغالطہ آفرینی، دروغ بافی اور دجل و فریب سے کام لیا ہے۔

دیوانِ غالب کے اسی مسروقہ نسخہ ''جے پور لاہور'' کے بارے میں معروف محقق و نقاد اور مخطوطہ شناس جناب خلیل الرحمٰن داؤدی سے ڈاکٹر تحسین کی متعدد گفتگوئیں ہوئیں۔ انھوں نے بتکرار ڈاکٹر تحسین کے موقف کی پُرزور تائید کی ہے۔ اس سلسلے میں داؤدی صاحب نے جو زبردست محاکمہ تحریر کیا ہے، وہ تحقیق و تنقید میں ان کی دقت نظری، نکتہ رسی، نکتہ نوازی اور تسخیر اہداف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی طرح پروفیسر لطیف الزماں خان نے بھی اپنے مکالموں اور مصاحبوں میں نقد و جرح کا حق ادا کرتے ہوئے فیصلہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے حق میں صادر کیا ہے۔

اسی سیاق مباحث میں ڈاکٹر گیان چند جین کا ایک مضمون بھی ''ہماری زبان'' دہلی اور ماہنامہ ''سورج'' لاہور میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے مندرجات بھی ڈاکٹر تحسین فراقی کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں۔

۲۰۰۱ء میں معین صاحب نے اسی مخطوطہ دیوانِ غالب کا ڈی لکس ایڈیشن بھی شائع کرادیا۔ اس ایڈیشن میں مذکورہ بالا ص۲۲ کے زیریں حصہ کی چھیلی یا کھرچی ہوئی جدول کو مکمل کردیا گیا۔ اس اضطراری حرکت کا نفسیاتی محرک چوری کے پکڑے جانے کا خوف نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن کیا چوریاں اس طرح چھپائی جاسکتی ہیں؟

قریب ہے یار روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

اس ڈی لکس ایڈیشن کا ایک ''امتیاز'' یہ بھی ہے کہ اس میں ان تمام اغلاط کی درستی

کردی گئی ہے جن کی نشاندہی ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے کتابچے میں کردی تھی۔ افسوس ہے کہ یہ ترامیم و اصلاحات کرتے ہوئے معین صاحب کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ اپنے محسن، یعنی ڈاکٹر تحسین فراقی کے لیے حرف سپاس ہی زبان قلم پر لے آتے یا کم از کم ان کا حوالہ ہی دے دیتے۔

اس ڈی لکس ایڈیشن میں معین صاحب نے اپنے بچاؤ کے لیے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ متن کے طور پر صرف نسخے کا عکس شائع کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اپنی نقل حرفی یا نستعلیق عبارت Transcription سے دست کش ہوگئے ہیں۔ اس انحراف کی وجہ اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتی کہ اس نقل حرفی میں بھی معین صاحب سے متعدد مضحکہ خیز غلطیاں سرزد ہوگئیں تھیں اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان کی نشاندہی بھی کردی تھی۔ افسوس! معین صاحب نے اپنی سترہ سالہ عرق ریزی کے اس ثمر کو مزید شماتت کے خوف سے خود ہی برباد کردیا۔ ع

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

ڈی لکس ایڈیشن کے شائع ہونے پر معینان معین نے "دیوانِ غالب، نسخہ لاہور" کے سرقے کی تاویل یوں فرمائی ہے کہ چونکہ معین صاحب نے نسخہ خوبصورت طریقے سے شائع کردیا ہے، لہٰذا اب نسخے کے چوری ہونے کا سوال بے معنی ہوگیا ہے۔ لَاحَــــوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللہِ. لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اگر چوری کا مال بظاہر کسی اچھی مد میں خرچ کردیا جائے تو کیا قانوناً اور اخلاقاً چوری کا وہ مال مباح ہوجائے گا؟ کیا ایسی صورت میں چوری کی ایف آئی آر خارج کردی جائے گی اور اس مسروقہ مال کو شیر مادر سمجھ کر ڈکار لیا جائے گا؟

ویسے ابھی تک یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ معین صاحب نے اپنے معینوں کے ان بیانات (مطبوعہ ماہنامہ "سپوتنک" لاہور۔ بابت مارچ ۲۰۰۱ء) کو تحریفات اور تصرفات سے کس حد تک محفوظ رکھا ہے۔

اگر معین صاحب دیوانِ غالب کے اس مسروقہ نسخے کو شائع کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کر لیتے اور اسے پنجاب یونیورسٹی کے شکریے کے ساتھ شائع کرتے تو ارباب ادب ان کے ممنون ہوتے۔ پھر یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ یہ نسخہ دراصل پنجاب

یونیورسٹی لائبریری ہی کا مملوکہ ہے، اگر معین صاحب اپنی سابقہ لغزش یا کوتاہی پر نادم یا معذرت خواہ ہوتے تو بھی ان کی متذکرہ ادبی معصیت کی تلافی کسی نہ کسی حد تک ہو جاتی، مگر وہ تو اب تک ''میں نہ مانوں'' کی تکرار کیے جا رہے ہیں اور ''چوری اور سینہ زوری'' کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ خُدا جانے یہ ''ثقاہت'' کا کون سا درجہ ہے؟

ادب میں سرقہ بازی اور جعل سازی کی وارداتوں کا ارتکاب بجائے خود بھی بہت گھناؤنا اور ناقابلِ معافی جُرم ہے، لیکن یہ سوال اس سے بھی زیادہ تشویش انگیز ہے کہ کیا ایک استاد ادبیات، اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور جیسی بڑی درس گاہ کے صدر شعبہ اُردو کو، تحقیق کے نام پر ایسی غیر شائستہ، بلکہ قبیح اور قابلِ مذمت وارداتوں کا مرتکب ہونا چاہیے؟ اس سے وہ اپنے شاگردوں اور آئندہ ادبی نسلوں کو کیا سبق دے رہے ہیں؟ ادب و تحقیق کا کیا مفہوم وہ نسلِ نو کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں؟ وہ کن روایات کی بیخ کنی اور کن خرافات کی تخم ریزی کر رہے ہیں؟

یہ صدمہ انگیز واردات، جو ادب اور تحقیق کے نام پر کی گئی ہے، خود پنجاب یونیورسٹی اور اس کے اربابِ حل و عقد کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے۔ یونیورسٹی کو مستعد اور دیانت دار ارکان پر مشتمل ایک تحقیقی بورڈ قائم کرنا چاہیے جو اس چوری کے پس منظر کا سراغ لگائے اور یونیورسٹی کے مملوکہ اس نسخے کے بلا اجازت شائع کرنے پر اس کے مرتب اور پبلشر کو نہ صرف قرار واقعی سزا دلائے بلکہ وہ تمام خطیر سرمایہ بھی یونیورسٹی کو دلائے جو زیرِ بحث نسخے کی غیر قانونی اشاعت اور فروخت سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ گزارش بھی نامناسب نہ ہوگی کہ چونکہ نسخہ دیوانِ غالب مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو بلا اجازت اور غلط تسمیہ کے ساتھ، یعنی ''نسخۂ خواجہ'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس سے جہاں یونیورسٹی کی حق تلفی ہوئی ہے، وہاں خود نسخے کی حیثیت عرفی بھی مجروح ہوئی ہے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس ''نسخہ لاہور'' کو خود اپنے اہتمام سے شائع کرے تاکہ اس صورت حال کی تلافی ہو سکے جو ''نسخہ خواجہ'' کے غلط تسمیہ کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے اربابِ اختیار کو نہ صرف یونیورسٹی کی لائبریری بلکہ تمام دیگر متعلقہ شعبوں کی جائیداد اور ان کی اثاثوں کی نگہداشت اور تحفظ کے لیے بھی فوری اور موثر اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ آئندہ کے لیے چوری

چکاری اور لوٹ کھسوٹ کے ایسے افسوس ناک واقعات کا سدِ باب ہو سکے۔

اس کتاب میں دیوانِ غالب کے نسخہ مسروقہ اور اس کی ناجائز اشاعت سے متعلق ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب کا اضافہ شدہ ایڈیشن مکمل طور پر شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تمام اہم کتابچوں، کالموں اور نظموں کو بھی یکجا کردیا گیا ہے تاکہ ادبی تاریخ کا ریکارڈ درست رہے، نیز یہ بات بھی ریکارڈ پر آجائے کہ حق آج بھی باطل کے تعاقب میں ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق کی یہ تابناک روایت، نئی نویلی اکیسویں صدی عیسوی کے لیے ایک خاطر کشا بشارت ہے۔

دیوانِ غالب نسخہ لاہور کی زیرِ بحث ناجائز اشاعت کے حادثہ فاجعہ کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس تمام لوازمے کی سمائی ایک جلد میں دشوار ہے۔ پھر آئندہ بھی اس ضمن میں بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش اور توقع ہے۔ چنانچہ ان تمام مباحث کو ایک سے زیادہ جلدوں میں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ فی الحال اس سلسلے کی پہلی جلد نذرِ قارئین ہے۔ حضرت غالب ہی کی الفاظ میں:

ورق تمام ہوا اور "مدح" باقی ہے

ڈاکٹر عارف ثاقب نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت ہمارے لیے وقف کردیا۔ مواد کی جمع آوری سے اشاعت کے مرحلے تک انھوں نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

پروفیسر جعفر بلوچ

☆

مقدمہ

خلیل الرحمٰن داوٗدی

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا مرتبہ یہ دیوان غالب ۱۹۹۸ء کے آخر میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بعد ۲۰۰۰ء کے آغاز میں معین صاحب اپنے دو ماتحتوں معراج نیر اور اصغر ندیم سید کے نام سے ایک کتاب ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ تجزیہ و تحسین'' منظر عام پر لے آئے۔ سوا تین سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب برصغیر کے ستر پچھتر اصحاب کی طرف سے معین صاحب کی شان میں ان قصائد کا مجموعہ ہے جو کتاب وصول ہوتے ہی، اسے مطالعہ کیے بغیر، انتہائی عجلت میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ ''نسخہ خواجہ''، معین صاحب کی تعلّی اور خود ستائی کا شہکار تو تھا ہی، سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ تجزیہ و تحسین کے نام سے یہ مجموعہ قصائد آ جانے پر معین صاحب بزعم خویش برصغیر میں اُردو ادب کے محقق اعظم اور نقاد بے بدل بن گئے۔ یہ دیکھ کر سنجیدہ اصحاب علم و فضل نے اس پر توجہ کی۔ اپریل ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ۲۷ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ بعنوان ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' شائع کر دیا۔ جس کے جواب میں معین صاحب نے ۶۴ صفحات کا ایک کتابچہ بعنوان ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ صحیح صورت حال'' منظر عام پر لے آے۔ اگست ۲۰۰۰ء میں جناب سید قدرت نقوی (مرحوم) نے ایک کتابچہ بعنوان'' دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ۔ ایک جائزہ'' پیش کر دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عارف ثاقب کا کتابچہ سامنے آ گیا جس میں جناب ڈاکٹر تحسین فراقی اور سید معین الرحمٰن کے کتابچوں کا ایک تقابلی جائزہ لیا گیا۔ اس طرح سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے'' دیوان غالب، نسخہ خواجہ'' کے سلسلے میں چار کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔ ان چار کتابچوں کے علاوہ اخبارات اور رسائل میں متعدد مضامین اور کالم بھی شائع ہوئے ہیں اور غالبیات میں انتہائی گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ چونکہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے جو'' دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ'' شائع کیا تھا، وہ کوئی نو دریافت نسخہ نہیں تھا بلکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا وہی مسروقہ نسخہ تھا جس پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے جولائی ۱۹۵۴ء کے ''ماہ نو'' کراچی میں ایک

مضمون لکھا تھا۔ معین صاحب نے اپنے نسخے کو کوئی دوسرا نسخہ ثابت کرنے میں ایک سعی لا حاصل فرمائی ہے جس کے بطلان میں یہ تمام کتابچے، مضامین اور کالم لکھے گئے ہیں۔ اب یہ تمام بحث ختم ہو جانی چاہیے کیونکہ آخر میں ڈاکٹر گیان چند کے مضمون کے اقتباسات ماہنامہ ''سورج'' لاہور بابت جنوری ۲۰۰۱ء میں شائع ہو گئے ہیں جن کی رو سے معین صاحب کی وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی ہے جس پر انھوں نے اپنے مملوکہ نسخہ کو پنجاب یونیورسٹی والے نسخے سے علاحدہ کوئی دوسرا نسخہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح سے ڈاکٹر گیان چند نے یہ ثابت کر دیا کہ پنجاب یونیورسٹی والے نسخے کا وہ روٹو گراف جو ۱۹۵۷ء کے آخر میں قاضی عبدالودود صاحب لاہور سے لے گئے تھے اور امتیاز علی عرشی نے، اپنے مرتبہ ''دیوانِ غالب'' طبع اول ۱۹۵۸ء میں استعمال کیا ہے اور وہ اب رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، وہ اس نسخے کا روٹو گراف ہے جو پنجاب یونیورسٹی سے سرقہ ہو گیا ہے اور جسے اب معین صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ معین صاحب نے جو ''دیوان غالب'' ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کیا ہے، وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ مسروقہ ہی ہے جس کا روٹو گراف صحیح و سالم حالت میں رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اب ذرا قدرے تفصیل سے اس قضیہ کا جائزہ لیا جائے گا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''ماہ نو'' کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء میں ایک مضمون بعنوان ''دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ'' اُس وقت پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں داخل ہونے والے ''دیوانِ غالب'' کے ایک قلمی نسخے کے متعلق لکھا تھا۔ اس مضمون میں توقیت کلام اور اشعار شماری کے سلسلے میں سید عبداللہ صاحب سے چند معمولی معمولی فروگذاشتیں ہو گئیں۔ بعض اشعار کے متعلق لکھ دیا کہ وہ اس نسخے میں نہیں ہیں اور کہیں تعداد اشعار کی غلطی ہو گئی۔ نومبر ۱۹۵۷ء میں قاضی عبدالودود صاحب لاہور آئے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری والے اس نسخے کا روٹو گراف لے گئے۔ امتیاز علی عرشی نے ۱۹۵۸ء میں دیوان غالب کی ترتیب کے وقت اس روٹو گراف کا استعمال کرتے ہوئے اسے ''نسخہ لاہور'' قرار دیا۔ عرشی صاحب سے بھی ''نسخہ لاہور'' کی تفصیلات بیان کرنے میں کچھ فروگذاشتیں ہو گئیں۔ قاضی عبدالوودو صاحب کے روٹو گراف لینے کے بعد کسی زمانے میں وہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چُرا لیا گیا۔ اس سلسلے میں مدت تک خاموشی رہی۔ جب ۱۹۹۸ء کے آخر میں معین صاحب نے ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ'' شائع کیا تو چونکہ یہ وہی پنجاب یونیورسٹی والا

نسخہ مسروقہ تھا اور معین صاحب کے دل میں چور تھا، موصوف نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی صورت اسے پنجاب یونیورسٹی والے مسروقہ نسخے سے مختلف کوئی دوسرا نسخہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ مجھے ۱۹۸۱ء کے قریب یہ مخطوطہ انارکلی بازار کے کسی کباڑی سے ملا تھا اور یہ نسخہ اس نسخے سے مختلف ہے جس پر سید عبداللہ نے جولائی ۱۹۵۴ء کے ''ماہِ نو'' کراچی میں مضمون لکھا تھا اور یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری والے نسخے کے اس روٹو گراف سے بھی مختلف ہے جسے ۱۹۵۸ء میں عرشی صاحب نے استعمال کرتے ہوئے اسے ''نسخہ لاہور'' قرار دیا تھا۔ دونوں جگہ معین صاحب نے انھی معمولی معمولی کوتاہیوں کی بنیاد بنایا جو سید عبداللہ اور عرشی صاحب سے سرزد ہوئی تھیں۔

سید معین الرحمٰن صاحب کا مرتبہ ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ'' مجھے کافی تاخیر سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے ایک نظر دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ تو وہی پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا مسروقہ نسخہ ہے۔ معین صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' میں ہر ورق پر دائیں جانب مخطوطے کے متن کا عکس اور بائیں طرف اس کے مروج املا میں نستعلیق قرأت درج کی تھی۔ سید عبداللہ نے اپنے مضمون کے ساتھ اس مذہب و مرصّع و مزین مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' کے اولین دو صفحات کی فوٹو کاپیاں بھی ''ماہ نو'' کراچی میں شائع کرائی تھیں۔ وہ میرے پاس موجود تھیں۔ میں نے فوراً ان دو صفحات کی فوٹو کاپیوں کا معین صاحب کے ''نسخہ خواجہ'' کے اولین دو صفحات سے مقابلہ کیا تو یقین ہو گیا کہ یہ تو ایک ہی نسخے کی کاپیاں ہیں، جیسا کہ اب ڈاکٹر گیان چند نے بھی یہی کہا ہے:

''تحسین نے کتابچہ کے آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے نسخے، عرشی صاحب اور قاضی عبدالودود کے نسخے اور ''نسخہ خواجہ'' کے بعض صفحات کے جو عکس دیے ہیں، ان کی وحدت و یکسائی کو بھانپنے کے لیے کسی ماہر تحریر کی ضرورت نہیں، ایک عطائی بھی بیک نظر پہچان سکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسخے کے عکس ہیں'' (اقتباس از مقالہ ڈاکٹر گیان چند مشمولہ ماہنامہ 'سورج' لاہور بابتہ جنوری ۲۰۰۱ء۔ صفحہ ۱۸) اس بات کو جناب رفیق احمد نقش نے بھی اپنے مضمون میں اس طرح لکھا ہے:

''ان تمام باتوں سے قطع نظر تحسین فراقی نے اپنے کتابچہ کے آخر میں جو مختلف عکس شائع کیے ہیں، ان کو دیکھ کر ایک عام آدمی بھی اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ مختلف عکس

ایک ہی نسخے کے ہیں۔ کوئی کاتب ایک ہی مسودہ کو سامنے رکھ کر اگر دو، ایک جیسے نسخے بنانا چاہے تو وہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، اس کے لفظوں کی نشست، نقطوں کی جگہ اور کشش کے انداز میں ہر صفحہ میں کہیں نہ کہیں ضرور فرق ہو گا، جبکہ سید عبداللہ کے متعارفہ نسخے، عرشی صاحب کے فراہم شدہ روٹو گراف اور ''نسخہ خواجہ'' کے متعلقہ صفحوں کے عکوس میں سرِ مُو فرق نہیں اور ''نسخہ خواجہ'' میں جہاں فرق پیدا کیا گیا ہے، وہیں سے چوری پکڑی جا رہی ہے'' (مضمون ''ادبی دنیا میں مکر و ریا اور جعل سازیوں کی حیرت انگیز روداد'' از رفیق احمد نقش۔ مشمولہ ماہنامہ 'سورج' لاہور۔ بابتہ فروری ۲۰۰۱ء۔ صفحہ ۱۸)۔

ہندوستان کے مایہ ناز، بالغ نظر محقق، نقاد اور دانشور ڈاکٹر حنیف نقوی اور رشید حسن خاں صاحب نے بھی سید معین الرحمٰن صاحب کے ''نسخہ خواجہ'' کے سلسلے میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا وہ نسخہ، جس پر سید عبداللہ نے ''ماہِ نو'' کراچی، بابتہ جولائی ۱۹۵۴ء میں مضمون لکھا تھا اور اس کا روٹو گراف، جو قاضی عبدالودود صاحب پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے لے گئے تھے اور جسے امتیاز علی عرشی صاحب نے ''نسخہ لاہور'' کے طور پر اپنے دیوان غالب مرتبہ ۱۹۵۸ء میں استعمال کیا تھا اور آپ جسے ''نسخہ خواجہ'' کے طور پر متعارف کرا رہے ہیں، یہ سب ایک ہیں اور وہ ایک پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا نسخہ ہی ہے۔ یعنی معین صاحب کو یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ آپ جسے ''نسخہ خواجہ'' کہہ رہے ہیں وہ وہی نسخہ ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہوا تھا، لیکن معین صاحب ڈھیٹ بن کر ڈٹے رہے۔ کبھی ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے مختلف نسخے بتاتے رہے، کبھی توام نسخے کی کہانی گھڑتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''نسخہ خواجہ'' پر اس درجہ وزنی اور ناقابلِ تردید اعتراضات وارد کیے اور یہ ثابت کر دیا کہ یہ وہی پنجاب یونیورسٹی والا مسروقہ نسخہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی متن کی بے شمار تدوینی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا کہ معین صاحب غیر موزوں طبع شخص ہیں، جو نثر اور نظم میں امتیاز کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ اس کے جواب میں معین صاحب کا ایک کتابچہ آیا جو ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' ثابت ہوا۔ پورے کتابچے میں تحسین فراقی صاحب کے کسی ایک اعتراض کا جواب نہ دے سکے۔ جواب کی جگہ ''تجزیہ، تحسین'' میں شامل کسی بڑی شخصیت کا اپنی شان میں لکھا ہوا کوئی قصیدہ نقل کر دیتے ہیں کہ آپ میری

غلطیوں کی گرفت کرتے ہیں اور اتنے بڑے بڑے نامور حضرات میری تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ نہایت قابلِ مذمت یہ بات ہے کہ معین الرحمٰن صاحب نے تحسین فراقی صاحب کے اعتراضات کے جواب میں جو کتابچہ تحریر کیا ہے، اس میں فراقی صاحب کے سلسلے میں جو ہتک آمیز لہجہ اور پوچ زبان استعمال کی ہے، وہ کسی اہل علم سے متوقع نہیں ہوسکتی۔ فراقی صاحب نے اپنے کتابچہ میں جس اعلیٰ ظرفی، علو اخلاق اور شایستگی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ لائقِ داد ہے۔ اس کے برعکس معین صاحب کا اسلوبِ نگارش سزا وارِ نفریں و ملامت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے! معین صاحب اپنے معترض کا تعارف ان الفاظ میں کرا رہے ہیں. ''ایک کم عمر معاصر تحسین فراقی کی نوکِ قلم نے اس کام پر مجھے حد درجہ ''بے پایاں بیداد'' کا نشانہ بنایا، وہ بھی انوکھی طرز (وکھری ٹائپ) کا تجربہ ہے۔'' یہ سب کو معلوم ہے کہ فراقی صاحب کی عمر پچاس سال سے زائد ہے اور معین صاحب کی ۵۸ سال ہے۔ یعنی عمروں میں صرف چند سال کا فرق ہے۔ معین صاحب کے 'کم عمر' کہنے سے قاری یہ سمجھتا ہے کہ کوئی بیس پچیس سال کا لونڈا ہوگا۔ بے شک فراقی صاحب معین صاحب سے چند سال چھوٹے ہیں لیکن علمی فضیلت کے اعتبار سے وہ کوہ ہمالہ ہیں اور ان کے مقابلے میں معین صاحب ایک پرکاہ ہیں۔ اس لیے کہا گیا ہے. ''بزرگی بعقل است نہ بسال۔'' معین صاحب اپنی علمی بے بضاعتی اور فرومائگی کے ساتھ منافق بھی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں اخلاقِ فضیلہ کے حامل نظر آتے ہیں لیکن یاوہ گوئی اور لچر پن میں تمام حدود پھلانگ جاتے ہیں، جس کا اظہار وہ اپنے کتابچہ میں جابجا فراقی صاحب کے ذکر میں کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو وہ ہیجڑوں اور عورتوں کی طرح کوسنے دینے لگتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۳۴ پر رقم طراز ہیں: ''میں پناہ مانگتا ہوں اس وقت سے کہ ت۔ف کو اپنی اولاد یا اخلاف سے اپنے یا اپنے بزرگوں کے بارے میں کچھ ایسا سننا پڑے۔''

تحسین فراقی صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' کا جائزہ لیتے ہوئے معین صاحب کے کیے ہوئے دیوان غالب کے فارسی دیباچے اور نیر رخشاں کی فارسی تقریظ کے اردو تراجم کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اور تدوین متن کے سلسلے میں ان کی غیر موزوں طبع کے سبب عروضی اسقام بھی بتائے ہیں۔ معین صاحب ان کا جواب تو کیا دیتے، الٹا ان کی فارسی دانی اور عروضی استعداد کا مذاق اڑایا ہے۔ تحسین صاحب کی فارسی دانی، موزونی طبع اور مہارت

عروض کے سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جیسے بین الاقوامی محقق نے ''نسخہ خواجہ'' پر ان کے اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے جو داد دی ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمایئے: ''مخطوطے میں ''تیری'' ہے لیکن مرتب (معین الرحمٰن) نے اپنی نستعلیق کتابت میں نسخہ عرشی کی تقلید میں ''تری'' لکھا ہے، جس سے مصرع وزن سے خارج ہو گیا ہے۔ یہ مشاہدہ غیر معمولی عروض دان ہی کر سکتا ہے۔ یہ شناخت کرنا کہ مصرع ''تیری'' سے موزوں اور 'تری' سے غیر موزوں ہو جاتا ہے تحسین کی مہارتِ عروض پر تحسین کا طالب ہے۔

''تحسین فراقی نے فارسی متن کی قرأت اور اردو ترجمہ میں جو تصحیحات تجویز کی ہیں وہ مایۂ فخر ہیں۔ اس سے مجھے تذبذب ہو گیا ہے کہ تحسین شعبۂ اُردو کے استاد ہیں یا شعبۂ فارسی کے۔ انھوں نے ''نسخہ خواجہ'' سے پیشتر ان نثروں کے ترجموں کی جو تفصیلی نشان دہی کی ہے، وہ کم از کم میری معلومات میں اضافہ ہے۔''

(اقتباسات مقالہ مصنفہ ڈاکٹر گیان چند مشمولہ ماہنامہ 'سورج' لاہور۔ بابتہ جنوری ۲۰۰۱ء۔ صفحہ ۱۹)

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' کی اشاعت کے ساتھ ہی برصغیر کے ستر پچھتر دانشوروں سے ''نسخہ خواجہ'' کے سلسلے میں اپنی کاوشوں کے قصائد لکھا لیے تھے اور یہ کام اتنی سرعت کے ساتھ کیا گیا کہ جو حضرات مہینوں اور برسوں کسی کتاب پر تبصرہ کے لیے وقت نہیں نکال پاتے، ان کی گردن پر گھٹنا رکھ کر اُن سے بھی کتاب کو پڑھے بغیر قصائد لکھائے گئے۔ معین صاحب نے جس چابکدستی اور عیاری سے ان لوگوں سے غلط تبصرے اور آراء حاصل کی ہیں، وہ لائق داد ہے۔ ان میں ایسے ثقہ حضرات بھی ہیں جنھوں نے محض حُسنِ صورت ہی کو دیکھا اور اس کی معنوی خامیوں سے آگاہ ہوئے بغیر ہی قصیدہ لکھ دیا۔ ایسے حضرات اب پچھتا رہے ہیں اور پچھتاتے رہیں گے۔ معین صاحب ہیں کہ ان کی تحریروں کو بار بار ہر جگہ اپنے حق میں استعمال کر رہے ہیں۔ معین صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' پر ان قصائد نما تبصروں کو جمع کر کے ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ تجزیہ و تحسین'' کے نام سے علاحدہ ایک کتاب شائع کر دی۔ اب ہر اعتراض کے جواب میں ان کے پاس یہی جواب ہے کہ اتنے بڑے بڑے آدمیوں نے تو میری شان میں یہ قصائد لکھے ہیں، ان کے مقابلے میں آپ کے اعتراض کی کیا حیثیت ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچے کے جواب میں غیر سنجیدگی کے ساتھ لچر

زبان میں یہی روش برقرار رکھی گئی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر تحسین فراقی نے نشان دہی کی ہے معین صاحب کے ناموزوں طبع ہونے کے سلسلے میں معین صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب کی کورانہ تقلید پر فخر کرتے ہوئے اس باب میں رقم طراز ہیں:

''رشید صاحب کے ارشادات کو میں اپنا بیان واقعی جانتا ہوں۔'' اس کے بعد رشید احمد صدیقی کا ایک قول بغیر کسی حوالے کے نقل کیا گیا ہے کہ کہاں سے لیا؟ یہ معین صاحب کی عادت ہے کہ تصنیف، تالیف کے سلسلے میں وہ صرف نام لکھ دیتے ہیں اور یہ نہیں بتاتے کہ یہ ان کی کس کتاب یا مضمون سے لیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی انھوں نے رشید احمد صدیقی کا یہ قول بغیر کسی حوالے کے نقل کیا ہے:

''میں ان لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک انھیں ناموزوں نہ بنالیا جائے۔'' اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں: ''میرے لیے رشید صاحب کی تحریریں دستور العمل اور رہنمائے حیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے بھی اچھے برے کارناموں اور رویوں کا جواز اور جواب مجھے رشید صاحب سے مل جاتا ہے۔ وہ میرے لیے کیا کچھ نہ تھے، میری زمین، میرا آسمان، میرے نگہبان، میری ساری کائنات تھے وہ!'' یعنی رشید احمد صدیقی موزوں طبع نہ تھے اور کوئی موزوں شعر انھیں اس وقت تک یاد نہیں ہوتا تھا جب تک وہ غیر موزوں نہ بن جائے۔ **لاحول ولاقوۃ**۔ ایسا غیر موزوں طبع آدمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا چیئرمین تھا، یعنی اردو ادب کی تدریس پر مامور رہا، جس ادب کا نصف سے زائد سرمایہ منظوم ہے۔ جو شخص خود شعری موزونیت کو سمجھنے سے عاری ہو، وہ ادب اردو کا اچھا استاد کس طرح ہوسکتا ہے۔ یہ بات اگر طبعیات، کیمیا، نباتیات، معاشیات، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کا پروفیسر کہتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن اگر اردو کا استاد یہ بات کہے تو بوالعجبی کے سوا کیا ہے۔ بہر حال! چونکہ فراقی صاحب نے معین صاحب کو غیر موزوں طبع ہونے کا طعنہ دیا تھا، انھوں نے رشید احمد صدیقی کی پیروی میں اپنی اس خامی کو بھی باعثِ عار نہیں سمجھا۔ تہذیب اخلاق کے اصول و مسلمات میں تو یہ ہے کہ کسی مرشد کی اچھی عادتوں کی تقلید کرنی چاہیے اور اس کی خامیوں کو اپنے لیے دستور العمل نہیں بنانا چاہیے لیکن یہ تو کوئی جواب باصواب نہیں ہے کہ چونکہ رشید احمد صدیقی طبع غیر موزوں رکھتے تھے، اس لیے میں بھی طبع غیر موزوں رکھتا ہوں۔

تحسین فراقی صاحب نے ان کو غیر موزوں طبع کہا تھا جسے انھوں نے رشید احمد صدیقی صاحب کے حوالے سے بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہے بلکہ اس پر فخر کیا ہے کہ وہ غیر موزوں طبع رکھتے ہیں۔ یہاں اعتراض یہ ہے کہ جو شخص خود غیر موزوں طبیعت رکھتا ہو اور نظم و نثر میں امتیاز کی صلاحیت سے عاری ہو، وہ کسی دیوان اور وہ بھی ''دیوانِ غالب'' کی ترتیب و تدوین کیا خاک کرے گا۔ یہی کچھ معین صاحب نے دیوان غالب کے ساتھ کیا ہے۔ یوں اُن کے غیر موزوں طبع ہونے کے سلسلے میں جناب رفیق احمد نقش صاحب لکھتے ہیں:

''ان (رشید حسن خاں) کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کتاب (غالب اور سن ستاون) طبع سوم (دہلی ۱۹۸۸ء) میں غالب کے ایک مصرعہ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا' کیوں کہ شکر ادا کیجیے اس لُطف خاص کا۔ معین صاحب نے یہ مصرعہ اسی صورت میں ''جاگیرِ غالب'' کے مقدمہ کے اختتام پر کتاب ۔کے ناشر عبدالحمید چودھری کی خدمت میں پیش کیا ہے (ص ۳۱)۔ غالب کا شعر ہے۔

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ایک ایسا شخص جو غالب کے ایک مشہور مصرعے کو ایک سے زائد جگہوں پر بے وزن اور بے ربط کر کے لکھتا ہو، ماہر غالبیات ہونے کا دعوے دار ہے، بلکہ اصغر ندیم سید کے نام سے چھپنے والی تحریر میں اسے غالب شناسی میں سب سے معتبر شخصیت اور غالب کے سب سے بڑے محقق و نقاد کے گراں قدر الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ تفو بر تو، اے چرخِ گرداں تفو!

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اعتراض کیا ہے کہ معین صاحب نے ''دیوانِ غالب'' کے ساتھ کباڑی سے جو دوسری کتابیں خریدی ہیں، انھیں ''دیوانِ غالب'' نسخہ خواجہ کے آخر میں ماخذات میں شامل کر دیا ہے، حالانکہ ''دیوانِ غالب'' کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ان کتابوں سے کسی قسم کا اخذ و اقتباس عمل میں نہیں آیا ہے۔ پھر وہ ماخذات کیسے بن گئیں؟ تصنیف و تالیف کے نام پر ہزاروں صفحات سیاہ کرنے والا شخص اصولِ ترتیب و تدوین سے بالکل ناآشنا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے بھی معین صاحب کے دیوان غالب

''نسخہ خواجہ'' کی کتابیات کے سلسلے میں لکھا ہے:

''کتابیات پر مجھے کئی اعتراضات ہیں۔ مخطوطات کلام غالب میں انھیں دیوان غالب بخط غالب اور دیوان غالب نسخہ فوجدار محمد خاں کے شمول کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ انھوں نے ان مخطوطات کو نہیں دیکھا۔ آخرالذکر کو معروف بہ'' نسخہ حمیدیہ'' کہنا غلط ہے۔ انھوں نے دیوان غالب نسخہ رام پور قدیم بھی نہیں دیکھا۔ حیرت ہے کہ مطبوعات غالب میں شامل کم از کم ۹ کتابوں کو دوبارہ متفرق مآخذ و مصادر کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ اتنے پرانے استاد کو کتابیات میں تعداد بڑھانے کا اتنا شوق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کتابیات کے مزید مآخذ کے تحت ...... آٹھ اندراجات میں سوائے نمبر ۷ کے سب حشو ہیں۔''

(مقالہ ڈاکٹر گیان چند۔ مشمولہ ماہنامہ 'سورج' لاہور۔ بابتہ جنوری ۲۰۰۱ء۔ صفحہ ۲۰)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''نسخہ خواجہ'' کے دیباچے میں معین صاحب کی پیش کردہ معلومات بابتہ ''معارج النبوۃ'' کی تغلیط کی تھی۔ اس سلسلے میں فراقی صاحب کی ایک پوری سطر طبع ہونے سے رہ گئی تھی جس کی وجہ سے اعتراض کی سنگینی میں کچھ کمی واقع ہو گئی۔ معین صاحب اپنے کتابچے کے صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں: ''نسخہ خواجہ'' کے 'حرفے چند' میں ضمناً ایک قیمتی اور نادر فارسی مخطوطے ''معارج النبوۃ'' اور اس کے فاضل مصنف سید معین الدین واعظ الکاشفی الہروی کا ذکر خیر آیا ہے۔ ت۔ ف نے اس امر کو بھی زیر بحث لانے کا شوق پورا کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی اطلاعات محدود اور مستعار ہیں، اس لیے اگر ناقص یا ناتمام ہیں تو قابلِ معافی ہیں۔'' (صفحہ ۲۰)۔ معین صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' میں مولف ''معارج النبوۃ'' کے لیے ہروی نہیں لکھا تھا۔ جوابی کتابچہ میں بد دیانتی کے طور پر ہروی بڑھا دیا گیا ہے۔ تحسین فراقی نے یہ لکھا تھا کہ معین صاحب نے ''معارج النبوۃ'' کے مصنف کا نام دو مختلف شخصیتوں کو مخلوط کر کے غلط لکھا ہے۔ ''معارج النبوۃ'' کے مصنف معین الدین محمد المشتہر بہ معین مسکین فراہی متوفی ۱۵۰۰/ ۹۰۸ھ یا ۱۵۰۴ء/ ۹۱۰ھ باختلاف الاقوال ہیں۔ ان کے معاصر ایک دوسری شخصیت ملا حسین واعظ کاشفی متوفی ۹۱۰ھ مولف ''تفسیر حسینی'' کی ہے۔

معین صاحب نے ملا حسین واعظ کاشفی کے نام میں سے واعظ کاشفی کے الفاظ ملا معین کے ساتھ لگا کر خلط ملط کر دیا۔ دو معروف مصنفین کے ناموں کو گڈمڈ کرنا ان کے

جہل پر دلالت کرتا ہے۔ معین صاحب نے ''معارج النبوۃ'' کے آگے بریکٹ میں (قلمی ۱۴۸۶ء) لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معین صاحب کا مخطوطہ ۱۴۸۶ء کا مکتوب ہے۔ جبکہ اس زمانے میں قلمی کتابوں پر سنہ کتابت ہجری لکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں سنہ عیسوی رائج ہی نہیں تھا۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ اگر معین صاحب کسی ''معارج النبوۃ'' پر سنہ کتابت ۱۴۸۶ء لکھا ہوا دکھا دیں تو میں عمر بھر کے لیے خطِ غلامی ان کے حق میں تحریر کر دوں گا۔ جب معین صاحب مخطوطات کو سمجھتے ہی نہیں تو پھر اس قسم کے پنگے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح معین صاحب نے ملا معین ہروی کی وفات ۱۵۰۱ء لکھی ہے۔ یہ بھی ہجری سنہ میں ہونی چاہیے تھی۔ بے شک ہجری کے ساتھ مطابق سنہ عیسوی درج کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن بنیادی طور پر سنہ کتابت ہجری ہوتا ہے۔ اگر معین صاحب کے الفاظ، قلمی ۱۴۸۶ء کو صحیح تسلیم کر لیں تو ۱۴۸۶ء، ۸۹۱ھ کے مطابق ہوتا ہے جو ''معارج النبوۃ'' کا سنہ تالیف ہے۔ دراصل ''معارج النبوۃ'' ان پچاس خطبات کا مجموعہ ہے جو سیرت النبی ﷺ کے سلسلے میں ملا معین الدین المشتہر بہ معین مسکین نے مختلف اوقات میں جامع مسجد ہرات میں ارشاد فرمائے تھے۔ بعد میں انھیں جمع کر کے مجموعہ کا نام ''معارج النبوۃ'' رکھ دیا گیا۔ ۸۹۱ھ اس کا سنہ تالیف ہے۔ آج دنیا بھر کے کسی کتاب خانہ میں ''معارج النبوۃ'' کا کوئی مخطوطہ قلمی ۱۴۸۶ء کا نہیں ہے۔ معین صاحب نے چونکہ کبھی مخطوطات پر کام نہیں کیا اس لیے وہ کسی مخطوطے کی تفصیل قلمبند کرنے سے قاصر ہیں۔ مخطوطے کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کاتب کا نام اور سنہ کتابت ضروری ہوتا ہے۔ یوں تو ''معارج النبوۃ'' متعدد بار شائع ہو چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی عام ملتے ہیں۔ اگر معین صاحب اپنی کتاب کو نادر اور اہم سمجھتے تھے تو انھیں اس کی ندرت بھی بتانی چاہیے تھی جس سے وہ مطلقاً قاصر رہے، اور وہ اپنی عادت اور سرشت کے مطابق اپنی کوتاہی اور غلطی تسلیم کرنے کے بجائے فراقی صاحب کے لیے لکھتے ہیں کہ ''اس ضمن میں ان کی اطلاعات محدود اور مستعار ہیں، اس لیے اگر ناقص یا ناتمام ہیں تو قابل معافی ہیں۔'' (کتابچہ مصنفہ معین الرحمن صاحب۔ صفحہ ۲۰)۔

تحسین فراقی صاحب نے اصول ترتیب و تدوین متن کے سلسلے میں معین صاحب کی بے خبری کا اظہار بھی کیا ہے۔ فراقی صاحب نے ہی نہیں دوسرے فضلا بھی معین

صاحب کی اس عدم واقفیت کے شاکی ہیں۔ سید قدرت نقوی نے ''نسخہ خواجہ'' کا جائزہ لیتے ہوئے متعدد مقامات پر معین صاحب کے اُصولِ ترتیب و تدوین متن سے ناواقفیت واضح کی ہے۔ وہ اپنی تالیف ''نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ'' ناشر مکتبہ تخلیق ادب، کراچی اگست ۲۰۰۰ء کے مرقومتہ الذیل صفحات پر رقم طراز ہیں:

۱۔ صفحہ ۲۷: ''یہ سہو تو کاتب کا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو مرتب (معین الرحمٰن صاحب) کی غفلت اور غیر حاضر دماغ کی عجوبہ کاری ہے۔ دوسرے قصیدے میں اور بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قصیدے کے کل اشعار تراسی (۸۳) گوشوارے میں درج کیے ہیں۔ متن میں شمار کیا گیا تو تعداد تینتالیس (۴۳) ہے۔ یہ چالیس (۴۰) شعر کہاں سے آئے اور کہاں غائب ہو گئے، اس کا علم معین الرحمٰن ہی کو ہو سکتا ہے۔''

۲۔ صفحہ ۲۹: ''اس کمپیوٹر کے دور میں جمع کرنے میں اتنی بڑی غلطی واقع ہونا ایک تعجب خیز امر ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز، تعجب خیز معین الرحمٰن کا یہ بیان ہے جس سے ان کی فنِ ادب اور نظم و نثر کی اقسام سے واقفیت بدرجۂ اتم ہویدا ہے۔''

۳۔ صفحہ ۳۳: ''ہمارے محقق اعظم معین الرحمٰن نے غزل کے مطبوعہ مطلع کا یہ مصرعہ ''وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے'' لکھ کر پوری غزل کو ۱۸۱۲ء کی قرار دے دیا ہے۔''

۴۔ صفحہ ۴۳: ''حق تدوین جب ادا ہوتا کہ از خود نسخہ کی حقیقت معلوم کرتے۔ نسخہ کے متعلق ان کے تمام تر بیانات سیّد عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی کے بیانات کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں بلکہ بعض جگہ ان کے بیان کے خلاف عمل ملتا ہے۔ مثلاً قاضی عبدالودود نے ایک شعر کی نشان دہی کی ہے کہ یہ مخطوطہ میں ہے متداول میں نہیں۔ نستعلیق کرتے وقت مخطوطے میں موجود شعر کو چھوڑ دیا اور متداول کا شعر نقل کر دیا۔ ایسا صرف اس وجہ سے ہوا کہ نسخہ عرشی یا کسی اور دیوان سے وہ شعر نقل کر دیا جو متداول میں ہوتا ہے مگر مذکورہ نسخہ میں نہیں ہے۔
العجب! العجب!! اسے کہتے ہیں کورانہ تقلید۔ یہی حال لوح، جدول اور نقش ہونے

کا ہے۔ نہ لوح کی کوئی صراحت ہے اور نہ نقوش کی وضاحت اور نہ گل بوٹے اور بیلوں کی حالت و کیفیت بیان کی ہے۔ میں نے نسخہ شیرانی کی منقش و رنگین لوح اور ''عود ہندی'' کے سادہ نقشین سرورق کے بیل بوٹوں وغیرہ پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ معین الرحمٰن ان دونوں سے رہنمائی حاصل کر سکتے تھے اور مذکورہ نسخے کی کیفیات تزئین بیان کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اول تو انھوں نے، ان تین بزرگوں نے جو کچھ لکھا، اس کو نقل کر دیا اور اپنی دید و دانست سے کچھ نہیں لکھا۔ دوسرے یہ کہ خطاطی و تزئین و آرائش کے فن سے عملاً اور علما بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ وہ روشِ قلم اور تزئینی گل کاریوں کے انداز کو نہیں جانتے۔ ان کے فرق و اختلاف کو نہیں پہچانتے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس نسخے کی بابت کوئی تفصیلی بات، لوح کی کیفیت اور اس کے نقوش کی حالت کے متعلق نہیں لکھی۔''

۵۔ صفحہ ۴۷: ''مقدمہ و تعارف اور متنی نستعلیق میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔''

۶۔ سید قدرت نقوی اپنے اسی کتابچہ کے صفحہ ۴۷ پر ''نسخہ خواجہ'' کے نام کے سلسلے میں رقم طراز ہیں: ''عقیدت کا اظہار بذریعہ انتساب کیا جاتا ہے۔ مرحوم (خواجہ منظور حسین جن کے نام پر معین صاحب نے دیوان غالب کا نام ''نسخہ خواجہ'' رکھا ہے) کے نام سے موسوم کرنا مرحوم کی مدح بالذم ہے۔ وہ ان کے نام معنون کر سکتے تھے جس کا اظہار انھوں نے ''میرے کرم فرما'' کے زیر عنوان منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ کیا ہے۔ کیا معین الرحمٰن ''منسوب'' اور ''موسوم'' کے فرق کو نہیں جانتے؟ کتنی عجیب بات ہے جس کے نام سے موسوم کیا جائے، اسی کے نام سے منسوب بھی کیا جائے۔ یہ خواجہ صاحب سے اظہار عقیدت کا کوئی اچھا طریقہ نہیں، بالخصوص اس حالت میں کہ نہ وہ مالک تھے اور نہ مرتب۔ مرحوم کے علمی مرتبہ کو اس سے ٹھیس پہنچتی ہے اور معین الرحمٰن اس عجیب و غریب حرکت کے مرتکب ہوئے۔ یہ مرحوم کی توہین و تذلیل کا سبب بھی بن سکتی ہے۔''

اس موقع پر ڈاکٹر گیان چند کے مقالے کا اقتباس بے محل نہ ہوگا:

۹۔ ''رشید حسن خاں نے ایک اہم بات یہ کہی کہ اسے ''نسخہ خواجہ'' کہنے کا جواز نہیں (صفحہ ۵۹)۔ میری پختہ رائے یہ ہے کہ نہ صرف اس کا جواز نہیں بلکہ یہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ اس نسخے کا خواجہ منظور حسین سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے اسے

شاید دیکھا بھی نہیں۔ وہ ماہر غالبیات نہیں تھے۔ معین صاحب کی ان سے عقیدت سر آنکھوں پر لیکن وہ اپنے کام کو دوسرے کے نام کیونکر کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دولت خانے کا نام ''خواجہ منظور حسین منزل'' رکھ دیں تو اس سے ان کا مکان تلاش کرنے والوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے سوا اور کیا ہوگا؟

۱۰۔ ''وہ (معین الرحمٰن) جو بار بار مخطوطے کو ''نسخہ خواجہ'' کہتے ہیں۔ اس سے مجھے دھچکا لگتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں ''نسخہ خواجہ'' میں غالب کے اپنے قلم سے جو ترمیم یا تنسیخ ہوتی ہے'' (صفحہ ۲۰)۔ غالب نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ جس نسخے میں تصحیح کر رہے ہیں وہ نسخہ غالب نہیں ''نسخہ خواجہ'' ہے۔ کون سا خواجہ، خواجہ نظام الدین اولیاء یا خواجہ میر درد؟''

(مقالہ ڈاکٹر گیان چند۔ مشمولہ ماہنامہ 'سورج' لاہور۔ بابتہ جنوری ۲۰۰۱ء۔ صفحہ ۱۹، ۲۰)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے نسخہ خواجہ کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا مسروقہ نسخہ ثابت کرنے کے لیے جو بہت سے دلائل دیے ہیں، ان میں یہ بھی ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری اپنی ہر کتاب کے صفحہ ۲۲ پر ایکسیشن نمبر (Accession No.) لکھتی ہے۔ چنانچہ ''نسخہ خواجہ'' کے صفحہ ۲۲ پر نیچے کے حصے کو کھرچا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایکسیشن نمبر مٹا دیا گیا ہے۔ اسی طرح نسخے کے آخر میں جہاں یونیورسٹی لائبریری کی مُہر تھی اس پر ''فتے دین'' یا ''فتح دین'' کی چیٹ لگا دی گئی ہے۔ ایکسیشن نمبر اور یونیورسٹی لائبریری کی مہر کی تلفی، نسخے کے چوری ہو جانے کے بعد کی گئی ہے اور یقیناً اسی نے کی ہوگی یہ جس کے پاس رہا ہوگا۔ بالآخر ڈاکٹر گیان چند نے اس معمے کو بھی حل کر لیا ہے اور انھوں نے سراغ لگا لیا ہے کہ قاضی عبدالودود نے ۱۹۵۷ء کے آخر میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے جس ''دیوان غالب'' کا روٹو گراف بنوایا تھا، وہ ابھی تک رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ وہ اپنے مقالے مشمولہ ماہنامہ 'سورج' لاہور، بابتہ جنوری ۲۰۰۱ء کے صفحہ ۱۸ پر رقم طراز ہیں:

''میں نے رضا لائبریری رام پور کے ڈائریکٹر کو لکھ کر درخواست دی کہ وہ روٹو گراف میں دیکھ کر صحیح صورت حال سے مطلع کریں اور چاہیں تو رام پور کے ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کو بلا کر یہ کام اس کے سپرد کر دیں۔ میرے پاس ڈاکٹر ظہیر کا جواب آ گیا ہے۔

معین الرحمٰن نے اپنے کتابچہ میں لکھا ہے کہ ''نسخہ لاہور'' میں عرشی صاحب کی شہادت کے مطابق مصرعہ کی صورت یہ ہے'' جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہوگا'' جب کہ صحیح ردیف ''ہوتا'' ہے، ''ہوگا'' نہیں۔

رام پور میں موجود عکسی نقل کے اس مقام کو دیکھ لیا جائے کہ یہاں صورت عرشی صاحب کے مشاہدے کے مطابق ہے یا ان سے چُوک ہو گئی۔ اگر عکس کی شہادت عرشی صاحب کے مشاہدے کی تائید نہ کرے تو گویا پھر ''نسخہ خواجہ'' کے عین مین ''نسخہ لاہور'' ہونے کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں رہ جائے گا (صفحہ۴۰)۔ روٹو گراف دیکھ کر ڈاکٹر ظہیر نے میرے استفسارات کا جو جواب دیا ہے میں ''نسخہ خواجہ'' کا صفحہ نمبر شامل کر کے لکھتا ہوں۔''

ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر ظہیر کے جواب سے فیصلہ کر دیا کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا ''دیوانِ غالب'' ہی ''نسخہ خواجہ'' ہے کیونکہ روٹو گراف کے اختتام پر مدور مہر میں ''پنجاب یونیورسٹی لائبریری، عربک سیکشن ۶۸۱۲'' لکھا ہوا ہے اور روٹو گراف کے صفحہ ۲۲ پر ''Accession No.6812'' تحریر ہے جو ''نسخہ خواجہ'' میں کھرچ دیا گیا ہے اور آخر میں مدور مہر کی جگہ پر ''فتح دین'' کی چیپی لگا دی گئی ہے تاکہ یہ ثابت نہ ہو سکے کہ یہی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ نسخہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اسی مقالے میں لکھتے ہیں

۴۔ دونوں مُہروں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ''نسخہ خواجہ''، لائبریری کا گم شدہ ''نسخہ لاہور'' ہی ہے۔ قاضی صاحب نے روٹو گراف ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں حاصل کیا۔ اس کے بعد کسی نے مخطوطے کو لائبریری سے اُڑا لیا۔ دونوں مہروں کی جگہ کھرچی۔ آخری مہر کی جگہ ''فتح دین'' کی چیپی لگائی۔ میرے نزدیک ''فتح دین'' وجود خارجی سے محروم ہے۔''

ڈاکٹر گیان چند نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے جو روٹوگراف، ''دیوانِ غالب'' کا، قاضی عبدالودود ۱۹۵۷ء میں لے گئے تھے، وہ اور ''نسخہ خواجہ'' ایک ہی ہیں، یعنی ''نسخہ خواجہ'' ہی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ نسخہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کی کاوش نے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تمام مساعی جمیلہ کو، جو وہ ''نسخہ خواجہ'' کو ''نسخہ لاہور'' سے مختلف ثابت کرنے کے سلسلے میں کر رہے تھے، بالکل ناکام بنا دیا اور

ثابت کر دیا ہے کہ ''نسخہ خواجہ'' ہی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ نسخہ ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ تمام بحث ختم ہو جاتی ہے جو ''نسخہ خواجہ'' اور نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کو دو اور ایک ثابت کرنے کے لیے کی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچہ کے بعد معین الرحمٰن صاحب کا کتابچہ آیا اور اس کے بعد سید قدرت نقوی کا کتابچہ اور آخر میں ڈاکٹر عارف ثاقب کا کتابچہ آیا، جس میں ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے کتابچوں کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ میں نے جب معین صاحب کا جواب دیکھا کہ انھوں نے تو فراقی صاحب کے کسی ایک اعتراض کا بھی سنجیدگی سے جواب نہیں دیا ہے۔ میں خود یہ کام کرنا چاہتا تھا کہ فراقی صاحب کے اعتراضات کی فہرست ایک، دو، تین کر کے مرتب کروں اور لکھوں کہ اتنے اعتراضات میں سے کسی ایک کا جواب بھی نہیں دیا گیا ہے۔ مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ یہ کام نوجوان محقق ڈاکٹر عارف ثاقب نے کر دیا۔ انھوں نے تحسین فراقی صاحب کے اعتراضات ایک ایک کر کے علاحدہ علاحدہ لکھے تو ان کی تعداد ۲۶ ہو گئی۔ ان میں سے چند کے ناکافی اور غیر سنجیدہ جوابات معین صاحب نے دیے اور بیشتر اعتراضات گول کر گئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ایک اور کتاب بعنوان ''برسبیلِ غالب'' ستمبر ۲۰۰۰ء میں چھاپ ڈالی۔ اس میں اچھا خاصا ایسا مواد شائع ہوا ہے جس کی بنا پر معین صاحب کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کے سلسلے میں دفعہ ۵۰۰ تعزیراتِ پاکستان کے تحت مقدمات درج کرائے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب میں بھی حسب عادت معین صاحب کی خودستائی کی انتہا ہے اور خود اپنی شان میں دوسروں کے قصائد نقل کیے ہیں۔ یہ کتاب کیا ہے، گند کی ایک پوٹ ہے اور غالب کا زبان میں ''لتۂ حیض'' ہے جسے پڑھنے سے متلی آتی ہے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے عظیم لوگوں کی ذلت و رسوائی کا انتظام کیا گیا ہے جن کے شانوں پر چڑھ کر معین صاحب اپنی بالا قامتی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے ہیں اور اپنے حق میں حاصل کیے ہوئے ان کے بیانات کے اقتباسات ہر مشکل واقتاد میں پیش کرتے رہے ہیں کہ دیکھیے ان جیسے فضلا نے تو میرے متعلق اس درجہ تحسینی کلمات لکھے ہیں۔ میری مراد مخلصی ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفقی مشفق خواجہ سے ہے جو اپنے اپنے میدان میں پورے برصغیر میں یکتا و یگانہ ہیں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ان کے خلاف گند اُچھالا گیا ہے اور اس کی جی بھر کر تشہیر کی گئی ہے۔ اسے محسن کشی

کہا جاتا ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوۃ والکریم کے پاس کوئی شخص آیا کہ فلاں شخص آپ کو سب وشتم کر رہا ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اس نے میرے سامنے آ کر تو کبھی ایسا نہیں کیا، البتہ تم ضرور کر رہے ہو۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ کسی بات کو اس کی مکمل تصدیق کے بغیر آگے کسی سے نہ کہو کیونکہ اگر وہ بات غلط نکلی تو تم ماخوذ ہو گے۔ لطیف الزماں خاں صاحب نے اگر ان دونوں حضرات کے خلاف کوئی خط لکھا تھا تو اس خط کو سامنے لائے بغیر اس کی تشہیر بھی اسی زمرے میں آتی ہے، جس کے لیے نبی کریمؐ نے سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔ آج تک وہ خط تو سامنے نہیں آیا، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جعلی ہے اور ایک جعلی خط کی تشہیر کے سلسلے میں جن حضرات کی تضحیک و تذلیل ہوئی ہے، وہ اس کی تشہیر کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا حق رکھتے ہیں۔ کسی کے نام سے کچھ چھاپ دینا آسان ہے اور اگر اس کی اشاعت میں بدنیتی بھی شامل ہو جائے تو کسی کے نام سے سب کچھ چھاپا جا سکتا ہے۔ اس کی تشہیر ہی سب سے بڑی بددیانتی ہے۔ اگر بفرض محال لطیف الزماں خاں صاحب نے ان دونوں حضرات کے خلاف کچھ لکھ بھی دیا تھا تو وہ کسی اخبار کے کالم میں چھپا تھا۔ معین صاحب کا وہاں سے اسے اپنی کتاب میں نقل کر کے اس کی دوامی تشہیر کا انتظام کرنا کون سا کارخیر ہے۔ ایسا کر کے معین الرحمٰن صاحب نے ان دونوں حضرات سے نہ جانے کون سی دشمنی نکالی ہے۔ لوگ صحیح کہتے ہیں بھولی بھالی معصوم شکل والے میسنے ہوتے ہیں۔ میسنا پنجابی لفظ ہے جس کا اُردو میں یک لفظی ترجمہ، جو اس کے تمام مفہومات کو محتوی ہے، مجھے نہیں معلوم۔ لطیف الزماں خاں صاحب کا کوئی خط اگر کسی روزنامے کے کالم میں چھپا تھا تو اس کا مطالعہ صرف اس کے قارئین تک محدود رہا اور وہ بھی ایک روز کے بعد ذہن سے نکل جاتا ہے، لیکن معین صاحب نے اسے اپنی کتاب میں شامل کر کے بڑی لمبی زندگی اور بقا بخش دی ہے۔

کتاب ''بر سبیل غالب'' اسی نوعیت کی گندگی سے بھری ہوئی ہے۔ اسی کتاب میں عجیب عجیب معوج الذہن لوگوں کی ملاحیاں بھری ہوئی ہیں۔ صفحہ ۲۱۳ پر پروفیسر طیب منیر راولپنڈی سے رقم طراز ہیں:

''مکرمی ڈاکٹر معین صاحب! ''نسخہ خواجہ'' کے سلسلے میں ایک بزرگ بارہ دیدۂ (کذا) نے جب یہ فرمایا کہ وہ یونیورسٹی سے اڑایا گیا ہے تو میں نے دو تین کتابیں جو

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی لائبریری کی مملوکہ تھیں، ان کے سامنے رکھ دیں اور استفسار کیا کہ ان کتابوں کے بارے میں ارشاد ہو کہ یہ کہاں سے اڑائی گئی ہیں؟ اڑانے والا کون قرار پائے گا؟ اور ذمہ داری کا تعین کون کرے گا؟ ان کے پاس سوائے خاموشی کے کوئی جواب نہ تھا۔" جناب پروفیسر طیب منیر صاحب! ذرا معاملے کو سمجھنے کی کوشش فرمائیے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کبھی کا مر چکا ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہے۔ اس کا دعویٰ کون کرے گا۔ ثانیاً یہ کہ وہ ہندوستان میں تھا۔ ہر ملک کے قانون اس کی حدود میں ہی لاگو ہوتے ہیں۔ پاکستانی پولیس کسی زندہ ادارے کی شکایت پر فوجداری مقدمات قائم کرتی ہے۔ معین صاحب کے پاس یونیورسٹی کا چُرایا ہوا نسخہ "دیوانِ غالب" تھا۔ بے شک انھوں نے خود نہیں چرایا تھا لیکن مال مسروقہ تو ان کی تحویل میں تھا۔ ان کے خلاف زیرِ دفعہ ۴۱۱ تعزیرات پاکستان کارروائی ہو سکتی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ایک زندہ ادارہ ہے۔ اس کی لائبریری کی کتابوں کے امین چیف لائبریرین اور وائس چانسلر ہیں۔ یہ صرف وائس چانسلر صاحب کی مہربانی ہے کہ معین الرحمٰن صاحب آج آزاد پھر رہے ہیں، مگر پروفیسر طیب منیر صاحب! آپ کے پاس پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی کوئی مسروقہ کتاب ہے تو وہ قابلِ دست اندازیِ پولیس ہے۔ اگر آپ کے پاس کسی پاکستانی قومی ادارے کی کوئی مسروقہ کتاب ہے تو آپ مجھے بتائیے اور پھر دیکھیے کہ قانون کس طرح حرکت میں آتا ہے۔ معین صاحب نے بھی اپنے مکتوب نگاروں کے خطوط شائع کیے ہیں کہ ان کباڑیوں سے بہت سے اداروں اور شخصیتوں کی ملکیتی کتابیں ملی ہیں، لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ وہ ادارے ختم ہو چکے ہیں اور وہ شخصیتیں وفات پا چکی ہیں۔ اگر کوئی ان کا دعویدار ہوتا تو ان کی مسروقہ چیزیں رکھنے والے سرکاری مہمان ہوتے۔ بے شک کباڑیوں سے پرانی اہم و نادر کتابیں مل جاتی ہیں۔ اب تو یہ سلسلہ بہت کم ہو گیا ہے۔ میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۳ء تک بلا ناغہ پورے پندرہ سال، ہر اتوار کو لاہور کے مختلف مقامات پر ریڑھیوں سے پرانی کتابیں خریدتا رہا ہوں۔ تقسیم کے فوراً بعد بہت بڑے بڑے کتاب خانے ریڑھیوں پر فروخت ہوئے ہیں۔ اب تو ایسا نہیں ہے، لیکن اُس زمانے میں قلمی کتابیں بھی کباڑیوں سے مل جاتی تھیں۔ مجھے کباڑیوں سے انتہائی نادر مطبوعہ کتابیں تو بہت ملی ہیں اور سادہ قلمی نسخے بھی خریدے ہیں لیکن مجھے کبھی کوئی مذہب، مرصّع اور مزین شاہانہ نسخہ کسی کباڑی سے

نہیں ملا، اور مجھے یقین ہے کہ پورے پاکستان میں کسی شخص کو بھی ایسا مذہب شاہانہ مخطوطہ
کبھی کسی کباڑی سے نہیں ملا ہو گا۔ سید معین الرحمٰن صاحب کا یہ دعویٰ کذب بیانی ہے کہ
انھیں اتنا مذہب شاہانہ نسخہ ۱۹۸۱ء میں کسی کباڑی سے ملا تھا جس کا ڈی لکس ایڈیشن وہ
ڈیڑھ ہزار روپے میں فروخت کر رہے ہیں۔ پورے پاکستان میں مجھے کوئی شخص یہ بتا دے
کہ اتنا مذہب، مرصع اور مزین نسخہ اسے کبھی کسی کباڑی سے ملا ہے؟ کبھی نہیں ملا ہو گا۔
معین الرحمٰن صاحب جھوٹ اور افترا سے کام لے رہے ہیں۔ بے شک نسخہ انھوں نے خود
نہیں چرایا لیکن مال مسروقہ کو اپنی تحویل میں رکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے جرائم ان
سے سرزد ہوئے ہیں۔ وائس چانسلر صاحب اور چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی کی بطور
امین اپنے فرائض کی بجا آوری کی کوتاہی اور جذبۂ ترحم ہے کہ معین الرحمٰن صاحب کے
خلاف ابھی تک تعزیری کارروائی عمل میں نہیں آئی ہے۔

''برسبیلِ غالب'' کے آخری حصے میں دو تصاویر بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان تصاویر
میں معین صاحب ''نسخہ خواجہ'' کو اپنی ملکیتی کتاب کے طور پر ایک تقریب میں یونیورسٹی کے
وائس چانسلر جناب لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود کو تحفہ ارمغان دے رہے ہیں۔ یہ تقریب
۲۱ اگست کو وائس چانسلر صاحب کے دفتر میں انعقاد پذیر ہوئی۔ اس وقت تک پورے ملک
کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا مسروقہ ''دیوانِ غالب'' ڈاکٹر معین الرحمٰن
کے پاس ہے اور انھوں نے اسے ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کر کے لاکھوں روپے بھی
کمائے ہیں۔ اس کا عام ایڈیشن ۴۵۰ روپے کا اور ڈی لکس ایڈیشن ۱۵۰۰ روپے کا ہے جو
ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر ملک سے باہر ایکسپورٹ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح سے
پنجاب یونیورسٹی کے اس چوری کے نسخے سے لاکھوں روپے کما لینے کے بعد اسے یونیورسٹی
کو ہی بطور عطیہ پیش کر دیا گیا ہے۔ وائس چانسلر صاحب کو یہ دھوکہ دیا کہ معین صاحب اپنا
لاکھوں روپے کا ملکیتی نسخہ یونیورسٹی کو بطور عطیہ پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ چند اصحاب کی
سازش سے ایک مال مسروقہ رکھنے والا شخص واجب الاحترام معطی بن گیا اور اس کی شان
میں قصیدے پڑھ کر اسے ہم دوش پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر وقار عظیم اور پروفیسر خواجہ
منظور حسین بناتے ہوئے اس چوری کے مال کو خیر کثیر اور خیر جاریہ کہا گیا۔ معین صاحب
نے یونیورسٹی لائبریری کے اس نسخے کو لیمینیٹ کرا کے چاندی کے خوبصورت کیس میں سجا

کر پیش کیا۔ یہ تقریب ۲۱ اگست ۲۰۰۰ء کو وائس چانسلر صاحب کے دفتر میں ہوئی۔ ۲۳ اگست ۲۰۰۰ء کے روزنامہ ''دن'' لاہور کے کالم میں ڈاکٹر اجمل نیازی نے لکھا: ''کیا کوئی کسی اغوا شدہ لڑکی کو اس کے باپ کے گھر اس طرح لے جاتا ہے کہ وہ دلھن بنی ہوئی ہو اور اس کے ساتھ دو بچے بھی ہوں۔'' وائس چانسلر صاحب پنجاب یونیورسٹی کے لیے یہ الفاظ لائق توجہ ہیں۔

۲۱ اگست ۲۰۰۰ء کو جب یہ مسروقہ نسخہ یونیورسٹی کو ہی بطور ہدیہ وارمغان واپس کیا گیا' اس وقت تک ہر ایک کو یہ علم ہو چکا تھا کہ یہ یونیورسٹی کا ہی مسروقہ نسخہ ہے۔ چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لائبریری بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس تقریب میں مال مسروقہ رکھنے والے شخص کو ہیرو بنایا جارہا ہے' لیکن اسے بھی اپنا فرض منصبی یاد نہیں آیا کہ وہ وائس چانسلر صاحب سے کہہ دے کہ یہ تو ہمارا اپنا نسخہ ہے جو دباؤ کے تحت واپس کیا جارہا ہے۔

ایک صاحب نے یہاں تک مبالغہ فرمایا کہ معین صاحب اپنا ملکیتی ذاتی نسخہ' جو ۲۰ لاکھ روپے سے زیادہ قیمت کا ہے' یونیورسٹی کو بطور ہدیہ پیش کر رہے ہیں۔ اس تقریب کے تمام شرکا اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ہی مسروقہ نسخہ ہے لیکن تقریب میں شریک ہونے والے کسی شخص نے بھی وائس چانسلر کو اصل صورت حال سے آگاہ نہیں کیا کہ آپ اپنی ہی متاع مسروقہ کو اس اعزاز و اکرام سے واپس لے رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار کا تو یہ فرض ہونا چاہیے تھا کہ معلوم ہو جانے پر وہ ملک کے موجودہ قانون کے تحت' زیر دفعہ ۴۱۱ ت پ مقدمہ درج رجسٹر کرا کے نسخہ برآمد کراتے اور پھر تفتیش کر کے معلوم کیا جاتا کہ یہ نسخہ کس طرح یونیورسٹی لائبریری سے معین صاحب تک پہنچا اور معین صاحب کو اس نسخے کی اشاعت سے لاکھوں روپے کا فائدہ کسی طرح ہو گیا۔ اس نسخہ کی اشاعت صرف یونیورسٹی کی اجازت سے کی جاسکتی تھی۔ بصورت دیگر جو اشاعت ہوئی ہے وہ غیر قانونی ہے۔ اس سے حاصل کردہ تمام رقم یونیورسٹی کو واپس ملنی چاہیے۔ اب یہ احتساب سیل کا کیس بن گیا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی رقم دلوائے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بے شک وہ نسخہ خود تو نہیں چرایا' اس لیے اس کی برآمدگی کی وجہ سے دفعہ

۳۸۰ ت پ کے مجرم تو بنتے تھے لیکن مال مسروقہ ان کی تحویل میں تھا اس لیے اس کی برآمدگی کی وجہ سے ۴۱۱ ت پ کے مجرم ضرور تھے کہ چوری کا مال ان کی تحویل میں تھا اور اس سے انھوں نے لاکھوں روپیہ بھی کمایا ہے، اور اب تو صورت حال ہی بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ معین الرحمٰن صاحب نے اعتراف جرم کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اس طرح کہ انھوں نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے تمام اعتراضات اور تصحیحات کو قبول کرلیا ہے۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہے کہ وہ علی الاعلان اس کا اظہار فرمائیں لیکن فراقی صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' کے عام ایڈیشن پر جو اعتراضات کیے تھے اور تصحیحات تجویز کی تھیں، معین الرحمٰن صاحب نے اس کے بعد تیار ہونے والے ڈی لکس ایڈیشن میں وہ تمام اعتراضات قبول کرتے ہوئے تمام تصحیحات کر دی ہیں۔ ان کا یہ امر کلیتًا سپر اندازی نہیں تو اور کیا ہے۔ مثلاً ''نسخہ خواجہ'' کے صفحہ ۲۲ پر یونیورسٹی لائبریری کی مہر اور ایکسیشن نمبر کو کھرچنے کی وجہ سے جدول کا جو حصہ ختم ہو گیا تھا، ڈی لکس ایڈیشن میں وہ بحال کر دیا گیا ہے۔ دونوں ایڈیشنوں کے متعلقہ صفحات کے فوٹو ماہنامہ ''سورج'' لاہور بابتہ فروری ۲۰۰۱ء کے صفحہ ۱۸ پر شائع ہو چکے ہیں۔ ہر شخص ملاحظہ کر سکتا ہے، لیکن ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب بہت ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے جرائم کرتے ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ''نسخہ خواجہ'' کے قضیہ کے دوران ان پر یہ الزام بھی لگا کہ انھوں نے اپنی ایک طالبہ بشریٰ باسط کے ایم اے کے مقالے ''ادا جعفری، شخصیت اور شاعری'' کا کچھ حصہ اپنے نام سے ''رسالہ نقوش'' لاہور میں شائع کر دیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مقالے کے آغاز و اختتام کے اجزا ان کے لکھے ہوئے ہیں، جو ایک جرم ہے۔ ''نسخہ خواجہ'' کے جوابی کتابچہ میں معین الرحمٰن صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ ''اگر کسی نہ کسی طور ان کا تھیسس مکمل نہ ہو پاتا تو وہ ایم اے کے دوسرے سالانہ امتحان میں شرکت کے لیے پاکستان نہ آ پاتیں اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل میں والدہ سے دُور، تین برس کی طویل مدت گزار دینے کے بعد اور باوجود صرف بی۔ اے کی بی۔ اے رہ جاتیں۔'' (صفحہ ۵۵) یعنی یہ اعتراف کر لیا ہے کہ بشریٰ باسط کے مقالے کا بڑا حصہ خود انھوں نے لکھ کر اسے ایم اے کی ڈگری دلائی ہے۔ یہ مقالہ ۲۰۰ نمبروں کا ہوتا ہے۔ امتحانات میں نقل کرنے پر سزائیں دی جاتی ہیں۔ یہ تو نقل کرنے سے بھی بڑا جرم ہے کہ کوئی ممتحن خود مقالہ لکھ کر نمبر دے دے، لیکن معین الرحمٰن

صاحب اس اعتراف کے باوجود کسی قسم کے مواخذے سے آزاد ہیں۔

بہرحال پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ "دیوانِ غالب" (Accession No.6812) بالآخر یونیورسٹی کو واپس مل گیا ہے۔ اس کا سہرا جناب ڈاکٹر تحسین فراقی کے سر ہے۔ دراصل وہ نسخہ ایک قومی ادارے کی ملکیت تھا اور اس کی بازیابی کے جہاد میں متعدد سرفروشوں اور جاں بازوں نے سردھڑ کی بازی لگا دی تھی جن میں ڈاکٹر اجمل نیازی، لطیف الزماں خاں صاحب (ملتان)، ڈاکٹر عارف ثاقب، سید قدرت نقوی، رفیق احمد نقش، تسلیم احمد تصور صاحب اور پروفیسر جعفر بلوچ صاحب نے اپنے اپنے تاریخی کردار رقم کیے ہیں۔ تب کہیں وہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو واپس ہوا ہے۔ ورنہ معین الرحمٰن صاحب تو اسے ہضم کرنے کے لیے اس کوشش میں لگے رہے کہ یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا نسخہ ہی نہیں ہے۔ ان کی بدبختی کہ اس کا روٹوگراف "نسخۂ خواجہ" کے عین مطابق نکلا۔ "نسخۂ خواجہ" کے صفحہ ۲۲ سے ایکسیشن نمبر اور آخری صفحہ کی مدور مہر کو تو ختم کر دیا گیا ہے لیکن روٹوگراف میں یہ دونوں چیزیں صحیح و سالم صورت میں محفوظ ہیں۔ تب کہیں جاکر معین الرحمٰن صاحب اسے واپس کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ لیکن معین صاحب نے اس مسروقہ نسخہ سے دو ایڈیشن شائع کر کے لاکھوں روپے بٹور لیے ہیں جو یونیورسٹی کو واپس ملنے چاہئیں۔ یہ نیب (احتساب) کا بہت مضبوط کیس ہے جو لوگوں سے قومی اداروں کی ہڑپ کی ہوئی رقم نکالنے پر مامور ہے۔ اسے حرکت میں آنا چاہیے اور سید معین الرحمٰن صاحب سے وہ تمام رقم نکالنی چاہیے جو انھوں نے اس نسخہ کی ناجائز اشاعت سے غیر قانونی طور پر کمائی ہے۔

(ماہنامہ "سورج" لاہور۔ اپریل ۲۰۰۱ء۔ ص ۱۷ تا ۲۵)

☆

حصہ اول : کتابچے

دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق — ڈاکٹر تحسین فراقی

دیوان غالب، نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ — سیّد قدرت نقوی

''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔اصل حقائق''اور''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ صحیح صورتِ حال۔'' ایک تقابلی جائزہ — ڈاکٹر عارف ثاقب

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ

اصل حقائق

ڈاکٹر تحسین فراقی

بارِ دوم

مارچ ۲۰۰۱ء

(۱)

جولائی سنہ ۱۹۵۴ء کے ماہِ نو (کراچی) میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے دیوانِ غالب کے ایک ایسے نادر قلمی نسخے کا تعارف کرایا تھا جو کم و بیش ایک سو دو برس قبل معرضِ شہود میں آیا تھا۔ یہ نسخہ اِس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ سید عبداللہ کے نوشتہ تعارف کے چوالیس برس بعد یہ کاملاً طباعت سے آراستہ ہو کر غالب کے عشاق تک پہنچ گیا ہے، بدقسمت اس اعتبار سے ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کا مملوکہ یہ نسخہ اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود نہیں۔ ہاں یہ لاہور شہر سے باہر نہیں گیا، اس کا ٹھکانا معین ہے چنانچہ اس دُرِّ بے بہا کی بازیافت ممکن ہے۔

ع یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور

اِس قیمتی قلمی نسخے کو متعارف کرانے سے پہلے سید عبداللہ نے ایس ایم اکرام کے علاوہ مولانا امتیاز علی عرشی سے خطِ کتابت کی اور ان کی توضیحات کی روشنی میں اِس نسخے کے سنہ کے تعین کی کوشش کی۔ سید صاحب نے اِس قلمی نسخے کے مندرجہ ذیل کوائف بتلائے تھے :

"اوراق ۶۴، تقطیع ۸" × ۵" ۔ سرِ لوح و تعویذ مطلّا شنگرف ولاجورد سے منقّش، مغلیہ نقاشی کے انداز پر۔ پہلے دو صفحے مطلّا۔ حاشیہ اور بین السطور مطلّا بیل بوٹے۔ ہر نئی غزل سے پہلے بیل بوٹے شنگرفی۔ خاتمے پر بھی بیل بوٹے طلا کاری سے۔"

"سب سے پہلے فارسی دیباچہ ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے :

مشامِ شمیم آشنایاں را صلادِ دہادِ انجمن نشینان را مژدہ کہ لختے از سامانِ مجمرہ گردانی ۔ ۔ ۔ ۔ الخ - یہ دیباچہ مرزا غالب کا لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ ان کا نام عرف اور تخلص سب کچھ اس میں موجود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِس میں دیباچہ بلا تاریخ ہے ۔ اِس نسخے کے آخر میں "خاتمہ" کے عنوان سے ایک تقریظ ہے جو نواب محمد ضیاءالدین خان بہادر کی لکھی ہوئی ہے ۔ اس کا سرنامہ یہ ہے :

دمیدنِ سپیدۂ سحری از تیرہ شبِ سوادِ اوراق بفرِ فروغ گستریِ عبارتِ تقریظ کہ پیدائیِ آں اثریست از آثارِ خرامِ خامۂ دل رُبا برادر بدل نزدیک، بجاں برابر، عالی دودمانِ والا گہر، نواب محمد ضیاءالدین خان بہادر سلّمہ اللہ تعالیٰ"۔

"اِس تقریظ میں یہ بھی لکھا ہے :

"ہمگی اشعارِ شعری شعارِ غزل[۱] و قطعہ و رُباعی ہزار و پانصد و پنجہ واند یافتم"۔ تقریظ کا آخری جملہ یہ ہے جس پر یہ نسخہ ختم ہو جاتا ہے : از من یادگارے و برائے دیگراں تذکارے باد۔"[۲]

دیوانِ غالب کے اِس نادر قلمی نسخے پر سیّد عبداللہ کے مرقومہ تعارف نامے کے چار برس بعد قاضی عبدالودود نے "متفرقات" کے زیرِ عنوان "مخطوطہ دیوانِ غالب" کے سرنامے کے تحت پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اِسی نسخے پر مختصر تعارفی شذرہ لکھا جو نقوش کے شمارہ ۶۹ - ۷۰، بابت اکتوبر ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا۔ اِس شذرے کے خاص نکات یہ تھے :

(۱) یہ قلمی نسخہ بشمول صفحہ اوّل سادہ و دیباچۂ غالب و تقریظ نیر ۱۲۸ (ایک سو اٹھائیس) صفحوں پر مشتمل ہے ۔

---

[۱] سیّد عبداللہ سے غزل کے بعد قصیدہ کا لفظ درج ہونے سے رہ گیا ۔

[۲] ماہِ نو (کراچی) جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۵، ۱۶۔

(۲) دیباچہ ۲ تا ۴ (تین صفحات) پر مشتمل ہے۔
(۳) غزلیں صفحہ ۴ سے ۱۰۶ تک ہیں اور غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۳۱۲ ہے۔
(۴) قصاید ص ۱۰۶ سے ۱۱۷ تک ہیں۔
(۵) کل اشعار ۱۵۴۸ ہیں مگر تقریظ میں ہزار و پانصد و پنجہ واند ہے[1]۔

دیوانِ غالب کے اسی نادر مخطوطے کو مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے "نسخۂ لاہور" کے نام سے موسوم کرتے ہوئے اپنے مرتّبہ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) میں اس کی جو خصوصیّات بیان کی تھیں اُن کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) اِس نسخے کے کل مکتوبہ ورق ۶۴ ہیں۔
(۲) مسطر ۱۵ سطر کا ہے۔
(۳) وَرَق اب پر سُنہری، سفید، آبی، نیلی، سُرخ اور زَرد رنگ کی لَوح کے نیچے فارسی دیباچہ شروع ہوا ہے۔ اس صفحے اور اگلے صفحے کے حاشیوں میں باریک اور نازک قلم سے مُطلّا اور ملوّن بیل بنائی گئی ہے۔ نیز ان دونوں صفحوں کا بین السطور مذہّب ہے۔ پُوری کتاب میں چھے رنگ کی جدول ہے۔ ہر دو نظموں کے درمیان ایک سطر کے بقدر جگہ چھوڑی گئی ہے۔ اور اسے رنگین بیل سے بھرا گیا ہے۔ جہاں کہیں آخری شعر کو دو سطروں میں لکھا گیا ہے وہاں دونوں جانب کی جگہوں کو خوبصورت بیل بوٹوں سے بھر دیا ہے۔
(۴) خط بتاتا ہے کہ نواب فخرالدّین محمد خاں بہادر کا لکھا ہوا ہے جو میرزا کے مشہور اور پسندیدہ کاتب تھے۔
(۵) شعر میں ہندسے کو لفظوں میں لکھا جاتا ہے۔ انھوں نے ایسی جگہوں میں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے نقوش شمارۂ مذکور ص ۲۰۹، ۲۱۰

لفظ کے اُوپر عدد کی شکل بھی بناتی ہے۔

(۶) میرزا کی ہدایت کے مطابق کاتب ذ کی جگہ ذ لکھتے ہیں اور خورشید میں واؤ نہیں لکھتے۔

(۷) ورق ۲ ب کی چوتھی سطر سے دُوسری لوح کے نیچے غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ ورق ۵۳ ب سے قصیدے، ورق ۵۸ الف سے قطعے اور ورق ۶۰ الف سے رُباعیاں شروع ہوتی ہیں۔ آخر میں بعنوانِ خاتمہ نیّر کی تقریظ ہے جو ورق ۶۲ ب سے شروع ہو کر ۶۴ ب پر ختم ہوتی ہے۔

(۸) تقریظ میں اشعار کی تعداد ہزار و پانصد و پنجہ و اند بتائی گئی ہے۔ میں نے شمار کیا تو ۱۵۴۷ اشعار نکلے۔[۱]

۱۹۹۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے دیوانِ غالب کا ایک قلمی نسخہ مرتّب و مدوّن کر کے اسے "دیوانِ غالب — نسخۂ خواجہ" کے عنوان سے شایع کیا۔ اِس نسخے کو انھوں نے اپنے ذخیرۂ غالبیات کی "بیش قیمت متاع" قرار دیا ہے۔ یہ قلمی نسخہ مع ایک دو قلمی نسخے اور چند مطبوعہ نادر کتابوں کے، "انھیں پُرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے" (ص ۵) مِلا۔ "بڑے مثالی اہتمام اور کاوش کے ساتھ تیار ہوئے والا یہ قلمی نسخہ بقول سیّد معین الرحمٰن "غالب ہے کہ نواب ضیاءالدین احمد خاں یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گوہر گم گشتہ ہو" (دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ص ۶)۔ دلچسپ بات ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے قلمی نسخے کا تعارف کراتے ہوئے چالیس برس پہلے ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے بھی اسے ضیاءالدین احمد خاں یا کسی شہزادے کے لُٹے ہوتے خزانے کا دُرِ بے بہا قرار دیا تھا (ماہِ نو جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۵، ۱۷)۔ میری رائے یہ ہے کہ معین الرحمٰن صاحب کا

---

[۱] عرشی صاحب نے دیوان میں شامل مختلف اصناف کے اشعار کی تعداد کی جو تفصیل الگ الگ دی ہے اُن کی کُل میزان ۱۵۴۸ بنتی ہے، ۱۵۴۷ نہیں۔ عرشی صاحب کو سہو ہُوا ہے۔

پیش کردہ "یہ گوہرِ گم گشتہ" اور سید عبداللہ کا نشان کردہ یہ "دُرِّ بے بہا"، کوئی الگ الگ دو موتی نہیں بلکہ ۱۸۵۲ء کے نصفِ اوّل کے کلامِ غالب کا حامل وہی "دُرِّ یتیم" ہے جسے آخری حادثہ دہلی کی راجدھانی کے بجائے لاہور کے صوباتی دارالحکومت میں پیش آیا اور یوں یہ لُٹ پٹ کر موجودہ تدوین کار تک پہنچا۔ اِس ضمن میں شواہد کی تفصیل ذرا آگے چل کر پیش کی جاتی ہے۔

اِس قلمی نسخے کو، جسے نُسخۂ خواجہ کا نام دیا گیا ہے، مُرتّب نے ذیل کے الفاظ میں متعارف کرایا ہے:

"۱۲۷ صفحات پر مشتمل نُسخۂ خواجہ کی جدول چھ (۶) رنگ کی ہے۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک مُطلّا اور مذہّب، خُوشنما بیل بُوٹے انتہائی دیدہ زیب باریک، نفیس طلائی کام سے مزیّن۔"

(ص ۱۵)

معین صاحب نے اِس نُسخے کی صنف وار تعدادِ اشعار کا جو گوشوارہ مُرتّب کیا ہے، اُس کی رُو سے غزل کے کُل اشعار ۱۳۱۲ (تیرہ سو بارہ)، قصائد کے اشعار، ۱۶۲ (ایک سو باسٹھ)، قطعات کے اشعار ۵۰ (پچاس) اور رُباعیات کے اشعار ۲۴ (چوبیس) ہیں۔ مجموعی تعداد اشعار ۱۵۴۸ (پندرہ سو اڑتالیس) ہے۔

معین صاحب مزید فرماتے ہیں:

"نسخۂ خواجہ کے پہلے صفحے پر غالب کے فارسی دیباچے کی آٹھ سطریں آتی ہیں[1]۔ اِس صفحے کا تقریباً نصفِ اوّل دلکش اور رنگ برنگ لَوح نے گھیرا ہے۔ غالب کا یہ فارسی دیباچہ جس پر کوئی تاریخ دَرج نہیں، صفحہ ۳ کی پہلی سطر پر تمام ہوتا ہے۔ اس کے معاً بعد پھر خوبصورت لَوح ہے جس کے نیچے غزلیں شروع ہو جاتی ہیں۔" (ص ۱۶)

---

[1] اتنی ہی سطریں سید عبداللہ کے متعارفہ دیوانِ غالب کے قلمی نسخے کے پہلے صفحے کی ہیں۔

"نسخۂ خواجہ کے صفحہ ۱۲۳ (ایک سو تیئس) کے آغاز میں سُرخ روشنائی سے بخطِ جلی خاتمہ کا عنوان دلکش لَوح میں دَرج ہے۔ فارسی میں یہ تقریظ نواب ضیاء الدین نیرّ رخشاں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ تقریظ ص ۱۲۷ (ایک سو ستائیس) کی آٹھویں سطر تک گئی ہے۔ اِس آخری صفحے کا قریب نصف آخر ایک دلکش لوح سے مزیّن ہے جس کے وسط میں ایک کاغذ چپاں ہے جو اگرچہ اپنے رنگ و رُوپ (؟) کے اعتبار سے معاصر اور قدیم معلوم ہوتا ہے اور اصل نسخے کے کاغذ کا ہم رنگ اور ہم عُمر ہے لیکن بظاہر یہ بعد کا اضافہ ہے۔ اس پر کسی 'فتح دین' کے دستخط ہیں۔ ایک دُوسرے قلم سے "فتے دین" بھی لکھا گیا ہے۔" (ص ۱۷)

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"نیرّ رخشاں کے "خاتمے" کی یہ عبارت تعدادِ اشعار کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے: "ہمگی اشعار شعری اشعارِ غزل و قصیدہ و قطعہ و رُباعی ہزار و پانصد و پنجہ دانہ یافتم . . . . اصلاً متن کے اشعار کی قطعی تعداد ۱۵۴۸ بنتی ہے۔"

مرتّب کا موقف ہے کہ ان کا متعارفہ قلمی نُسخہ غالب کے پاس اور ان کے پیشِ نظر رہا ہے اور انھوں نے کہیں کہیں اس پر اپنے قلم سے اغلاط کاتب کی تصحیح کی ہے، اگرچہ نسخے میں موجود بہت سی غلطیاں اُن کی نگاہ سے چُوک بھی گئیں۔ بالکل یہی مَوقف، مولانا امتیاز علی عرشی کا دیوانِ غالب کے نسخۂ لاہور کے بارے میں ہے۔ مرتّب کو یہ بھی اعتراف ہے کہ ایک استثنا کے سوا عرشی کی بتائی ہوئی سب جلی غلطیاں نسخۂ خواجہ میں موجود ہیں۔

مرتّب نے اپنے دیباچے میں نسخۂ خواجہ کی کتابت کی خصوصیات گنواتے ہوئے لکھا ہے کہ ٹ کے لیے ہر جگہ "ط" کے نیچے دو نقطے ڈالے گئے

ہیں اور "اِک" کو "ایک" بدونِ نقاط لکھا گیا ہے۔ پُورے نسخے میں ہر صفحے پر 'ترک' کا اِلتزام بھی کیا گیا ہے۔

اِمتیاز علی عرشی کے متعارفہ "نُسخۂ لاہور" کا ذکر کرتے ہُوئے معین الرحمن لکھتے ہیں:

"نسخۂ لاہور کے تحت مولانا امتیاز علی عرشی نے دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی طبع دوم ۱۹۸۲۔ دہلی) [کے] مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بعض غیر اہم جزوی اختلافات کے ساتھ، اپنے مشمولات اور کوائف کی تفصیل کے اعتبار سے زیرِ نظر نسخۂ خواجہ کے کم و بیش[1] عین مطابق ہے۔"

یہی بات وہ آگے چل کر دیباچے کے بہرۂ ہشتم کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"قاضی عبدالودود نے "مخطوطۂ دیوانِ غالب" کتب خانۂ دانش گاہ پنجاب لاہور اور مولانا اِمتیاز علی عرشی نے "نسخۂ لاہور" کے طور پر جس مخطوطے کے کوائف پیش کیے ہیں، بڑی حد تک جزئیات سمیت اس کی تفصیلات اور علامات وہی ہیں جو زیرِ نظر نسخۂ خواجہ میں موجود ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری (لاہور) ———

کے جس نادر نسخے کا ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے تعارف کرایا ہے وہ بھی نسخۂ خواجہ سے مماثل ہے لیکن اس میں کچھ اختلافات اور فرق تعدادِ اشعار اور مشمولات کا ہے۔" (ص ۳۵)

ص ۳۸ پر مرتب کا اعتراف باین الفاظ سامنے آتا ہے:

"جسے مولانا امتیاز علی عرشی "نسخۂ لاہور" کہہ رہے ہیں، وہ اپنے کوائف اور مشمولات کے اعتبار سے قریب قریب وہی ہے

---

[1] "کم و بیش" کے لفظ مرتب کے ذہنی خلجان کے آئینہ دار ہیں۔

جو "نسخۂ خواجہ" کے طور پر پیشِ نظر اور ہدیہ ناظرین ہے۔"

واضح رہے کہ "نسخۂ لاہور" کا روٹوگراف مولانا عرشی کو قاضی عبدالودود نے اپنے دورۂ پاکستان (۱۹۵۷ء) کے بعد فراہم کیا تھا۔ حال ہی میں ہندوستان سے اس روٹوگراف کی ایک جزوی نقل (بصورت فوٹو اسٹیٹ) راقم کو فراہم ہوگئی ہے جس کے چند صفحات سے زیرِ نظر مقالے کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مرتبہ "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ" کے ضمن میں میری (اور پاک و ہند کے کئی اہلِ علم کی) رائے یہ ہے کہ یہ نسخہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود کے متعارفہ "نسخۂ لاہور" (مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور) سے الگ کوئی نسخہ نہیں، عین بعین وہی نسخہ ہے۔ اِس ضمن میں "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ" کی نسخۂ لاہور سے غیر معمولی مماثلت کی طرف خود ڈاکٹر معین الرحمٰن تواتر سے اشارہ کر چکے ہیں اور ان کے ارشادات سابقہ صفحات میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ نسخۂ خواجہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا گم شدہ یا مسروقہ نسخہ ہے تو میرے پاس اس ضمن میں مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

(۱) سید عبداللہ، قاضی عبدالودود، مولانا عرشی اور خود معین الرحمٰن کی نشاندہی کے مطابق اِس قلمی نسخے کے ۶۴ (چونسٹھ) اوراق یا ۱۲۸ (ایک سو اٹھائیس) صفحات ہیں۔ معین الرحمٰن صاحب نسخے کے صفحات ایک سو ستائیس بتلاتے ہیں کیونکہ وہ قلمی نسخہ کے پہلے خالی صفحے کو شمار میں نہیں لاتے۔ یہی بات ہندوستان کے ممتاز محقق پروفیسر ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھی ہے کہ معین صاحب نے مخطوطے کے جس صفحے کو صفحہ نمبر ایک قرار دیا ہے، وہ دراصل اس مخطوطے کا صفحہ نمبر دو ہے۔ (ر۔ک دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین مرتبہ معراج نیر / اصغر ندیم سید، ص ۳۹) گویا اصلاً اِس مخطوطے کے کل اوراق چونسٹھ یا صفحات

ایک سو اٹھائیس ہی ہیں، ایک سو ستائیس نہیں جیسا کہ معین صاحب نے مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲) اس قلمی نسخے کی مطلا اور مذہب جدول اور اس کی منقش لوح اور دیگر بیان کردہ تمام جزئیات مشمولہ تحریراتِ سیّد عبداللہ، مولانا عرشی و معین الرحمٰن میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

(۳) اس قلمی نسخے کا سائز اور مسطر کی سطریں (پندرہ) سیّد عبداللہ، مولانا عرشی اور معین الرحمٰن صاحب کے یہاں ایک ہی ہیں۔ اِس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سیّد عبداللہ نے اگرچہ مسطر کی سطروں کی تعداد نہیں بتائی مگر ہماری خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اِس نادر قلمی نسخے کے پہلے دو صفحات کا بڑا عمدہ مگر مُقصّرہ (Reduced) عکس ماہِ نَو (جولائی ۱۹۵۴ء) میں اپنے مضمون کے ساتھ شایع کر دیا تھا۔ لوح والے پہلے صفحے کو چھوڑ کر اگلے مکمل مسطر کے حامل صفحے کی سطروں کو گنیں تو تعداد پندرہ نکلتی ہے۔ علاوہ ازیں سیّد عبداللہ کے دو صفحات کے پیش کردہ عکس اور معین الرحمٰن صاحب کے نسخے کے متعلقہ دو صفحات کے عکس میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں حتیٰ کہ نقطے اور شوشے تک کا فرق نہیں۔ یہی حال مذکورہ روٹو گراف کے دو صفحات کے فوٹو اسٹیٹ کا ہے۔ اگلے صفحات میں نسخۂ سیّد عبداللہ، نسخۂ لاہور (مُتعارفۂ عرشی) اور نسخۂ خواجہ (متعارفۂ سیّد معین الرحمٰن) کے عکس قارئین کے مشاہدے کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ ان کے عینَ مین نسخۂ واحد ہونے کی گواہی دے سکیں۔

(۴) نسخۂ خواجہ کے نسخۂ لاہور (یا نسخۂ پنجاب یونیورسٹی متعارفۂ سیّد عبداللہ) ہونے کی ایک ناقابلِ تردید دلیل یہ ہے کہ اس پر لکھنے والے چاروں حضرات نے نمبرؔ کی تقریظ کے اختتامی پیرے کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ یہ

ہیں :

"چوں بہ احصایِ افراد این ھمایوں صحیفہ شتافتم ہمگی اشعارِ شعریٰ شعارِ غزل و قصیدہ و قطعہ و رُباعی ہزار و پانصد و پنجہ و اند یافتم ۔"

یعنی "جب میں اِس مُبارک مجموعے کے اشعار کی گنتی پر آمادہ ہُوا تو جُملہ روشن لقا اشعار از قسمِ غزل و قصیدہ و قطعہ و رُباعی ایک ہزار پانچ سو پچاس سے کچھ اُوپر نکلے ۔" اصلاً ان اشعار کی تعداد جیسا کہ سابق میں مذکور ہُوا، ۱۵۴۸ (پندرہ سو اڑتالیس) ہے ۔

قارئین ! یہاں میری دلیل کو نظر انداز کر کے پہلے سیّد معین الرحمٰن صاحب کے اس اختلاف پر توجہ فرمایئے جس کی رُو سے انھوں نے اپنے نسخے کو سیّد عبداللہ کے مُتعارفہ نسخے سے مختلف ثابت کرنا چاہا ہے اور لکھا ہے کہ نسخۂ خواجہ میں اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۴۸ ہے ۔ ان میں ۱۳۱۲ (تیرہ سو بارہ) شعر غزلیات کے ہیں اور باقی دُوسری اصناف کے جبکہ سیّد عبداللہ کے بقول ان کے زیرِ بحث نسخے میں ۱۵۶۸ (پندرہ سو اڑسٹھ) اشعار ہیں ۔ ان میں ۱۳۳۲ (تیرہ سو بتیس) اشعار غزل کے ہیں اور باقی دُوسری اصناف کے ۔ سیّد عبداللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے مُتعارفہ نسخے میں دو غزلیں جن کے اوّلین مصرعے یہ ہیں موجود نہیں :

(ال) "دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خُوش رہا" اور

(ب) "لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور" ، جبکہ بقول سیّد معین الرحمٰن یہ دونوں نسخۂ خواجہ میں موجود ہیں ۔ واضح رہے کہ یہ دونوں غزلیں نسخۂ لاہور (مُتعارفہ عرشی) میں بھی موجود ہیں ۔ بظاہر معین الرحمٰن صاحب کی دلیل بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے لیکن غور کیا جائے تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سیّد عبداللہ سے اشعار شماری میں غلطی ہوتی ہے ۔ اِس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ انھوں نے مخطوطے کی اشعار شماری کا غیر تخلیقی کام اپنے کسی شاگرد سے لیا ۔

اور اس کی فراہم کردہ شماریات پر بھروسہ کر لیا ہو۔ اگر ان کے قلمی نسخے میں پندرہ سو اڑسٹھ اشعار تھے تو پھر نیّر کے ان الفاظ کے کیا معنی ہیں جو خود سیّد عبداللہ نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں اور جن کے مطابق اشعار کی تعداد "ایک ہزار پانچ سو پچاس سے کچھ اُوپر" ہے۔ علاوہ ازیں اگر مذکورہ بالا دو غزلیں جن کے اشعار کی کل تعداد تیرہ بنتی ہے ان کے نسخے میں موجود نہیں اور ان کے یہاں غزلوں کے کل اشعار تعداد میں ۱۳۳۲ ہیں تو تیرہ کی تعداد منہا کر دینے کے بعد تو بقیہ اشعار غزل کی تعداد نسخہ خواجہ کی تعداد کے مطابق ۱۳۱۲ ہو جانی چاہیے تھی مگر تعداد پھر بھی نسخہ خواجہ سے زیادہ ہی رہتی ہے یعنی ۱۳۱۹ (تیرہ سو انیس)۔ اِس قضیے کا حل سوائے اس کے کچھ نہیں کہ سیّد عبداللہ کے شمار کردہ اشعار کی تعداد کو نظر انداز کر کے تقریظِ نیّر میں بیان کردہ تعداد پر توجہ مرکوز کی جائے۔ جب قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور خود معین الرحمٰن صاحب کے متعارفہ نسخوں میں اشعار کی تعداد تقریظ کے آخری پیرے میں ایک ہی بیان ہوتی ہے تو یہ نسخے الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ غالب کی زندگی میں دیوانِ غالب پانچ بار شایع ہوا۔ چوتھے ایڈیشن (مطبع نظامی کانپور ۱۸۶۲ء) کے سوا ہر ایڈیشن کے آخر میں نیّر کی تقریظ شایع ہوتی رہی۔ ہر بار اس تقریظ میں سہل انگاری کے باعث اوّلین اشاعت کے سنہ کو تو بعینہٖ باقی رکھا جاتا رہا لیکن تعدادِ اشعار پہلے ایڈیشن سے مختلف دی جاتی رہی اور ایسا ہونا فطری تھا اِس لیے کہ اِس عرصے میں جو نئے اشعار کہے جاتے تھے وہ نئے ایڈیشن میں شامل کر لیے جاتے تھے اور لامحالہ تقریظ میں ان اشعار کی قریب قریب صحیح تعداد کی نشاندہی ضروری ہو جاتی تھی۔ مثلاً دیوانِ غالب کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن کی تقریظ میں اشعار کی تعداد "یک ہزار و نود و ہشت اند" (حالانکہ ہشت کے بعد "اند" کی گنجائش نہ تھی) مرقوم ہے۔ اِسی طرح دیوانِ غالب کے دُوسرے ایڈیشن (مئی، ۱۸۴۷ء) کی تقریظ میں اشعار کی تعداد

"یک ہزار و یک صد دو اند" بتائی گئی ہے (ص ۹۸)۔ تیسرے ایڈیشن (۱۸۶۱ء) کی تقریظ میں تعدادِ اشعار "یک ہزار و شش صد و نود و پنج اند" درج کی گئی ہے ۔ اب فرض کیجیے کہ دیوانِ غالب کا پہلا ایڈیشن (۱۸۴۱ء) پانچ سو کی تعداد میں شائع ہوا اور اس کی تقریظ (نثر) میں تعدادِ اشعار ایک ہزار اٹھانوے (۱۰۹۸) بتائی گئی ۔ تو کیا معین الرحمٰن صاحب یہ ثابت کر سکیں گے کہ ان پانچ سو صحیح و سالم نسخوں میں کوئی ایک نسخہ بھی ایسا ہو جس میں اشعار کی تعداد اسی ایڈیشن کے کسی اور نسخے کے مقابلے میں کم یا زیادہ ہو؟ ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں اِلّا یہ کہ کوئی نسخہ ناقص ہو ۔ اسی مثال پر ان چار قلمی نسخوں (بظاہر چار، اصلاً واحد) کو قیاس کریں ۔ اگر ان نسخوں کے آخر میں لکھی گئی تقریظ میں چاروں جگہ "ہزار و پانصد و پنجہ و اند" ہی کے الفاظ ملتے ہیں تو اِس بات کا کیا امکان رہ جاتا ہے کہ نسخۂ لاہور متعارفہ قاضی عبدالودود، نسخۂ متعارفہ عرشی اور نسخۂ متعارفہ معین الرحمٰن میں تو اشعار کی تعداد یکساں ہو مگر نسخہ متعارفہ سید عبداللہ میں بیس اشعار زیادہ ہوں اور کل تعداد ۱۵۴۸ کے بجائے ۱۵۶۸ (پندرہ سو اڑسٹھ) نکلے در آنحالیکہ یہ چاروں نسخے ہر طرح مکمل و سالم ہوں ۔ اور ان چاروں نسخوں کا سائز ایک ہو، مسطر کی سطریں ایک ہوں، کاتب کے قلم کا پوائنٹ ایک ہو، صفحات کی تعداد ایک ہو ۔ سید عبداللہ کے متعارفہ قلمی نسخے کے ابتدائی دو صفحوں کے محفوظ عکس کے ساتھ نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور (متعارفہ عرشی) میں موجود انہی دو صفحوں کو ملا کر دیکھیے ایک حرف تو کجا ایک نقطے اور شوشے کا فرق بھی نظر نہیں آتا ۔ دونوں صفحوں پر سطروں کی تعداد بالکل وہی ہے جو دوسرے دو نسخوں میں ہے ۔ اِن دو محفوظ صفحوں کی ہر سطر جس لفظ سے شروع ہو کر جس لفظ پر ختم ہوتی ہے من و عن نسخۂ لاہور (متعارفہ عرشی) اور نسخۂ خواجہ میں ہر سطر اسی ابتدائی لفظ سے شروع ہو کر اسی اختتامی لفظ پر ختم ہوتی ہے ۔ یہی حال متنِ اشعار کا ہے یعنی نسخۂ لاہور (متعارفہ عرشی) اور نسخۂ خواجہ میں صفحہ بہ صفحہ بالکل ایک ہی پیٹرن پر اشعار کا اندراج ملتا ہے ۔ جس جس صفحے پر "ترک" ہے وہاں

وہاں نُسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور (عرشی) میں ذرّہ برابر فرق نظر نہیں آتا۔ تقابل کے لیے نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور سے شعری متن درج کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب تمام نسخوں کا سائز ایک ہے، مسطر ایک ہے، صفحات ایک ہیں، قلم کا پوائنٹ ایک ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اگر سیّد عبداللہ کے متعارفہ نسخے میں بیس شعر زیادہ تھے تو پھر وہ کس جگہ چھپائے گئے کیونکہ عملاً ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ مجھے ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب کے اس تبصرے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے کہ مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اپنے اپنے طور پر دیوانِ غالب کے جس نسخۂ لاہور کا تعارف کرایا ہے وہ معین صاحب کے شائع کردہ نسخے سے مختلف نہیں اور یہ کہ اشعار کے شمار میں سیّد عبداللہ سے سہو ہوا ہے۔ کم و بیش ایسے ہی قیاس کا اظہار برِّ عظیم کے ممتاز محقق رشید حسن خاں نے کیا ہے۔ انھوں نے سیّد عبداللہ کے تعارف کو ناقص بتایا ہے[1] اور معین الرحمٰن کے متعارفہ نسخۂ خواجہ کو "عینَ مینَ نسخۂ لاہور" سے تعبیر کیا ہے۔ آپ معین الرحمٰن اور رشید حسن خاں کی مراسلت پڑھ جائیے محسوس ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں ایک لمحے کے لیے بھی اس بات کے قائل نظر نہیں آتے کہ نسخۂ خواجہ نسخۂ لاہور سے الگ کوئی نسخہ ہے۔ چونکہ اپنے طویل علمی تجربے اور گہری بصیرت کے باعث وہ اصل صورتِ حال سے واقف ہیں اس لیے انھوں نے معین صاحب کی کاوش کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے بجائے نسخۂ خواجہ کی دیدہ زیبی کی داد دی ہے۔[1] نسخۂ خواجہ کے بارے میں ان کا یہ جملہ آج کل لاہور اور کراچی کے بعض اہلِ علم میں گردش کر رہا ہے کہ "ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا۔"

---

[1] ڈاکٹر پروفیسر حنیف نقوی اور رشید حسن خاں کے مذکورہ خیالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "دیوانِ غالب ـ نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین" کے ص ۳۸، ۳۹ اور ۵۳ تا ۵۹

سید معین الرحمٰن اِس بات کو ماننے پر آمادہ نظر نہیں آتے کہ اشعار شماری میں سید عبداللہ سے غلطی ہو سکتی ہے حالانکہ سید عبداللہ کے زیرِ نظر مضمون میں اشعار شماری کی غلطی کے علاوہ اور بھی کئی سہو نظر آتے ہیں۔ مثلاً اِسی مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"دیوانِ اُردو طبعِ اوّل کی تقریظ میں تعدادِ اشعار ۱۰۷۲، طبعِ ثانی میں ۱۷۹۳۔ پھر اس نسخے میں جو خود مرزا نے ۱۸۵۷ء سے قبل شاید (۱۸۵۴ء / ۱۲۷۱ھ) نواب محمد یوسف علی خان والیِ رامپور کے نذر گزرانا تھا، اِس میں کل ۱۶۹۰ اشعار بتائے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو دیباچہ نظامی ایڈیشن)"

"۔۔۔ یہ تو ظاہر ہے کہ غالب کے اشعار کی تعداد میں بمرورِ وقت اضافہ ہوتا گیا۔ ان کا پرانا دیوان تو خیر پرانا ہوا۔۔۔۔ منتخب دیوان کے مختلف نسخوں کے اشعار میں بھی بہت فرق پایا جاتا ہے اور یہ فرق بالکل قدرتی ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ۱۲۵۴ھ کے نسخے میں تعدادِ اشعار ۱۰۷۲ ہے، رامپور کے نسخہ میں ۱۶۹۰ اور طبعِ ثانی میں ۱۷۹۳۔ یہ تعدادِ اشعار ہر نسخے کے زمانے کے لیے کلید کا درجہ رکھتی ہے یعنی کم اشعار والا نسخہ اقدم ہو گا اور زیادہ اشعار والا نسخہ متوخر ہو گا اِس لحاظ سے موجودہ نسخہ رامپور والے نسخے سے پہلے کا ہونا چاہیے۔[۱]"

اب آپ تضاد ملاحظہ فرمائیے کہ زیرِ بحث مضمون میں ایک جگہ تو بحوالہ عرشی پہلے ایڈیشن (سید المطابع) کی تقریظ میں اشعار کی تعداد ۱۰۹۰ سے کچھ زیادہ (اندازاً) بتاتے ہیں[۲]۔ اور اگلے صفحہ پر اِس تقریظ میں مذکور اشعار کی تعداد ۱۰۷۲ بتاتے

---

[۱] ماہِ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۷

[۲] دیکھیے: ایضاً ص ۱۶

ہیں۔ طرفہ تر یہ ہے کہ صفحہ ۱۶ پر دُوسرے ایڈیشن میں اشعار کی تعداد بحوالہ عرشی گیارہ سو بتاتے ہیں اور اگلے ہی صفحہ میں سابقہ بیان کو نظرانداز کر کے اسی دُوسرے ایڈیشن (طبع ۱۸۴۷ء) کے اشعار کی تعداد ۱۷۹۳ بتاتے ہیں۔ رامپور والے ایڈیشن کا، جس کے اشعار کی تعداد سید صاحب نے ۱۶۹۰ بتاتی ہے، سنہ ترتیب ۱۸۵۴ء ہے۔ اب اگر سید صاحب کے استدلال کو کام میں لایا جائے تو اس کے مطابق رامپور کا نسخہ اقدم ہونا چاہیے اور طبع ثانی جس میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۳ ہے اسے متوخر ہونا چاہیے حال آنکہ یہ بات معلوم ہے کہ دیوانِ غالب کا دُوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا اور اس کے اشعار کی تعداد تقریظ میں گیارہ سو درج ہے۔ گویا ثابت یہ ہوا کہ رامپور والا نسخہ جس میں اشعار کی تعداد ۱۶۹۰ ہے، دُوسرے ایڈیشن سے متوخر ہے نہ کہ اقدم۔

مضمون کے آخر میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ "عین ممکن ہے کہ اس نسخے کے گہرے مطالعے سے کچھ اور انکشافات بھی ہوں[2]" اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب دیوانِ غالب کے "نسخۂ لاہور" کو بوجوہ بنظرِ غائر نہ دیکھ سکے۔ اسی وجہ سے ان سے اشعار شماری میں بھی غلطی ہوئی۔

سید معین الرحمٰن سید عبداللہ کے سہو کو تو ماننے پر تیار نہیں مگر بعض دیگر حضرات کی اشعار شماری کی غلطیوں کی وہ خود ایک سے زیادہ مقامات پر نشاندہی کر چکے ہیں مثلاً اسی نسخہ خواجہ میں وہ بتا چکے ہیں کہ عرشی صاحب سے اشعار گننے میں غلطی ہوئی (دیکھیے ص ۲۶، حاشیہ نمبر ۹) اسی طرح وہ دیوانِ غالب طبع دوم کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس کی اشعار شماری میں بھی غلطیاں ہوئیں اور بڑے اہم لوگوں سے، مثلاً عرشی صاحب کے نزدیک دیوانِ غالب

---

[1] ماہِ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۷

[2] ایضاً ص ۱۹

طبعِ دوم میں اشعار کی کل تعداد ۱۱۰۹ (گیارہ سو نو) تھی۔ سید اسد علی انوری اس ایڈیشن کے اشعار کی تعداد ۱۱۶۰ (گیارہ سو ساٹھ) بتاتے ہیں،[۱] مالک رام کے بقول اِس نسخے میں اشعار کی تعداد گیارہ سو گیارہ تھی جبکہ خود معین الرحمٰن نے اس طبعِ دوم کے اشعار کی تعداد ۱۱۵۸ (گیارہ سو اٹھاون) بتائی ہے۔ اگر عرشی اور مالک رام کے پائے کے لوگ گنتی میں غلطی کر سکتے ہیں تو سید عبداللہ سے غلطی کیوں نہیں ہو سکتی؟ تحقیق میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ خود معین الرحمٰن صاحب سے بھی پیشِ نظر دیوانِ غالب کی تدوین میں بیسیوں غلطیاں ہوئیں جن کا ذکر اس مقالے میں آگے چل کر آئے گا۔

سید معین الرحمٰن صاحب نے اس قیاس کا بھی اظہار کیا ہے کہ ممکن ہے نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور دونوں نسخوں کی "اصل" کوئی ایک ہی مسودہ رہا ہو جس سے ایک ہی کاتب نے ایک ساتھ دو نقلیں تیار کی ہوں[۲]۔ اسی لیے دونوں میں بہت سی غلطیاں مشترک ہیں۔ یہ قیاس اِس لیے بے بنیاد نظر آتا ہے کہ نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور اگر الگ الگ نسخے ہوں اور انھیں ایک ہی کاتب نے ایک ساتھ لکھا ہو تب بھی ان میں تھوڑے بہت فرق کا پیدا ہونا لازم ہے، جبکہ اِن دونوں میں اِس قدر حیرت انگیز مماثلت ہے کہ انھیں ایک دوسرے کا عکس قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ کاتب اور پرنٹنگ پریس مترادف نہیں ہوتے۔ اب رہا یہ سوال کہ نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور میں بعض مقامات پر فرق ہے تو کیوں۔ سو آیئے پہلے اِس فرق کی نوعیت معلوم کر لیں۔ اِس ضمن میں معین الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ اُن کے زیرِ نظر نسخۂ خواجہ میں بعض جگہ نسخۂ لاہور (متعارفہ عرشی) سے انحراف ملتا ہے مثلاً عرشی صاحب کے نزدیک پورے

---

[۱] دیکھیے "غالب کا علمی سرمایہ"، ص ۴۰، ۴۱۔
[۲] دیکھیے "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین"، ص ۴۲

نسخۂ لاہور میں (۱) "اِک" کو "ایک" بدونِ نقاط لکھا ہے (ب) شعر میں ہندسے کو لفظوں میں لکھا جاتا ہے، کاتب نے ایسی جگہوں میں لفظ کے اُوپر عدد کی شکل بھی بناتی ہے۔ (ج) کاتب میرزا صاحب کی ہدایت کے مطابق "خورشید" میں واؤ نہیں لکھتا۔ معین صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کے نسخۂ خواجہ میں (۱) صفحہ نمبر ۱۰، شعر ۶ کے دونوں مصرعوں میں اِک نقطوں کے ساتھ ہے، (ب) نسخۂ خواجہ میں یہ اہتمام (یعنی لفظ کے اُوپر عدد کی شکل) ایک آدھ جگہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ (ج) نسخۂ خواجہ میں ص ۲۰، شعر ۶ کے دُوسرے مصرعے میں "خُورشید" میں واؤ لکھا گیا ہے[۱]۔ معین صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے نسخے میں نسخۂ لاہور (عرشی) کے برعکس "مژگاں ہوگا" کے بجائے "مژگاں ہونا" ہی ضبط ہوا ہے۔ (ص ۲۷)

معین صاحب کے پہلے اعتراض کے ضمن میں دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ کو ص ۱ پر کھولیے اور شعر نمبر ۶ کے دونوں مصرعے ملاحظہ فرمائیے۔ متنی عکس میں شعر یوں لکھا ہے :

یاد کر وُہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں ایک دیدۂ بے خواب تھا

پہلے مصرعے میں "اِک" کا لفظ نہیں "یک" کا لفظ ہے، لہٰذا معین صاحب کا ارشاد غلط ثابت ہُوا۔ دُوسرے میں "اِک" ہے مگر اسے کاتب نے ایک (بدونِ نقاط) ہی لکھا ہے اور یوں معین صاحب کے برعکس عرشی صاحب ہی کے مؤقف کی تصدیق کی ہے۔

معین صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے نسخۂ خواجہ میں ص ۲۰، شعر ۶ کے دُوسرے مصرعے میں "خُورشید" میں واؤ لکھا گیا ہے۔ عرض یہ ہے کہ نسخۂ لاہور

---

[۱] دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ، ص ۲۵ (مرتّب کا مقدمہ)

(متعارف عرشی) میں بھی اسی صفحے کے اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں "خورشید" میں واؤ موجود ہے اور اس کی نشاندہی خود عرشی کر چکے ہیں۔ (دیکھیے دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی ص ۱۱۷، دیباچہ) لگتا ہے نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور کے اختلافات نمایاں کرنے کے اضطراب میں معین صاحب عرشی صاحب کا نسخۂ لاہور پر لکھا ہوا مختصر تعارف نامہ بھی غور سے نہیں پڑھ سکے۔

اب رہ گئیں دو باتیں۔ اول یہ کہ بقول معین صاحب صفحہ ۱۹ شعر ۱۹ اور ص ۳۱ شعر ۶ میں لفظ اک کو "ایک" لکھا گیا ہے۔ تو یہ بات درست ہے، ان کی یہ بات بھی درست ہے کہ نسخۂ خواجہ میں لفظ کے اوپر عدد کی شکل کا اہتمام نسخۂ خواجہ میں ایک آدھ جگہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان کا یہ ارشاد بھی بجا ہے کہ نسخۂ لاہور (عرشی) کے برعکس ان کے نسخے میں "مژگاں ہوگا" کے بجائے "مژگاں ہونا" درست لکھا گیا ہے۔ بس یہ ہے ان انتہائی معمولی اختلافات کی کل کائنات!

ان "اختلافات" کے ضمن میں دو باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ اول یہ کہ اگر مالِ مشکوک (یا مالِ مسروقہ) ہاتھ لگ جائے تو اسے اپنا ثابت کرنے کے لیے اس میں ترمیم کرنا لازم ہوتا ہے۔ جس "فتنے دین" نے نسخۂ لاہور کے آخری ورق پر تقریظ کے خاتمے کے معاً نیچے بنے ہوئے مزین چوکور کے اندر لگی ہوئی مدوّر مُہر کو چھپانے کے لیے اپنی چیپی (چِٹ) لگا دی ہو[1]، اس سے کیا بعید ہے کہ اس نے دو جگہ دو دو نقطے بڑھا دیے ہوں؛ "ہوگا" کے دو مرکزوں کو بلیڈ کے ساتھ بڑی نفاست سے کھرچ کر اور ایک نقطہ بڑھا کر "ہونا" کر دیا ہو اور جن مقامات پر کاتب نے ہندسی لفظ کے اوپر عدد کی چند اشکال بنائی تھیں، انھیں کھرچ دیا ہو۔ بدگمانی تو نہیں کرنی چاہیے مگر چونکہ تحقیقی و تدوینی معاملات میں بدقسمتی سے خود معین صاحب

---

[1] دیکھیے "نسخۂ لاہور" کے آخری صفحہ کا عکس جو اسی مقالے میں شامل کیا جا رہا ہے اور جس میں مدوّر مُہر صاف نظر آتی ہے۔

کی شہرت اچھی نہیں اِس لیے بعید نہیں کہ یہ "کارِ خیر" انھی کے ہاتھوں انجام پایا ہو۔ آخر جو شخص رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر اُسے چھپوا سکتا ہو (دیکھیے "جدید اُردو غزل"، ۱۹۸۰ء کا بیک ٹائٹل)، جو شخص پرتھوی چندر کی "جاگیرِ غالب" اپنے نام سے شائع کر سکتا ہو (دیکھیے سُورج کا غالب نمبر ۱۹۹۶ء) جو شخص اپنی ایم اے اُردو کی شاگرد کشوری باسط کے مقالے "ادا جعفری —— شخصیت اور شاعری" (۱۹۹۱ء) کا بیشتر حصہ اپنے نام سے "نقوش" میں چھپوا سکتا ہو (دیکھیے "نقوش"، شمارہ ۱۳۹، ص ۶۶۳ تا ۷۳۹) اور اسی قبیل کے دیگر کئی افسوس ناک کام جن کی تفصیل کبھی آئندہ) کر سکتا ہو، اُس سے بعید نہیں کہ زندگی کے کسی کمزور لمحے میں اس سے یہ ترا اسم بھی "سرزد" ہو گئی ہوں! بس، 'خطا نموده اَم و چشمِ آفریں دارم' والا معاملہ ہے، معاملہ نہیں المیہ ہے۔

یہاں یہ سوال اُٹھانا بے محل نہ ہو گا کہ معین الرحمٰن صاحب کو یہ قلمی نسخہ کہاں سے ملا؟ خود معین الرحمٰن صاحب کا اِرشاد تو یہ ہے کہ انھیں یہ نُسخہ ۱۹۸۱ء کے پس و پیش "پُرانی کتابوں کے ایک کاروباری" (ص ۵) سے مع ایک قلمی نسخے اور بیمن نادر مطبُوعہ کتب کے، ہاتھ لگا۔ سوال یہ ہے کہ "پرانی کتابوں کا یہ کاروباری" کون ہے؟ جب تک معین صاحب اس کی صراحت نہیں کرتے دیوانِ غالب کے نُسخۂ خواجہ کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار فطرتاً کیا جاتا رہے گا۔ بعض حلقوں نے یہ قیاس کیا ہے کہ معین صاحب کو یہ نادر نُسخہ ایس ایم اکرام (م ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء) کی لائبریری سے مِلا ہے جن تک یہ نسخہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے توسط سے پہنچا، کیونکہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی مولانا امتیاز علی عرشی کے علاوہ ایس ایم اکرام سے بھی اس نادر نسخے کے باب میں خط کتابت رہی تھی۔ ممکن ہے اکرام صاحب کے ملاحظے کے لیے سیّد صاحب نے یہ نسخہ انھیں روانہ کیا ہو اور پھر کسی وجہ سے وہاں سے واپس نہ

آسکا ہو۔ تاآنکہ معین الرحمٰن کو ایس ایم اکرام کی وفات کے بعد ان کی نجی لائبریری کی کتب کی فہرست سازی کا موقع ملا اور یوں یہ نادر نسخہ ان کے ہاتھ لگا۔ یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ تخلیقِ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں بعض قابلِ اعتماد حضرات کو، ایک اقرار نامہ (BOND) بھر کر دے دینے کے بعد یونیورسٹی لائبریری سے قلمی نسخہ جاری کر دیا جاتا تھا۔ یہ روایت کافی برس بعد تک بھی رہی۔ چنانچہ دیوانِ غالب کا نسخۂ شیرانی (قلمی) کئی بار حمید احمد خاں کے نام جاری ہوا چنانچہ اسی ضابطے کے تحت دیوانِ غالب کا زیرِ بحث قلمی نسخہ سیّد عبداللہ کی تحویل میں رہ کر ایس ایم اکرام تک پہنچا ہو گا۔

مَیں نے دیوانِ غالب کے نسخۂ خواجہ کے باب میں متعدد اہلِ نظر[1] سے تبادلۂ خیالات کیا۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ نسخۂ خواجہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ہی کے گم شدہ نسخے کا ظہورِ ثانی ہے۔ سب کی یہی رائے تھی کہ نسخۂ خواجہ، سیّد عبداللہ کے متعارفہ نسخے میں مبیّنہ فرق کی بنا پر، اس سے الگ نسخہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ فرق محض اس لیے نظر آتا ہے کہ سیّد عبداللہ سے اس نادر نسخے کے اشعار کی گنتی میں غلطی ہوئی۔ میں نے اس ضمن میں پاکستان کے ممتاز ترین مخطوطہ شناس اور صاحبِ نظر محقق جناب خلیل الرحمٰن داؤدی سے استفسار کیا تو ان کا جواب یہ تھا کہ میرا پچاس برس کا مخطوطہ شناسی کا تجربہ مجھے بتاتا ہے اور میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے (انھوں نے اس موقع پر انگریزی الفاظ "CONSIDERED OPINION" استعمال کیے تھے) کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کا متعارفہ نسخۂ دیوانِ غالب (نسخۂ خواجہ) عین مین اور ہو بہو وہی نسخہ ہے جس کا تعارف جولائی سنہ ۱۹۵۰ء کے ماہِ نو (کراچی) میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے کرایا تھا اور جو بدقسمتی سے اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے غائب ہو

---

[1] ان حضرات کے اسماء کا ذکر سرِدست مناسب نہیں سمجھا گیا۔

چکا ہے۔

(۵) نسخۂ خواجہ کے نسخۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ نسخۂ خواجہ کے صفحہ نمبر ۲۲ کا عکس دیکھیں تو جدول کا زیریں حصہ صاف کھرچا گیا نظر آتا ہے۔ غالباً یہیں اِس نسخے کا ایکسیشن نمبر درج تھا۔ لائبریری سائنس کا علم رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ ہر لائبریری کی کتاب پر ایک متعین سیکرٹ پیج ہوتا ہے جہاں Acc No لگایا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اگر کتاب چوری ہو جاتے تو اس کے سیکرٹ پیج پر لگے ایکسیشن نمبر کی بنیاد پر اس کی بازیافت ہو سکے۔ چنانچہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا سیکرٹ پیج ازرُوئے ضابطہ ۲۲ ہے۔ اگلے صفحات میں نسخۂ خواجہ کے صفحہ نمبر ۲۲ کا عکس پیش کیا جا رہا ہے۔

معین الرحمٰن صاحب نے رشید حسن خاں کے نام اپنے ایک خط میں نسخۂ خواجہ کو سیّد عبداللہ کے متعارفہ نسخے سے مختلف قرار دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے:

> "میرا احساس ہے کہ پنجاب یونیورسٹی [لائبریری] لاہور میں اُردو دیوانِ غالب کے دو خطی نسخے رہے ہیں (یہ اب دونوں موجود نہیں)، ایک وہ جسے قاضی عبدالودود نے دیکھا اور جسے عرشی صاحب نے "نسخۂ لاہور" بتایا ہے ــ اِس سے مختلف دُوسرا نسخہ وہ تھا جسے ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے متعارف کرایا ہے۔"
>
> "نسخۂ خواجہ نسخۂ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا توأم تو ضرور ہے لیکن یہ سیّد عبداللہ کے نسخے سے مماثل مگر اس سے مختلف ہے۔"
>
> "نسخۂ خواجہ کے بارے میں میرا پختہ یقین ہے کہ یہ غالب کی

نظر سے گزرا ہے اور اگر یہ آپ کے ابتدائی اندازے کے مطابق "عین مین نسخۂ لاہور ہی معلوم ہوتا ہے" تو پھر اس کے بارے میں عرشی صاحب کا بھی مشاہدہ یہ ہے کہ اندرونی شہادت ثابت کرتی ہے کہ اسے اوّل سے آخر تک میرزا صاحب نے پڑھا ہے اور اکثر جگہ اغلاطِ کتابت کی اصلاح بھی کی ہے۔"

"مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے جن سات مقامات پر غالبؔ کے قلم کی گواہی دی ہے وہ ساتوں صورتیں "نسخۂ خواجہ" میں بھی من و عن موجود ہیں۔"[1]

مندرجہ بالا مکتوبِ معین کا یہ جملہ قابلِ توجہ ہے: "نسخۂ خواجہ نسخۂ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا توآم تو ضرور ہے" (ص ۵۷)۔ اِس جملے کا مطلب سوائے اِس اعتراف کے کچھ نہیں کہ یہ نسخہ لاہور ہی ہے۔ اب اگر ایک لمحے کو معین الرحمٰن صاحب سے اتفاق کرتے ہوئے یہ بھی مان لیا جائے کہ نسخۂ لاہور (متعارفۂ عرشی)، سیّد عبداللہ کے متعارفہ نسخے سے الگ کوئی نسخہ ہے تو اتنی بات تو خود عرشی نے لکھی ہے کہ اِس نسخے کی نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے قاضی عبدالودود کے ذریعے بصورت روٹوگراف انھیں فراہم کی گئی تھی۔ اس کا مطلب سوائے اس کے کیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا یہ نسخہ، لائبریری سے کسی وقت چوری ہو کر یا کسی اور ذریعے سے معین الرحمٰن صاحب تک پہنچا۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس مشکوک (یا مسروقہ) مال کی خرید "پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے" کس اصول کے تحت کی گئی اور کیا اندریں حالات اس کا موجودہ مالک قانون کی گرفت سے بچ سکتا ہے؟

معین الرحمٰن صاحب کو چونکہ اصل صورتِ حال کا علم ہے، اِسی لیے انھوں

---

[1] "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین"، ص ۵۷

نے پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر خالد حمید شیخ کو "پنجاب یونیورسٹی سے اپنے دیرینہ تعلق کی بنا پر"، "ایک ذراسی شرط کے ساتھ" "ضمانت حاصل کرنے کے بعد"، یہ قلمی نسخہ ہدیہ کرنے کی پیش کش کی تھی تاکہ یہ گم شدہ نسخے کی جگہ لے سکے۔" ذراسی شرط" یہ لگائی ہے کہ یونیورسٹی لائبریری میں اِس نسخے کی حفاظت کا کوئی مُستقل اِنتظام فرمایا جائے" تاکہ یہ پچھلے نسخوں کی طرح معدوم یا ضائع نہ ہو جائے[1]۔"

ڈاکٹر صاحب کی اس پیش کش پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ ان سے پوچھا جائے کہ حضرت! اگر نسخۂ خواجہ اصلاً دیوانِ غالب کا نسخۂ لاہور ہی ہے جیسا کہ خود آپ نے خواہی نخواہی اعتراف کیا ہے تو کیا آپ میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ آپ اسے ہدیے کے طور پر نہیں، سرقے کے کفارے کے طور پر یا کم از کم امانت سمجھ کر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو لوٹا دیں تاکہ یہ متاعِ بُردہ[2] وہاں پہنچ جائے جہاں سے کسی دستِ گستاخ نے اُسے اُچک لیا تھا یا کسی مردِ نفیس نے اسے ملاحظہ کے لیے مستعار لیا تھا مگر اسے واپس نہ کر سکا؟

(۲)

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ کی تدوین و تحقیق مرتب کے بقول ان کی برسوں کی محنت کا حاصل ہے۔ فرماتے ہیں:

"دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ کی بازیافت کو میں خود بھی اپنے کاموں میں اہمیت دیتا ہوں۔ اس کی تدوین و تحقیق میں مجھے پندرہ سترہ

---

[1] اس پیش کش کی تفصیل کے لیے دیکھیے: "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ۔ تجزیہ و تحسین"، ص ۳۱۹ تا ۳۲۱۔

[2] یہ ترکیب غالب ہی کے ایک مصرعے کی یاد دلاتی ہے: متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر۔

برس لگے[۱]

نسخۂ خواجہ کے دیباچے میں ارشاد ہوتا ہے :

"متنی تحقیق و تدوین کا یہ کام برسوں کی ریاضت اور محنت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچا۔" (ص ۷)

آگے چل کر فرماتے ہیں :

"ان سب معاملات و مراحل پر اب جب کہ نظر ڈالتا اور غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے اور باور نہیں آتا کہ دیدہ ریزی اور سوزن کاری کا یہ مشکل کام برسوں کے رتجگوں، اپنی کمزور صحت اور دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ کیونکہ مجھ سے بن آیا ؟ یہ شاید عشق، شغف، اور لگن ہی ہے جس کے بل پر دنیا میں اَن ہونے کام ہوئے ہیں۔"

(ص ۸)

اِن ادّعاتی بیانات اور شاعرانہ تعلّیوں کے بعد جب ہم دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (جو اصلاً نسخۂ لاہور ہی ہے) کے دیباچے اور مدوّنہ متن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو قدرتاً مایوسی ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرتّب موصوف بڑی عجلت میں تھے۔ انھوں نے عکسی متن کے بالمقابل ہر صفحے کے اشعار کو جدید کتابت میں بھی لکھوا کر شایع کیا ہے تاکہ جو لوگ قدیم خط سے مانوس نہیں وہ بھی دیوان کو بہ سہولت پڑھ سکیں اور اس کے مطالب سے واقف ہو سکیں مگر افسوس یہ ہے کہ وہ نہ تو قلمی نسخے کا متن زیادہ توجہ سے دیکھ پاتے اور نہ اس کی اطمینان بخش باز نوشت (Transcription) ہی کر سکے۔ ان کے سامنے دیوانِ غالب کی متنی تدوین کے کسی قدر اچھے نمونے نسخۂ عرشی اور نسخۂ حامد علی خاں کی شکل میں موجود تھے اور انھوں نے اِن پیشرو تدوینی کارناموں سے فائدہ بھی اٹھایا، پھر بھی انھوں نے جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔

---

[۱] دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین، ص ۲۰۰

معین الرحمٰن صاحب کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ موزوں طبع نہیں ایسا شخص جو مصرع وزن میں نہ پڑھ سکتا ہو اسے کم از کم تدوینِ متنِ شعر سے حتی الوسع گریز کرنا چاہیے۔ دیوانِ غالب کے نسخۂ خواجہ کی متنی تحقیق و باز نوشت کے ضمن میں ان کا ماڈل عرشی کا مرتّبہ دیوانِ غالب (طبع ثانی) رہا ہے مگر اس کی اندھا دُھند تقلید سے (خصوصاً رموزِ اوقاف کے باب میں) تدوین کے تقاضے مجروح ہوتے ہیں اور بعض جگہ خبطِ مفہوم کی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کے تیار کردہ نثری متن میں بھی تسامحات ہیں، اصناف وار کلامِ غالب کی توقیت کے ضمن میں پیش کردہ مصرعوں، توضیحات و تعلیقات میں بھی اور فارسی متن کے اردو ترجمے میں بھی۔ جہاں کہیں قلّابین کا اہتمام لازمی تھا وہاں کہیں بھی ایسا اہتمام نظر نہیں آتا۔ ہم سب سے پہلے شعری متن کی باز نوشت (Transcription) میں ان سے ہونے والی غلطیوں نیز کتابت کی خامیوں کا گوشوارہ پیش کرتے ہیں :

(پہلا عدد صفحے کو، دوسرا شعر نمبر کو اور تیسرا مصرعے کو ظاہر کرتا ہے۔)

صفحہ		شعر نمبر		مصرع نمبر	غلط/ناقص	صحیح
۹	:	۱۰	:	۱	چراغاں آب جو	چراغانِ آب جو (یہ ترکیب ہے)
۱۳	:	۸	:	۱	ترے وعدے پہ	ترے وعدے پر
۱۵	:	۱۲	:	۲	دوام، کلفتِ خاطر	دوامِ کلفتِ خاطر
۱۸	:	۲	:	۱	صیقل آئینہ ہنوز	صیقلِ آئینہ ہنوز
۲۰	:	۳	:	۲	دلِ آزردگاں کا	دِل آزردگاں کا
۲۲	:	۹	:	۲	عرش سے اِدھر ہوتا	عرش سے اُدھر ہوتا
۲۹	:	۳	:	۲	قدم پیشیر	قدم پیشتر
۴۲	:	۷	:	۲	مِہر گیا	مہر گیا
۴۵	:	۱۱	:	۱	خط ایک اور	خط اِک اور

صفحہ	شعر نمبر	مصرع نمبر	غلط/ناقص	صحیح
۴۹	۷	۲	سَیلیِ اُستاد	سِیلیِ اُستاد
۵۱	۴	۲	یا بہ حنا	پا بہ حنا
۵۹	۴	۲	بہشت	بہشت
۶۳	۳	۱	سَیلی	سِیلی
۶۸	۹	۲	سینکڑوں	سیکڑوں
۷۶	۱۰	۲	اگر بودے	اگر بودے
۷۶	۱۳	۱	اِس یئے خیمے کے پیچھے	اس کے خیمے کے پیچھے
۷۷	۱۲	۲	کوَدکی	کوُدکی
۷۸	۳		[اصل متن سے شعر کی بازنوشت نہیں کی گئی۔ شعر اگلے کالم میں دیکھیں]	ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم ہر موج گردِ راہ مرے سر کو دوش ہے
۷۹	۳	۱	گریہ نکالے ہے تری بزم سے[1]	گریہ نکالے ہے تیری بزم سے
۸۰	۱۰	۱	دلِ ناداں	دلِ نالاں
۸۱	۶	۲	کسی	کسو
۸۳	۱۳	۲	ہماری جَیب	ہمارے جَیب
۸۸	۳	۱	ہو جو	ہوُ جو
۸۹	۷	۱	عیادت کو تم آتے	عیادت کو تم آتے ہو
۸۹	۷	۲	طالع بیدار بستر	طالعِ بیدارِ بستر
۹۰	۵	۱	نہ ہووے	نہ رہوے

---

[1] شاید عرشی کی تقلید میں "تیری" کو "تری" لکھا اور مصرع وزن سے خارج ہوگیا۔
دیکھیے نسخۂ عرشی ص ۲۶۴

صفحہ	شعر نمبر	مصرع نمبر	غلط/ناقص	صحیح
۹۴	۷	۲	سررشتۂ سلامت	سررشتۂ سلامت
۹۶	۶	۲	بَرقِ نظّارہ سوز	برقِ نظارہ سوز
۱۰۱	۱۱	۱	بنا وہیں	بناؤ ہیں
۱۰۴	۱۱	۲	تجمل حیبں خاں	تجمل حسین خاں
۱۰۵	چوتھی سطر		علیہ التحیۃ	علیہ التحیۃ
۱۰۶	۱	۱	لعل سی کی ہے	لعل سے کی ہے
۱۰۶	۵	۲	مروَحہ بالِ پَری	مروَحہ بالِ پری
۱۰۷	۱۰	۲	آئینہ	آئنہ
۱۰۸	۱۲	۱	آستاں پہ ہے ترے	آستاں پر ترے ہے
۱۱۶	چودھویں سطر		چمن سرمایہ کردن گفتار بتابیش کلکتہ	چمن سرمایہ کردنِ گفتار بستایش کلکتہ
۱۱۷	۱۰	۱	مشابہہ	مشابہ
۱۱۸	۷	۱	فلک منظرِ بےمثل و نظیر[1]	فلک منظر و بےمثل و نظیر
۱۱۸	۱۱	۲	داغِ نہِ ناصیہ	داغ نہِ ناصیہ

نسخۂ خواجہ کے بارے میں سید معین الرحمٰن صاحب کا عرشی کی تقلید میں یہ موقف

---

[1] "فلک منظرِ بےمثل و نظیر" غلط نہیں مگر غالب نے اِس شعر کے دُوسرے مصرعے میں دو عطفوں کا اہتمام کر کے آہنگ کی تاثیر میں جو اضافہ کیا تھا وہ پہلے مصرعے میں اضافت لگنے سے کم ہو جاتا ہے۔ نسخۂ عرشی و حامد میں اضافت ہی کے ساتھ ہے مگر نسخۂ خواجہ کے متن میں ذیل کی شکل میں ہے اور یہی مرجح ہے:

؎ اے شہنشاہِ فلک منظر و بےمثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوہ و بےشبہ و عدیل ، ص ۱۱۸

ہے کہ اس پر خود غالب نے اپنے قلم سے اصلاحیں لیں، اس کے باوجود کتابت کی متعدد اغلاط سے ان کی نگاہ چوک گئی۔ ایسی بعض غلطیوں کی نشاندہی عرشی نے بحوالۂ نسخۂ لاہور کر دی تھی۔ مزید اغلاط کی نشاندہی نسخۂ خواجہ کے مرتب نے کی ہے مگر اس کے باوجود بہت سی اغلاطِ متن پر ان کی نگاہ نہیں گئی۔ ملاحظہ فرمائیے:

صفحہ	شعر نمبر	مصرع نمبر	غلط/ناقص	صحیح
۶	۱۲	۲	کلدستہ	گلدستہ
۶	۱۲	۲	باغِ نسیاں	طاقِ نسیاں
۷	۵	۲	ہیولی	ہیولیٰ
۹	۱۳	۱	ناکہاں	ناگہاں
۱۰	۷	۲	کفِ سیلاب کا	کفِ سیلاب تھا
۱۵	۶	۱	کر نگاہِ گرم	گر نگاہِ گرم
۱۹	۹	۱	تیرے وحشی کو	ترے وحشی کو
۱۹	۹	۲	کچھ ایک رنجِ گرانباری	کچھ اِک رنجِ گرانباری
۲۷	۶	۲	کفتارِ دوست	گفتارِ دوست
۳۲	۱	۲	ہوتی رواں اور	ہوتی ہے رواں اور
۳۴	۳	۱	ستمکش	ستم کش
۳۵	(تزک)		جکر تشنہ	جگر تشنہ
۴۷	۱۱	۱	ہر ایک تیز رَو کے ساتھ	ہر اک تیز رَو کے ساتھ
۸۹	۱۱	۱	خطر ہے رشتۂ الف	خطر ہے رشتۂ اُلفت
۹۱	۸	۲	گر گئی	کر گئی
۹۶	۱	۲	طرہ لیلا	طرۂ لیلا
۸۲	۱۱	۲	ذرا	زرا

تدوینِ متنِ شعر میں مرتب نے غالب کے منشائے املا کو پیشِ نظر رکھا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مصرعِ غالب : بالِ تذرو جلوۂ موجِ شراب ہے میں "بالِ تذرو" کو غالب کے منشاء کے مطابق "بالِ تدرو" لکھا ہے مگر مرتب کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ غالب کے تصوراتِ لغت و املاء سے زیادہ واقف معلوم نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "تذرو" کو تو "تدرو" لکھتے ہیں کہ غالب کے نزدیک "تذرو" "تدرو" کا معرب ہے (دیکھیے "قاطع برہان" مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۵۹) لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اسی "قاطع بُرہان" میں انھوں نے آذر (آتش) کو "آدر" لکھا ہے اور قطعی انداز میں کہا ہے کہ "آذر بذالِ منقوطہ زنہار نیست (قاطع، ص ۱۴۳) اس کے باوجود مرتب موصوف نے غالب کے اِس مصرع :
ہے عارِ دل، نفس، اگر آدر فشاں نہیں، میں آدر کو "آذر" لکھا ہے حال آنکہ ان کے مُرشد، عرشی نے اِس موقع پر "آدر" ہی لکھا ہے۔ (دیکھیے نسخۂ عرشی ص ۲۳۳)
مُراد یہ ہے کہ مرتب کہیں تو غالب کے منشائے املا کی پیروی کرتے ہیں اور کہیں اس سے انحراف۔ اصل متن میں تین مقامات پر جہاں لفظ "ذرا" آیا ہے، لکھتے ہیں کہ کاتب کو منشائے غالب کے مطابق "ز" لکھنا چاہیے تھی لیکن خود اپنا یہ حال ہے کہ تینوں مقامات پر بازنوشت کرتے ہوئے "ذرا" ہی لکھا ہے۔ دیکھیے نسخۂ خواجہ <u>۸۲ : ۱۱ : ۱</u> ، <u>۸۹ : ۴ : ۲</u> ، <u>۹۴ : ۳ : ۲</u> بازنوشت کے صفحہ ۱۰۶ کے ساتویں شعر کا مصرع ملاحظہ فرمایئے : ذرّہ اس گرد کا خرشید کو آئینۂ ناز۔ اِس ایک مصرعے کا طرزِ املاء ہی مرتب کے تذبذب اور تضاد کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔ "ذرّہ" تو منشائے غالب کے خلاف ذال ہی سے لکھا ہے مگر "خرشید" غالب کے تتبع میں بغیرِ واؤ لکھا ہے۔ ص ۸۱ کے چھٹے شعر کا دُوسرا مصرع یوں لکھا ہے : "جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے" جبکہ اسی مقام کے عکسی متن میں

لہ گ کا اُوپر والا مرکز جگہ جگہ سے غائب ہے۔ کہاں تک نشاندہی کی جائے۔

"کسی" کی جگہ "کسو" ہے۔ قاری سمجھتا ہے کہ مرتّب نے "کسو" کو "کسی" اِس لیے لکھا ہوگا کہ "کسو" متروک ہو چکا ہے مگر اسے سخت حیرت ہوتی ہے جب وہ صفحہ ۱۱۹ پر غالب کے ایک مشہور مصرعے کی باز نوشت ہرگز کبھی کسو سے عداوت نہیں مجھے" کی صورت میں دیکھ کر "کسو" سے دوچار ہوتا ہے[1]! متروکاتِ املاء کے ضمن میں مرتّب اور بھی کئی مقامات پر اسی تذبذب اور تضاد کا شکار نظر آتے ہیں۔ صفحہ ۷۵ پر مشہور غزل "پھر کچھ اِک دل کو بے قراری ہے"، کی نقل حرفی کرتے ہُوتے لفظ "دہی" کو دو مقامات پر "دوہی" اور دو شعر بعد اسی لفظ کو "دہی" لکھا ہے بایں صُورت:

دوہی صد رنگ نالہ فرسا ئی — دوہی صد گونہ اشک باری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مرتّب نے اصل متن کی پَیروی کرتے ہوئے دو جگہ "دہی" کو "دوہی" لکھا ہے مگر اس قیاس میں ترمیم یوں لازم آتی ہے کہ اسی غزل کے اگلے دو شعروں کے بعد "دہی" کو "وہی" لکھا ہے حالانکہ عکسی متن میں اس مقام پر بھی کاتب نے "دوہی" لکھا تھا "پھر دوہی زندگی ہماری ہے"۔ دیوانِ غالب نسخۂ حامد علی خاں اور دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں بھی اِن دو مقامات پر لفظ "دہی" کو "دوہی" لکھا گیا ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ مرتّب کم و بیش ہر جگہ عرشی ہی کی پَیروی کو اپنا وظیفہ بنا لیں[2]۔ ایک اور مثال لفظِ "جیب" کی ہے ص ۵۳

---

[1] یا مثلاً ؎ جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب۔ کیوں کسو کا گلا کرے کوئی، ص ۹۷

[2] پیچھے میں نے "کسو" اور "کسی" کے ضمن میں نسخۂ خواجہ سے جو مصرع درج کیا تھا یعنی: جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے"، اُس میں بھی "کسو" کی جگہ "کسی" اسی لیے آیا ہے کہ نسخۂ عرشی میں بھی "کسی" مرقوم ہے۔ دیکھیے دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) ص ۳۱۸۔

پر اسے "ہمارے جَیب" لکھا ہے اور درست لکھا ہے :

یعنی ہمارے جَیب میں اِک تار بھی نہیں

مگر تیس ۳۰ صفحے بعد "ہمارے جَیب" کی جنس بدل کر "ہماری جَیب" ہوگئی اور یوں شعر کے معانی خبط ہو گئے :

؎ چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ۔ ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
ص ۸۳ ۔

واضح رہے کہ اِس موقعے پر حامد و عرشی دونوں کے نسخوں میں "ہمارے" لکھا گیا ہے اور یہی صحیح ہے، دیکھیے دیوانِ غالب نسخۂ حامد ص ۱۴۶، نیز دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ص ۳۲۲ ۔ عرشی نے خوب نشاندہی کی ہے کہ غالب کا مندرجہ بالا اُردو شعر ان کے ذیل کے فارسی شعر کی یاد دلاتا ہے ۔ (میرے خیال میں یہ شعر لفظِ جَیب کی وضاحت بھی کرتا ہے)

؎ بہ تن چسپید بازم از نمِ خونابہ پیراہن
خراشِ سینہ، سطرِ بخیہ شد چاکِ گریباں را

میں عرض کر چکا ہوں کہ دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ کے متن کی بازنوشت میں مولانا امتیاز علی عرشی، معین صاحب کے لیے نمونۂ تقلید بنے ہیں ۔ عرشی کے مرتبہ دیوانِ غالب کو متنی تحقیق کی یقیناً ایک عمدہ کاوش قرار دیا جا سکتا ہے مگر اس میں اوقاف خصوصاً واوِ مقلوب (ʻ) کی بھرمار سے بعض جگہ قاری سہولت کے بجائے اُلجھن کا شکار ہو جاتا ہے ۔ معین صاحب کے یہاں چند جگہوں کو چھوڑ کر ہر جگہ عرشی کی چشم بستہ تقلید کے شواہد ملتے ہیں ۔ اوقاف کا اہتمام نسخۂ حامد علی خاں میں بھی کیا گیا ہے مگر وہاں توازن کا احساس ہوتا ہے اور یہاں تذبذب کا ۔ حد تو یہ ہے کہ بعض جگہ ایک مصرعے کے دو ایسے لفظوں کے بیچ بھی اُلٹا واو حائل ہو گیا ہے جہاں ساتھ عطف بھی آتا ہے مثلاً :

وائے محرومیِ تسلیم، و بدا! حالِ وفا ۔

حالانکہ یہاں صاف : دانۂ محرومیِ تسلیم و بداحالِ وفا ، ہونا چاہیے تھا۔
یا مثلاً صفحہ ۸۷ پر ایک شعر کی قرأت میں اُلٹا واؤ اِس طرح مزاحم ہوا ہے :
لُطفِ خرامِ ساقی ، و ذوقِ صدائے چنگ
اِسی طرح کی صورتِ حال ص ۹۹، ص ۱۰۰، ص ۱۰۶ اور ص ۱۰۷ پر ہے جس سے مصرعوں کی روانی کو سخت دھچکا لگتا ہے :

(i) دِل مدّعی ، و دیدہ بنا مدّعا علیہ
(ii) غفلت کفیلِ عمر ، و اسد ضامنِ نشاط
(iii) یک طرف نازشِ مژگان ، و دگرسو غمِ خار
(iv) لافِ دانش غلط ، و نفعِ عبادت معلوم

بعض جگہ واوین کا غیر ضروری اور بے محل اہتمام کیا گیا ہے مثلاً صفحہ ۸۲ کی ایک غزل کے مطلع میں واوین کا یوں اہتمام کیا ہے :

"شکوے کے نام سے 'بے مہر خفا' ہوتا ہے"

یہ واوین اور بعد کے منقلوب واؤ قطعاً بے محل ہیں۔ حامد و عرشی نے بھی اِس موقعے پر واوین نہیں لگائے۔ اِسی صفحے پر درج پہلی غزل کے دوسرے شعر کے مصرعِ اوّل پر بھی واوین کو خواہ مخواہ زحمت دی گئی ہے :

قضا نے تھا مجھے چاہا "خرابِ بادۂ الفت"

یہاں "خرابِ بادۂ الفت" کو آزاد رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ اِس موقع پر حامد و عرشی نے بھی واوین کا التزام نہیں کیا۔ (دیکھیے نسخۂ حامد، ص ۱۴۴، نسخۂ عرشی صفحہ ۲۹۷)۔ ایک مثال اور۔ ص ۲۰ پر مصرع ہے : کہتے ہیں "اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا" یہاں بھی واوین غیر ضروری ہیں۔

تنقیدِ جامد سے متن و معنی کی سطح پر کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی مثال میں صرف تین مقامات ہی کفایت کریں گے : نسخۂ خواجہ کے ص ۸۰ پر غالب کی ایک غزل کے تیرہ شعروں کی باز نوشت کی گئی ہے جبکہ عکسی متن میں شعروں کی تعداد چودہ ہے ۔

جو شعر دَرج ہونے سے رہ گیا، وہ ہے : "ہو کر شہید عشق میں . . . . الخ"۔ یہ شعر چھوٹ اِس لیے گیا کہ عرشی کے نسخے میں ص ۳۰۲ پر جہاں یہ غزل دَرج ہے وہاں بھی اشعار کی تعداد تیرہ ہے اور نشان زد شعر اس میں شامل نہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ "ہو کر شہید عشق میں . . . . الخ" والا شعر نسخۂ عرشی کے پہلے حصّے "گنجینۂ معنی" میں بصورتِ فرد دَرج ہوا ہے (دیکھیے نسخۂ عرشی ص ۱۲۴) کیونکہ توقیتی ترتیب میں یہ "گنجینۂ معنی" ہی میں شامل ہو سکتا تھا، "نوائے سروش" میں نہیں۔ چونکہ معین صاحب کے چشم و گوش "نوائے سروش" پر لگے تھے اِس لیے وہ گنجینۂ معنی کے فرد سے بے نیاز رہے۔ دُوسری مثال غالب کے قصیدۂ راتیہ کے ایک شعر کی ہے جو نسخۂ عرشی (ص ۱۴۸) میں بصورتِ ذیل دَرج ہے :

لعل سی، کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا، منقار!

معین صاحب نے بھی اِس شعر کو من و عن اِسی طرح دَرج کر دیا ہے یعنی "لعل سے کی ہے" کے بجائے "لعل سی، کی ہے . . . . . الخ" لکھا ہے۔ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ حمیدیہ (اوّل) دونوں میں "لعل سے کی ہے . . . . الخ" دَرج ہے۔ نسخۂ حمیدیہ دوم (مُرتّبہ: پروفیسر حمید احمد خاں) میں بھی "لعل سے کی ہے . . . الخ" مندرج ہے۔ نسخۂ حامد علی خاں میں بھی "لعل سے کی ہے"۔ . . . ضبط ہوا ہے۔ میری رائے میں بھی "لعل سے کی ہے . . . . الخ" ہی کا محل تھا۔ شعر کا مفہوم واضح ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ مدحتِ شاہ (یعنی مدحِ حضرتِ علیؓ) کے لیے کُہسار کے سبزے نے کہ اپنے سبز رنگ کے باعث اسے طوطی فرض کیا جا سکتا ہے اپنی چونچ لعل سے تراشی ہے۔ لعل سے مُراد سُرخ رنگ کے پھُول ہیں۔ اگر ہم "لعل سی منقار پیدا کی ہے" کہیں تو یہ ایک پامال اور بے معنی بات ہو گی اِس لیے کہ لعل سی منقار تو عام طور پر سب طوطیوں کی ہوتی ہے۔ طوطیِ سبزۂ کہسار کی کیا تخصیص رہی ؟ "پیدا" کا لفظ یہاں گواہی دے رہا ہے کہ طوطیِ سبزۂ کہسار کو یہ سُرخ چونچ ایسے ہی میسّر نہیں آ گئی۔ اس کے لیے اُسے

کوہسار کا سینہ شق کرنا پڑا ہوگا۔ تب چھپے لعل سے اپنی منقار پیہ اکی۔

تیسری مثال ص ۱۰۱ پر درج اس مصرع کی ہے: اِک خونچکاں کفن میں کرڈوڑوں بناؤ ہیں۔ یہاں "کرڈوڑوں" سماعت پر سنگ باری کرتا ہے۔ مگر ہونے دیں کیونکہ عرشی نے بھی "کرڑوڑوں" لکھا ہے۔ (ص ۳۲۴) سوال یہ ہے کہ کیا "کرڈوڑوں" بھی غالب کے منشائے املاء کے مطابق ہے؟ اگر ہے بھی تو اس کا ترک لازم تھا کہ یہ کرخت بھی ہے اور غلط العوام بھی۔

نسخۂ خواجہ کے متن کو عام طور پر مرتّب نے ضبط کیا ہے مگر قریباً ہر جگہ معیار نسخۂ عرشی ہی کو بنایا ہے۔ عرشی صاحب کی ترتیبِ متن کی داد کون نہ دے گا مگر ہر جگہ اسی کا تتبع، جیسا کہ پیچھے کہہ آیا ہوں، مناسب نہیں۔ چنانچہ نسخۂ خواجہ میں چند مقامات ایسے بھی نظر آئے جہاں اضافت کا اِلتزام زیادہ فصیح تھا مگر چونکہ عرشی نے ایسا نہیں کیا سو معین صاحب نے بھی نہیں کیا مثلاً معین صاحب نے ایک مصرع یوں ضبط کیا ہے: بعدِ یک عمر وَرع، بار تو دیتا، بازے، (ص ۱۷)۔ میرے خیال میں یہاں "بَعدِ یک عمرِ وَرَع" کا محل تھا۔ عرشی کے یہاں بھی "عمر" بغیر اضافت ہے۔ (ص ۱۸۵)۔ پھر نسخۂ خواجہ کے متن میں کہیں کہیں اِستفہامیہ (؟) کا اِستعمال ضروری تھا مگر ایسا نہیں ہو سکا، مثلاً ذیل کا مصرع دیکھیے:

تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں

(اوّل تو یہاں "ہو" کے بعد واوِ معلوب کا کوئی جواز نہ تھا، مزید ستم یہ کہ "دوں" کے بعد استفہامیہ (؟) نہیں لگایا گیا)

یا مثلاً ذیل کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں اور اگلے شعر کے پہلے مصرعے کے آخر میں سوالیہ نشان کا ہونا ضروری تھا:

(۱) ؎ قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب ہے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"

(۲) ہے ہے ، خُدا نخواستہ وہ اور دشمنی!
اے شوقِ منفعل ، یہ تجھے کیا خیال ہے

تدوینِ متن کا یہ مسلّمہ اصُول ہے کہ اگر اصل متن میں کوئی لفظ رہ جائے تو اُس متن کی باز نوشت کرتے وقت رہ جانے والا لفظ قُلّابین [ ] میں لکھا جائے۔ نُسخۂ خواجہ میں مرتّب نے اس کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ مثالیں حاضر ہیں۔ قُلّابین لگا کر چھُوٹ جانے والے لفظوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے :

؎ نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجُود
ہنوز تیرے تصوّر میں [ہے] نشیب و فراز (ص ۳۴)

؎ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو [جز] مرگ، علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک (ص ۳۸)

؎ ہستی [کا] اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ، جگر کا نشان ہے (ص ۶۳)

؎ رحم کر ظالم [کہ] کیا بُودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کشتہ ہے (ص ۶۶)

؎ سبزہ نہ چمن [و] یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اَوجِ حصار (ص ۱۰۶)

؎ نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط [میری] چھاتی پر کھُلا (ص ۱۱۵)

؎ شاہ [کے] آگے دھرا ہے آئنہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھُلا (ص ۱۱۶)

نُسخۂ خواجہ کے بہرۂ رُباعیات میں غالب کی وہ مشہور رُباعی بھی شامل ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے : دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ، اس رُباعی کے دُوسرے مصرعے میں غالب سے ایک عروضی تسامح ہُوا ہے یعنی اس میں ایک

سبب خفیف زائد ہے :

دِل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ ۔ مرتب نے اِس مصرعے کو اختلافی قرار دیا ہے حالانکہ یہ مصرع بداہتہً رُباعی کے مُسلّمہ اوزان سے خارج ہے (ر.ک "رموزِ غالب" (گیان چند)، ص ۲۶۴-۲۶۵)

تدوینِ نسخۂ خواجہ کے باب میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس سے فہرستِ اشعار غیر حاضر ہے جس کے باعث قاری سخت اُلجھن کا شکار رہتا ہے۔

تدوینِ متن پر گفتگو ہو چکی۔ آئیے اب نسخۂ خواجہ کے دیباچے کی طرف ایک بار پھر لوٹتے ہیں۔ معین صاحب کو "پُرانی کتابوں کے ایک کاروباری" سے جو دو قلمی نسخے مِلے ان میں ایک فارسی مخطوطہ "معارج النبوۃ" ہے جس کا سنہ اُنھوں نے ۱۴۸۶ء درج کیا ہے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ قلمی نسخوں پر شمسی نہیں قمری سال درج ہوتا تھا۔ چنانچہ یہاں بھی ۱۴۸۶ء کے بجائے ۸۹۱ھ درج ہونا چاہیے تھا ـــــــ یا پھر دونوں سنین کا اندراج کیا جانا چاہیے تھا۔ حیرت یہ ہے کہ مرتب نے "معارج النبوۃ" کے مصنف کا نام مُلّا معین الدین واعظ الکاشفی[۱] لکھا ہے جبکہ مصنف کا نام مُلّا معین الدین فراہی ہے۔ پھر مُلّا معین الدین کی وفات کا سنہ ۱۵۰۱ء درج کر دیا ہے حالانکہ اس کا سالِ وفات متعین نہیں۔ اس کی وفات ۹۰۷ تا ۹۱۰/۱۵۰۱ء سے ۱۵۰۴ء کے دوران کسی وقت ہوئی۔[۲]

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (جو اصلاً نسخۂ لاہور ہی ہے) میں اشعار کی کل تعداد کے ضمن میں فرماتے ہیں :

"اصلاً متن کے اشعار کی قطعی تعداد ۱۵۴۸ بنتی ہے۔ قطعات کے

---

[۱] جناب شمس الرحمٰن فاروقی ان سے بھی چار ہاتھ آگے نکل گئے اور اِس کتاب کا پورا پُورا اِنتساب مُلّا حسین واعظ کاشفی سے کر دیا۔ دیکھیے :
"قومی زبان" (کراچی) کا شمارہ فروری ۲۰۰۰ء (ص ۱۷)

[۲] میں ان قیمتی معلومات کے لیے جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کا ممنون ہوں۔

منظوم فارسی عنوانات کو شامل کر لیا جائے تو اشعار کی مجموعی تعداد
۱۵۵۰ سے کچھ اُوپر بن جاتی ہے۔"

معین صاحب کی یہ بے خبری نہایت قابلِ افسوس ہے۔ اِس بے خبری کا نتیجہ ہے کہ وہ نثر کی مُقفّیٰ[۱] عبارات کو منظوم عبارات سمجھ بیٹھے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ کسی شعری مخطوطے کی تدوین کرنے وہ شخص جا رہا ہے جو نثر اور شعر میں اِمتیاز کرنے سے قاصر ہے۔ مرتّب نے جن عنوانات کو منظوم قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) قطعہ در نمایشِ عنوانِ دلآویزی گفتار
وآسان کردنِ اندوہِ پشیمانی بر دلِ دلدار

(۲) چمن سرمایہ کردنِ گفتار بستایشِ کلکتہ
اگر فردوس نتواں گفت ارم است البتہ

(۳) با دوست از سپاسِ عطائے ہدیۂ سخن راندن
و متاعِ گزیدۂ سخن در برابرِ آں افشاندن

کاتب نے اِن فارسی عبارتوں کو مصرعوں کی شکل میں مندرجہ بالا صورت میں اُوپر نیچے لکھا اور یوں تدوین کار کے لیے بھٹکنے اور قارئین کے لیے تفنّنِ طبع کا سامان پیدا کر دیا۔

دیوانِ غالب کے نسخۂ خواجہ میں مرتّب کے ناموزوں طبع ہونے کے متعدد شواہد ملتے ہیں[۱]۔

۱؎ اور یہ معاملہ محض اس ایک تدوینی کام تک محدود نہیں۔ عرصہ ہوا انھوں نے "غالب اور انقلابِ ستاون" کے زیرِ عنوان "دستنبو" کو مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ میرے پیشِ نظر اس کا ۱۹۸۸ء کا ہندوستانی ایڈیشن ہے۔ اس کے "حرفے چند" میں مرتب نے رشید حسن خاں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی دانست میں ایک مصرع لکھا ہے جو یہ ہے: "کیوں کر شکر ادا کیجیے اس لطفِ خاص کا۔" واضح رہے کہ "یہ مصرع" انھی غالب کا ہے جن سے معین صاحب کا تعلق خاطر ایک تہائی صدی پر پھیلا ہے۔ (جاری ہے)

ذیل میں نسخۂ خواجہ سے دہ مصرعے (یا ان کے ٹکڑے) نقل کیے جاتے ہیں جو ان کے ناموزوں طبع ہونے کی مزید شہادت دیتے ہیں۔ اِن ناموزوں مصرعوں کو "سہوِ کاتب" قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ناموزوں / غلط / ناقص	موزوں / صحیح
تب کوئی ایسا صاحب، صاحب نظر ملے ہے (میرا) ص ۱۰	تب کوئی ایسا صاحب، صاحب نظر ملے ہے
نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے رہی نہ طرزِ ستم اور کوئی جاں کے لیے[1] ص ۳۴	نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے، ص ۲۵	اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

(گزشتہ سے پیوستہ) اور جن پر پاکستان میں پی ایچ۔ڈی کی پہلی "سندِ فضیلت" حاصل کرنے کا "اعزاز" انھیں حاصل ہوا (نسخۂ خواجہ، ص ۳) شعر یوں ہے:

کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لُطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

اسی طرح انھوں نے ایک مصرع یوں تحریر فرمایا ہے: یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کتاب میں (دیکھیے "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین"، ص ۳۲۱، جبکہ صحیح مصرع یوں ہے: یہ بات بھی ہے لکھنے کے قابل کتاب میں۔

[1] مرتب نے یہ نہ سوچا کہ "جاں" کا قافیہ "جاں" نہیں ہو سکتا۔ یہ شعر انھوں نے "اطرافِ غالب" (سیّد عبداللہ) سے نقل کیا ہے۔ "ماہِ نو" میں جہاں یہ شعر، سیّد صاحب کے مضمون میں اوّلاً نقل ہوا تھا، صحیح تھا، دیکھیے "ماہِ نو" جولائی ۱۹۵۴ء ص ۱۸

ناموزوں / غلط / ناقص	موزوں / صحیح
بزمِ شہنشاہ ۔ ۔ ۔ ۔ دفتر کھلا میں اور بزم سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ } ص ۳۸	بزمِ شاہنشاہ ۔ ۔ ۔ ۔ دفتر کھلا ہیں اور بزمِ مے سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
کہتے ہو تم ۔ ۔ ۔ ۔ آتے، ص ۳۹	کہتے تو ہم تم ۔ ۔ ۔ ۔ آتے
اے شہنشاہِ فلک منظر بے مثل و نظیر ص ۴۰	اے شہنشاہِ فلک منظر و بے مثل و نظیر
پلے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا' ص ۳۰۰	پئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
لب خشک در تشنگی مُردگاں کا، ص ۳۰۱ ہے آرامیدگی میں نکوہش بجا، مجھے ص ۳۰۲	لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارۂ جنبانی ص ۳۰۳	لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرۂ خوں وہ بھی ص ۳۰۵	بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
محرم نہیں تو ہی نواہائے راز کا، ص ۳۰۶ کہتے ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آتے ص ۳۰۹	محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آتے
ہاں مہِ نو ہم سنیں اس کا نام، ص ۳۱۰ بچوں کا بھی نہ دیکھا تماشا کوئی دن اور ص ۳۱۶	ہاں مہِ نو، سُنیں ہم اس کا نام بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
کہتے ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آتے ص ۳۲۵	کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آتے

خضرِ سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز	خضرِ سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
ص ۳۲۵	
سہرا لکھا گیا زِ رہِ امتثالِ امر۔	سہرا لکھا گیا زِ رہِ امتثالِ امر
ص ۳۲۶	

نسخۂ خواجہ کے مقدمے میں مرتب نے دیگر لکھنے والوں کی متعدد تحریروں سے اقتباس کیا ہے مگر کئی جگہ عبارتیں نقل کرتے وقت بعض لفظ ان سے چھوٹ گئے اور بعض مقامات پر لفظ یا اعداد صحیح طور پر نقل نہیں ہو سکے حالانکہ صحتِ متن کا تقاضا تھا کہ ان الفاظ و عبارات کو صحیح طور پر نقل کیا جاتا۔ ذیل میں ایسے چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے:

(۱) "بہ ثنا تے ابوالایہ ...." (ص ۱۶)
صحیح: "بہ ثنا تے ابوالایمّہ ...."

(۲) "ھمگی اشعارِ شعری شعار ...." (ص ۱۸)
صحیح: "ھمگی اشعارِ شِعرٰیؔ شِعار ...."

(۳) "اِس نسخے کے وَرَق ۲ ب کی چوتھی سطر ...." (ص ۲۵)
صحیح: "اِس نسخے کے مشتملات کی ترتیب سابق نسخوں جیسی ہے چنانچہ وَرَق ۲ ب کی چوتھی سطر ...."

(۴) "اِس تقریظ میں دیوانِ غالب (طبعِ اوّل) ...." (ص ۲۶)
صحیح: "اِس تقریظ میں نسخۂ م (طبعِ اوّل) ...."

(۵) ر ۹۶ .... (ص ۲۶)

لہ دو ستاروں کا نام ہے جنھیں "شعرٰی العمیصا" اور "شعرٰی العبور" بھی کہتے ہیں، "شِعرائے شامی" اور "شِعرائے یمانی" بھی اور فارسی میں "دو خواہر" یا "دو خواہران" بھی کہتے ہیں۔ عمید، جلد دوم۔ مراد روشن ترین ستارے سے ہے۔

صحیح : ر ۶۹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۶) مارچ ۱۸۳۸ء تا مارچ ۱۸۳۸ء ۔ ۔ ۔ (ص ۲۶)

صحیح : مارچ ۱۸۳۸ء تا مارچ ۱۸۳۹ء

(۷) "دمیدن سپیدہ سحری از تیرۂ شب سواد اوراق بفروغ گستری عبارت تقریظ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۳۰)

صحیح : "دمیدنِ سپیدۂ سحری از تیرہ شبِ سوادِ اوراق بفرِّ فروغ گستری عبارتِ تقریظ ۔ ۔ ۔ ۔"

(۸) "ہر نئی غزل سے پہلے بیل بوٹے شگرفی خاتمے پر بھی مربع بیل بوٹے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۳۲)

صحیح : "ہر نئی غزل سے پہلے بیل بوٹے شگرفی ۔ خاتمے پر بھی مرصّع بیل بوٹے ۔ ۔ ۔ ۔"

(۹) "۔ ۔ ۔ کہ لختے از مجمر گردانی ۔ ۔ ۔ ۔" ص ۳۲

صحیح : ۔ ۔ ۔ ۔ کہ لختے از مجمرہ گردانی ۔ ۔ ۔ ۔

(۱۰) "بفروغ گستری عبارت تقریظ کہ پیدائی آن ۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۳۲)

صحیح : بفرِّ فروغ گستریِ عبارتِ تقریظ کہ پیدائیِ آن

(۱۱) "عالی دودماں والا گوہر ۔ ۔ ۔ (ص ۳۲)

صحیح : عالی دودمانِ والا گہر ۔ ۔ ۔

(۱۲) "۔ ۔ ۔ ہمگی اشعارِ شعری شعار" (ص ۳۲ - ۳۶)

صحیح : ۔ ۔ ۔ ہمگی اشعارِ شعریِ شِعار

(۱۳) "۔ ۔ ۔ ۔ ہمگی اشعارِ شعری شعار" (ص ۳۲)

صحیح : "۔ ۔ ۔ ہمگی اشعارِ شعریٰ شِعار

(۱۴) نسخۂ عرشی زادہ ۱۳۲۱ھ/۱۸۱۶ء

صحیح : نسخۂ عرشی زادہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء

(۱۵) دِل مرا سوزِ نہاں سے بے مہابا جل گیا، (ص ۳۰۴)

صحیح: دِل مِرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

(۱۵) "اِس مقدّمے میں بادشاہ نے اپنے بیانِ صفائی میں . . . ." (ص ۳۲۹)

صحیح: اِس مقدمے میں بادشاہ کے اپنے بیانِ صفائی میں . . .

فارسی زبان سے ناواقفیت کے سبب مرتّب نے غالبؔ کے مختصر فارسی دیباچے اور نیترِ رخشاں کی تقریظ کی باز نوشت میں بھی کئی مقامات پر ٹھوکریں کھائی ہیں انھوں نے فارسی عبارتوں میں بعض ایسی جگہوں پر اضافتوں کا اہتمام کیا ہے جہاں وہ قطعی بے محل تھیں اور جن کے نتیجے میں مفہوم خبط ہو گیا ہے اور بعض جگہ جہاں اضافت کا اہتمام ضروری تھا وہاں بعض الفاظ و تراکیب کو اس سے محروم رکھا ہے کئی مقامات پر واوِ معلوب کی ضرورت تھی مگر وہاں واوِ معلوب بار نہیں پا سکی اور بعض جگہ جہاں ضرورت نہ تھی وہاں اس کا التزام کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ ساتھ ہی صحیح متن بھی درج کر دیا گیا ہے :

(۱) از سنگِ بر دل تافتہ . . . . . واز نفس و مہ بر آن نہادہ . . . . اُمید کہ سخن سرایانِ سخنورستایِ پراگندہ ابیاتے را . . . . . بہ اسد اللہ خان، موسوم . . . . فر دجامِ کار بخفی مدفن نیز باد[۱]" ص ۴۶، ۴۷

صحیح متن: "از سنگ بر دل تافتہ . . . واز نفس و مہر بر آن نہادہ . . . اُمید کہ سخن سرایانِ سخنورستای، پراگندہ ابیاتے را . . . . بہ اسد اللہ خان موسوم . . . . . فرجامِ کار بخفی مدفن نیز باد"

(۲) "عبارت تقریظ کہ پیدائی آن . . . . نواب محمّد ضیاء الدین احمد خاں بہادر . . . . . ودامن بکمر زدہ . . . . . فراخِ سماطی نہادہ است و گرسنہ چشمانِ سخن . . . ." ص ۲۸۷

---

[۱] یہاں عبارت کے صرف وُہی حِصّے درج کیے گئے ہیں جہاں اغلاط تھیں۔ پوری عبارت طوالت کا باعث ہوتی اِس لیے اس سے اجتناب کیا گیا ہے۔

صحیح عبارت : عبارتِ تقریظ کہ پیدائیِ آن . . . . نواب محمد ضیاء الدین خان
بہادر . . . . و دامن بکمر بر زدہ . . . . فراخ سماطی نہادہ است دگرسنہ
چشمانِ سخن . . . .''

(۳) ''پردہ گیانند حجلہ نشینِ سُرادقِ مریم کرداری ۔ شوخ چشمانند پردہ در ترازِ
شاہدانِ بازاری . . . . . آزادگانند پادرگل . . . . . دہلی نژادانندِ
صفاہان پرورد — ہانَ دہانَ . . . . معیارِ نقدِ گراں مایگی . . . فرمان
فرمائی کیہان سخنوری ۔'' ص ۲۸۹

صحیح متن : پردگیانند حجلہ نشینِ سُرادقِ مریم کرداری ۔ شوخ چشمانند پردہ
دَرتر از شاہدانِ بازاری . . . آزادگانند پادرگل . . . . . دہلی نژادانند
صفاہان پرورد — ہان دہان . . . . معیارِ نقدِ گراں مایگی . . . . .
فرمان فرمائی کیہانِ سخنوری ۔''

(۴) نکوہش نکوہِ ستایشِ ستای ۔ ص ۲۹۱
صحیح متن : نکوہش نکوہِ ستایش ستای

(۵) ''سمی وَصَیِ واپسین وَخشور'' ص ۲۹۳
صحیح متن : سَمِیِّ وَصِیِّ واپسین وَخشور

(۶) اَللّٰھُمَّ کَمِّلِ الْکَلَامَ بِدَیْمُوْمَتِہٖ بَقَایِھِہٖ
وَحَصِّلِ الْمَرَامَ بِحَیْنُوْنَۃِ لِقَائِھِہٖ [ل] ص ۲۹۳

صحیح متن : اَللّٰھُمَّ کَمِّلِ الْکَلَامَ بِدَیْمُوْمَۃِ بَقَائِہٖ
وَحَصِّلِ الْمَرَامَ بِحَیْنُوْنَۃِ لِقَائِہٖ

(۷) ''. . . . کہ یک ازان سمیں ساعدِ شخصِ خرد . . . . . وقلاوزیِ بخت
بیدار . . . داندہ تردد گرد آوری . . . .'' ص ۲۹۳

[ل] مرتب نے اس عبارت کو شعر کے طور پر اوپر نیچے مصرعوں کی شکل میں درج کیا ہے
بقا اور لقا اور دیگر اندرونی قوافی نے انھیں دھوکے میں رکھا۔

صحیح متن : " کہ بر یک ازان سیمین ساعدِ شخصِ خو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و قلاوُزیِ بختِ بیدار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وانددہِ تَرَدُّدِ گرد آوری ۔ ۔ ۔ ۔

(۸) ۔ ۔ ۔ ۔ تِذکارے باد

صحیح : ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تذکارے[1] باد۔

مرتب نے جس طرح غالب کے شعری متن کی باز نوشت میں املا کی دو عملی کو راہ دی ہے، اِسی طرح کا تضاد فارسی نثر کی باز نوشت میں بھی نظر آتا ہے۔ کہیں تو جدید ایرانی طرزِ املاء کی پیروی کرتے ہوئے مجہول کے بجائے صرف یائے معروف کو برتا ہے۔ اور کہیں اس کے برعکس یائے مجہول کو۔ اِسی طرح کہیں نون (کامل) کا اِلتزام کیا ہے اور کہیں نونِ غُنّہ کا۔ اِس تضاد سے قاری سخت اُلجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ غالب کے فارسی دیباچے اور تقریظ نیرؔ کی باز نوشت سے صِرف تین مثالیں :

(۱) ۔ ۔ ۔ ۔ " لختے از سامان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دامنے از کوہِ ہندی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ چوبہای سنگ توپ خوردہ " ص ۴۳ ، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب " لختے " اور " دامنے " لکھا ہے تو پھر " چوبہای " کے بجائے بھی " چوبہائے "۔ ۔ ۔ ۔ لکھا جاتا۔

(۲) " در ہوای آن رخشندہ آذر "۔ آذر کو غالب کے منشاء کے خلاف " د " کے بجائے ذال سے لکھا جس کا وجود ہی بقولِ غالب فارسی میں نہیں ہے[2]۔

---

[1] ذَکَرَ ذِکراً وَتَذکاراً، لہٰذا " تذکار " بہ فتحِ اوّل ہے۔ غیاث میں لکھا ہے :
" بالکسر خطاست چراکہ سوائے تِبیان و تِلقای؛ ہیچ مصدرے بر وزن تفعال بالکسر نیامدہ ۔ "

[2] ویسے غالب کا فارسی میں وجُودِ ذال سے انکار درست نہیں۔ اِس ضمن میں قاضی عبدالودُود، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مضامین پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔ میرا موقف یہاں صرف اِس قدر ہے کہ یا تو غالب کے منشائے اِملاء کو کاملاً نظر انداز کر دیا جاتا یا پھر اسی کی پیروی کی جاتی۔ (جاری ہے)

(۳) "یوسفستانی است . . . . خورنق رونق شارسانی است . . . حرز بازوے فرزانہ . . . . . سومناتی است . . . . . ارژنگی است بنمایشِ نقشہای بدیع . . . . در آن اندیشیدے . . . . . اندران سنجیدے . . . . . بارے کارسازِ ایزدِ بزرگ . . . . الایا توانا ہوشانِ ہوشے دشلنواگوشان، گوشے آرے راست می فرماید . . . . . از من یادگارے و برای دیگران تذکارے باد" ص ۲۸۷ تا ۲۹۵

مرتب موصوف کو بچاہیے تھا کہ جب یوسفستانی، شارسانی، سومناتی، ارژنگی، نقشہای بدیع لکھا تھا تو پھر اسی ایرانی اسلوبِ املا کی کلیتہً پیروی کی جاتی تاکہ یکسانیت کا حسن برقرار رہتا مگر افسوس ایسا نہیں ہوا اور "اندیشیدے"، "سنجیدے" بازوے، بارے، ہوشے، گوشے، آرے، یادگارے اور تذکارے کی یا ہائے مجہول سے معروف پر ایسی یلغار کی کہ رہے نام اللہ کا۔ اسی تقریظِ نثر میں کچھ شعر بھی آتے ہیں ذرا ان کا متضاد و نمونۂ املا بھی دیکھتے چلیے۔ کہیں نونِ منقوطہ ہے، کہیں نونِ غنہ، کہیں یائے مجہول ہے، کہیں یائے معروف، مجہول و معروف اور منقوط و غیر منقوط کی ایسی افراط و تفریط ہے کہ : خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے ؟ جواب : نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر ! :

مہین فرزندِ نُہ آبای علوی ۔ بہین شاگردِ عقلِ کلِ عالی !!
جہاں را ابلے دریغ آموزگار است ۔ گزین معنی شناسِ روزگار است
بہ جولانگاہِ معنی یکّہ تازے فلاطونِ فطرتے حکمت طرازے (ص ۲۹۱)

حیرت اِس بات کی ہے کہ نسخۂ خواجہ کے مرتب کی کاوش سے ایک سو چھتیس برس قبل مطبعِ نظامی کے شائع کردہ دیوانِ غالب (۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء) میں غالب کا فارسی

(گزشتہ سے پیوستہ) پینسے دروں نیمے بروں والا انداز بہر حال مرتب کے انتشارِ ذہنی کو ظاہر کرتا ہے۔

دیباچہ کامل صحت کے ساتھ شائع ہو چکا تھا نیز معین سے مدتوں پہلے عرشی اپنے نسخے میں فارسی دیباچہ و تقریظ بہت حد تک اطمینان بخش طریقے سے شایع کر چکے تھے مگر افسوس کہ نسخۂ خواجہ مرتب کرتے وقت وہ ان کاوشوں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے، خود وہ فارسی جانتے نہیں کہ ان مشکل عبارات کو صحت کے ساتھ ضبط کر سکتے۔

اب آخر میں چند باتیں غالب کے فارسی دیباچے اور نیر کی فارسی تقریظ کے اُردو ترجمے کے ذیل میں۔ چونکہ مرتب فارسی نہیں جانتے اس لیے یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ یہ تراجم ان کے اپنے قلم سے نہیں۔ آیئے ذرا ان کے "استدراک" کا ایک اقتباس دیکھتے چلیں جس میں انھوں نے مذکورہ فارسی عبارتوں کے "تراجم کی تشکیل" کا ذکر فرمایا ہے :

> "دیباچے اور 'خاتمے' کے اُردو تراجم، ڈاکٹر نقوی کو بطورِ خاص پسند آتے۔ یہ امر میرے لیے راحت اور مسرت کا باعث ہوا اور اس سے طویل غور و فکر اور مشقت و تردد کی وہ کسل جاتی رہی جو ان تراجم کی تشکیل میں مجھے اٹھانا پڑی۔"

"دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ ۔ تجزیہ و تحسین"

ص ۴۱

"تراجم کی تشکیل" کا ٹکڑا بڑا معنی خیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا معین صاحب کے پیش کردہ اُردو تراجم سے پہلے غالب کے فارسی دیباچے کے تراجم اور نیر کی فارسی تقریظ کا ترجمہ اُردو میں ہو چکے تھے؟ جی ہاں، متعدد بہ تفصیلِ ذیل:

(۱) غالب کے فارسی دیباچے کا ایک (شاید پہلا) اُردو ترجمہ ۱۹۴۳ء میں پروفیسر جیلانی کامران نے، جو ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں طالب علم تھے، اعظم علوی نامی ایک فارسی داں سے کروایا جو لاہور کے کسی دفتر میں ملازم تھے۔ یہ ترجمہ اسلامیہ کالج کی ٹرانسلیشن سوسائٹی میں پڑھا گیا[۱] اور رفیق خاور

---

[۱] یہ معلومات راقم الحروف کو خود پروفیسر جیلانی کامران نے مہیا کیں۔

نے اسے پسند کیا۔ بعد ازاں یہ "کریسنٹ" کے سالنامے میں شایع ہوا۔
ر۔ک "کریسنٹ"، سالنامہ ۱۹۴۶ء، جلد ۷، ۳، نمبر ۲۔

(۲) دوسرا اُردو ترجمہ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے کیا تھا جو پروفیسر جیلانی کامران کی کتاب "غالب کی تہذیبی شخصیت" (۱۹۷۲ء) کے حواشی میں شایع کیا گیا تھا۔

(۳) تیسرا اُردو ترجمہ پروفیسر جابر علی سید نے کیا، جو ان کی کتاب تنقید اور لبرل ازم" (۱۹۸۲ء) میں شایع ہوا۔

(۴) چوتھا ترجمہ پروفیسر سیف اللہ خالد کی تالیف "دیباچے سے فلیپ تک" میں شایع ہوا۔ یہ ترجمہ احمد سعید انصاری نے کیا۔ (پروفیسر سیف اللہ خالد کی تالیف، خود ان کے بقول، نسخۂ خواجہ سے ذرا پہلے شایع ہوئی۔) آپ چاہیں تو اسے نسخۂ خواجہ میں شامل ترجمے کا معاصر کہہ لیجیے[۱]

جہاں تک نیرِ رخشاں کی تقریظ کا تعلق ہے، اس کا بھی کم از کم ایک خاصا عمدہ، رواں اور بامحاورہ ترجمہ، ۱۹۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی شایع کردہ کتاب "تنقیدِ غالب کے سو سال" میں شایع ہو چکا تھا۔ مذکورہ مجموعے میں شامل اس اُردو ترجمے کے اوپر سر سید احمد خان کا نام درج ہے اور حاشیے میں "آثار الصنادید، ۱۸۴۷ء (اُردو ترجمہ) کی عبارت درج ہے۔ اِس سے شبہ ہوتا ہے کہ نیرِ رخشاں کی اِس تقریظ کا سر سید نے اُردو ترجمہ کیا ہو گا جو آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) میں شایع ہوا۔ یہ بات درست نہیں۔ میرے خیال میں اس تقریظ کے اُردو ترجمے کا سر سید سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ اُردو ترجمہ

---

[۱] ایک مفصل و مشرح ترجمہ ہندوستان کے ممتاز فاضل ڈاکٹر نذیر احمد نے کیا جو جنوری ۱۹۹۱ء کے "غالب نامہ" (نئی دہلی) میں شایع ہوا ہے۔ صرف یہ ایک ترجمہ ہے جو نسخۂ خواجہ میں شامل ترجمے سے مؤخر کہا جا سکتا ہے۔

بالکل جدید اُردو زبان میں ہے اور اس کا سر سید کی زبان سے کوئی اسلوبیاتی میل نہیں۔ مجھے گمان ہے کہ یہ اُردو ترجمہ فارسی زبان کے ممتاز عالم وزیر الحسن عابدی نے کیا ہوگا۔

خیر کہنا یہ ہے کہ غالب کے مختصر دیباچے کے کم از کم تین اُردو ترجمے معین صاحب کے پیشِ نظر تھے اور نیرؔ کی تقریظ کا مذکورہ بالا ترجمہ بھی ان کے پیشِ نظر رہا ہوگا۔ ان تراجم ہی کو سامنے رکھ کر انھیں بقولِ خود "تراجم کی تشکیل" کا تردد کرنا پڑا۔ جب عضو بندی کا یہ کام مکمل ہوگیا تو اس قالب میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نجم الاسلام اور مظہر محمود شیرانی نے کسی قدر رُوح پھونکی تب جا کر ان دونوں ترجموں میں زندگی کی رمق پیدا ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ ان اساتذہ کی نگار بندی کے باوجود کہیں کہیں "دُزدِ حنا" کی میلی آنکھ اپنے بے میل وجود کے ساتھ قاری کی پریشانیِ خاطر کا موجب بھی بنتی ہے مگر بحیثیتِ مجموعی دیباچۂ غالب کا معین صاحب کا پیش کردہ ترجمہ سابقہ تراجم کے مقابلے میں رَواں اور کسی قدر زیادہ کامیاب ہے۔ برنارڈ شو کا مشہور قول یاد آتا ہے: میں شیکسپیئر سے بڑا ہوں کیونکہ میں اس کے کندھوں پر کھڑا ہوں!!

میری اِن معروضات سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نسخۂ خواجہ میں موجود ان دو نثر پاروں کے اُردو ترجمے کے بالمقابل سابقہ ترجمے بے کار محض ہیں، ہرگز نہیں۔ یہ تینوں تراجم اپنی اپنی خوبیاں رکھتے ہیں مثلاً اعظم علوی کے ترجمے کا ابتدائی حصہ بہت عمدہ اور اصل متن سے بہت قریب ہے مگر درمیان و آخر میں کہیں کہیں ناقص اور کہیں کہیں غلط ہے۔ اِسی طرح پروفیسر جیلانی کامران کی کتاب "غالب کی تہذیبی شخصیت" میں شامل ڈاکٹر ظہور الدین احمد کا اُردو ترجمہ بڑی حد تک صاف اور درست ترجمہ ہے۔ صرف تین چار مقامات ایسے ہیں جہاں وہ غالب کے مفہوم کو صحیح طور پر نہیں پا سکے مگر مجموعی حیثیت سے اسے خاصے کامیاب ترجمے کی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ معین صاحب نے اپنے نسخۂ خواجہ کے لیے

اِس مختصر دیباچے کا جو ترجمہ "تشکیل" دیا اس کی بنیاد زیادہ تر اسی ترجمہ پر رکھی ہے بلکہ کہیں کہیں تو معین صاحب کا ترجمہ ظہور صاحب کے ترجمے کا محض چربہ ہے۔ اِس ضمن میں بعض مماثل جملوں کا تقابل دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ترجمہ از ڈاکٹر ظہور الدین احمد	"تشکیلِ ترجمہ" از معین الرحمٰن
(۱) جلتی ہوتی خوشبو کو روشن رکھنے کا کچھ سامان مہیا ہو گیا ہے۔ ص ۴۷	خُوشبو اَرزانی پر آمادہ اگردان کے لیے کچھ سامان فراہم ہو گیا ہے۔ ص ۳۴۰
(۲) چھُری سے باریک کیا ہے اور ریتی سے ہموار کیا ہے، ص ۴۸	چھُری سے ریزہ ریزہ کیا ہے اور ریتی سے ہموار کیا ہے۔ ص ۳۴۰
(۳) اِس آگ کی پاکیزگی ہر اعتبار سے ثابت اور مسلّم ہے، ص ۴۸	اس (آتشِ پارسی) کی پاکیزگی مسلّم ہے، ص ۳۴۰
(۴) جس نے مٹھی بھر راکھ سے، ص ۴۸	جس نے مٹھی بھر راکھ سے، ص ۳۴۰
(۵) جو ہوشنگ کی روشن آنکھوں کے ساتھ پتھر سے باہر نکلی ہے، ص ۴۸	جو ہوشنگ کی روشنیِ چشم کے ساتھ پتھر سے باہر نکلی، ص ۳۴۱

ڈاکٹر ظہور الدین احمد کے اس ترجمے کی تقلید ہی کا نتیجہ ہے کہ جہاں مترجم نے غلطی کی، وہیں "تشکیل کنندہ" نے بھی ٹھوکر کھائی۔ اِس "وفاداری بشرطِ استواری" کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں: دیباچے میں ایک جگہ غالب اس آگ کا ذِکر کرتے ہیں جو ہند کی بھٹیوں میں جل رہی ہے، اس آگ سے ان کی مُراد وہ معاصر اُردو شاعری ہے جو پامال مضامین اور پیش پا اُفتادہ خیالات میں محصور ہے چنانچہ اِس شاعری کے ذِکر میں لکھتے ہیں: "چہ بردے مسلّم است از ناپاکی بہ استخوانِ مُردہ ناہار شکستن۔" گویا "چہ بَردَے مُسلّم است" کا تعلق معاصر اُردو شاعری سے ہے، آتشِ پارسی

سے نہیں ہے جیسا کہ مترجم ڈاکٹر ظہور الدین احمد اور ان کے متعلقہ کا خیال ہے۔

دیباچے میں آگے چل کر یہ عبارت ملتی ہے :

"پژدہندہ در ہوائے آن رخشندہ آذر نعل در آتش است کہ
بہ چشم روشنی ہوشنگ از سنگ برون تافتہ۔"

مراد یہ ہے کہ جستجو میں مگن آرزو مند شاعر اس روشن آگ کے حصول کے لیے بے چین ہے جو ہوشنگ کو مبارک باد دینے کے لیے پتھر سے باہر نکل آئی تھی۔ فارسی متن میں "چشم روشنی" کی جو ترکیب استعمال ہوتی ہے اس کے معانی کی تفہیم نہ ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں درست ہے، نہ ظہور الدین احمد کے یہاں، نہ اعظم علوی کے یہاں اور نہ احمد سعید انصاری ہی کے یہاں۔ جابر علی سید نے بھی اس کا مفہوم غلط سمجھا اور ترجمہ یوں کیا : "اس کا جویا اس چمکنے والی آگ کے عشق میں بے قرار ہے جو ہوشنگ کی آنکھ کو روشن کرنے کے لیے پتھر سے باہر نکلی تھی" (تنقید اور لبرل ازم ص ۳۶) معین صاحب کے یہاں ترجمے کی صورت یہ ہے :

"یہ وہ آگ ہے جو ہوشنگ کی روشنیِ چشم کے ساتھ پتھر سے باہر نکلی۔" ص ۴۱۴۔

اِس جملے کا ترجمہ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے اِس طرح کیا ہے :

"اِس آگ کی آرزو میں بے قرار ہے جو ہوشنگ کی روشن آنکھوں کے ساتھ پتھر سے باہر نکلی ہے۔" (ص ۴۸)

معین صاحب نے اپنے ترجمے میں محض یہ کیا ہے کہ غالب کی اِستعمال کردہ ترکیب "چشم روشنی" کو مقلوب کر کے "روشنیِ چشم" کر دیا تاکہ یہ ظہور الدین احمد کے ترجمے سے تھوڑا سا مختلف دکھائی دے۔ اصل میں "چشم روشنی" کے معنی "تہنیت" یا "مبارک باد" کے ہیں۔ "بہارِ عجم" میں لکھا ہے :

"چشم روشنی و چشمِ کسی روشن : چون چیزی عجیب و غریب بنظر آید یا نعمتی غیر مترقبہ بہم رسد، چنین گویند و در معنیِ تہنیت و مبارک باد

است ۔"

بہار، صائب کا یہ شعر بطور نظیر لاتا ہے : ؎

گویند چشم روشنی ہم غزال ہا ۔ ہر جا کہ آں نگار بعزم شکار شُد،

بہار، جلد اوّل، ص ۴۱۳

دلچسپ بات یہ ہے کہ "چشم روشنی" کی یہ ترکیب غالب کے یہاں متعدد جگہ آتی ہے ۔ تین مقامات میرے علم میں ہیں : "پنج آہنگ"، "مہر نیمروز" اور "دستنبو" ۔ پہلی کتاب یعنی "پنج آہنگ" کا "آہنگ پنجم" اُردو میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکا ہے ۔ باقی دونو کتابوں کے بھی معیاری ترجمے اُردو میں شایع ہو چکے ہیں ۔ اِن تینوں تراجم میں "چشم روشنی" کا صحیح ترجمہ "مُبارک باد" درج ہے ۔ میرزا حسام الدین حیدر کے نام خط میں ایک جگہ غالب لکھتے ہیں :

(۱) "ایں چہار رُباعی در چشم روشنیِ رُؤیایِ صادقہ فرستادہ آمد"۔ پنج آہنگ، (مرتبہ عابدی) ص ۴۵۰

"مہرِ نیمروز" میں خطابِ زمیں بوس" کے زیرِ عنوان ایک جگہ فرماتے ہیں :

(۲) "بخت از خواب جست، حور چشم روشنی گفت"، مہرِ نیمروز (مرتبہ عبدالشکور احسن)، ص ۱۹

"دستنبو" میں ایک جگہ جدّوجہدِ ستّاون کی مذمّت اور انگریز کی توصیف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اُجڑ جاتیں تو گلستانِ انگلستان سے صادر شدُہ فرمان سے میری آنکھیں اور میرا دِل ایک دُوسرے کو مبارک باد دیتے ۔ اصل متعلقہ عبارت یہ ہے :

(۳) "دل و دیدۂ من چشم روشنی گوی ہمدگر گر دیدہ بودی"۔۔۔ غالب[۱] در انقلابِ ستاون (دہلی)، ص ۱۹۶۔

یہ آخری عبارت اِسی کتاب (دستنبو) سے نقل کی گئی ہے جس کے تہران ایڈیشن ڈاکٹر معین[۱]لرحمٰن مرتب کر کے شایع کر چکے ہیں اور جس کے مصنّف

وہی غالب ہیں جن سے ان کے تعلق خاطر کا عرصہ ایک تہائی صدی پر پھیلا ہے
دلچسپ تر بات یہ ہے کہ اسی کتاب کے ص ۱۲۳ پر چشم روشنی کے معانی صاف
"مبارک باد" لکھے ہوتے ہیں ۔ فارسی متن تو معین صاحب کے دائرۂ تفہیم سے
باہر تھا ۔ کیا وہ اپنے مرتب کردہ ترجمہ شدہ متن سے بھی اس درجہ بے نیاز ہیں؟
ایسا متن جسے وہ تین بار شایع کر چکے ہیں ؟

معین صاحب کے پیش کردہ ترجمۂ دیباچۂ غالب میں چند اور مقامات پر
بھی کوتاہیوں اور نارسائیوں کا احساس ہوتا ہے ۔ ص ۳۴۰ پر یہ عبارت بطور
ترجمہ سامنے آتی ہے :

"یہ خاصہ کسی طرح گدازیِ قلب کا سامان نہیں بن سکتا اور نہ یہ
بزم افروزی کے لیے مناسب (خیال کیا جا سکتا ہے)"

اصل عبارت یہ ہے : "ہر آیینہ بہ دل گداختن نیرزد و بزم افروختن رانشاید"۔
"ہر آیینہ" یہاں "ظاہر ہے" کے معنوں میں آیا ہے ۔ غالب کا اشارہ
چونکہ معاصر اُردو شاعری کی طرف ہے اس لیے صحیح ترجمہ یوں ہوگا : گویا واضح
ہے کہ (یا واضح طور پر) یہ شاعری (اُردو) کسی طرح اس لائق نہیں کہ اس سے
دل پگھلے نہ یہ بزم افروزی کے لیے مناسب خیال کی جا سکتی ہے ۔

دیباچے میں غالب نے "نور پاش آتش" کا ذکر کرتے ہوتے جہاں یہ لکھا
ہے کہ یہ آگ ہوشنگ کو مبارک باد کہنے کے لیے پتھر سے باہر نکل آئی وہیں اس
کی فیض رسانی کا یوں ذکر کیا ہے :

"خس را فروغست و لالہ را رنگ و مُغ را چشم و کدہ را چراغ"

اس کا ترجمہ نسخۂ خواجہ میں یہ ہے :

"حُسن کو فروغ ، لالہ کو رنگ ...... الخ" ص ۳۴۱

یہاں "حُسن" کا لفظ بے محل اور مُہمل ہے ، "خس" ہونا چاہیے ۔"
چند اور مقامات ملاحظہ کریں جہاں ترجمہ ناقص اور ایک آدھ جگہ غلط ہے

اصل عبارات بھی درج ہیں :

اصل فارسی متن	ترجمہ / نسخۂ خواجہ
(۱) بخشندہ یزدانِ درون بہ سخن برافروز راسپاسم	باطن کو سخن کی گرمی بخشنے والے معبود کا شکر گزار ہوں، ص ۳۴۱
(۲) گو کہ دراندک مایہ روزگاراں	تاکہ کم آہنگی کے باوجود، ص ۳۴۱
(۳) ھمانا نگارندۂ ایں نامہ راآن درسر است کہ پس از انتخابِ دیوانِ ریختہ بہ گرد آوردنِ سرمایۂ دیوانِ فارسی برخیزد۔	اب راقم السطور کا ارادہ ہے کہ دیوانِ ریختہ کے انتخاب کے بعد دیوانِ فارسی کے مجموعے کو مرتب کرے۔ ص ۳۴۱
(۴) وچامہ گرد آوررا	اور راقم کو ص ۳۴۱
(۵) یارب ایں بوتے ہستی ناشنیدۂ از نیستی بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقشِ بہ ضمیر آمدۂ نقاش کہ بہ اسداللہ خاں موسوم . . . . فرجامِ کار نجفی مدفن نیز باد۔	یارب یہ بوتے ہستی ناشنیدہ اور یہ پیدائی نارسیدہ یعنی ضمیرِ نقاش میں مُضمر مُنقش کہ جس کا نام اسداللہ خاں ہے . . . . ، انجامِ کار مدفن نجفی بھی ہو ۔ ص ۳۴۱

میرے نزدیک نمبر ایک میں "سخن کی گرمی" کے بجائے "سخن / شعر کی روشنی" ہونا چاہیے تھا۔ نمبر ۲، میں "تاکہ کم مایئگی کے باوجود" غلط ہے۔ صحیح ترجمہ وہ ہے جو نذیر احمد اور دیگر حضرات نے کیا ہے، نذیر احمد نے لکھا ہے "اُمید ہے کہ کچھ ہی دِنوں میں" (غالب نامہ، ص ۱۵)۔ ظہورالدین احمد نے لکھا ہے : "اُمید ہے کہ تھوڑی مدت میں" (ص ۴۸)۔ احمد سعید انصاری نے لکھا ہے : "بہت ممکن ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں" (ص ۱۲۰)

نمبر ۳ "ھمانا" کا ترجمہ نہیں آسکا علاوہ ازیں "دیوانِ فارسی کے مجموعے" میں "مجموعے" کا لفظ حشو ہے۔ نمبر ۴ میں چامہ گرد آور کا ترجمہ "راقم" ناقص ہے۔

یہاں "جامع دیوان" کا محل تھا جیسا کہ اِس موقعے پر جابر علی سید اور نذیر احمد نے لکھا ہے۔ احمد سعید انصاری نے "جامع کنندۂ ابیات" لکھا ہے۔ (ص ۱۲۰) یہ بھی درست ہے گو کہ ذرا ثقیل ہے۔ نمبر ۵ میں "بوتے ہستی ناشنیدہ" اور "پیدائی نارسیدہ" کو اصل متن کے مطابق لکھ کر اپنے عجز کا اظہار کیا گیا ہے۔ حقیقتہ یہ ہے کہ غالب نے اپنی کتنی تحریروں (نظم و نثر دونوں) میں خود کو وحدت الوجودی کہا ہے، اسی نسبت سے اس دیباچے میں بھی خود کو "بوئے ہستی ناشنیدہ" (یعنی وجودِ موہوم) اور "پیدائی نارسیدہ" (وجودِ اعتباری) لکھا ہے چنانچہ اسی تناظر میں ان عبارتوں کا ترجمہ کرنے کی ضرورت تھی۔ اسی نمبر ۵ میں "مدفن بنجفی" غلط محض ہے یا تو "بنجفی مدفن" ہی کی ترتیب قائم رکھی جاتی جیسا کہ نذیر احمد (غالب نامہ، ص ۱۵) نے کیا ہے یا یوں لکھا جاتا : "اس کی عاقبت ایسی ہو کہ اسے مدفن بھی نجف میں نصیب ہو جاتے" جیسا کہ انصاری نے لکھا ہے (ص ۱۲۱) یا پھر یوں کہ: اے رب اس کا مدفن بھی نجف میں ہو۔

اب آخر میں نیر رخشاں کی تقریظ کے اردو ترجمے (مشمولہ نسخہ خواجہ) کے ضمن میں چند معروضات پیش کرتا ہوں :

نیر کی تقریظ کا یہ ترجمہ جو دیوان کے آخر میں شامل ہے مجموعی حیثیت سے کامیاب و رواں دواں ہے لیکن پھر بھی کتنی مقامات پر مترجم (تشکیل کنندہ) سے لغزشیں ہوتی ہیں۔ ذیل میں اصل عبارت اور اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے اور پھر تسامحات کی نشاندہی کی جاتے گی۔

اصل عبارت	اُردو ترجمہ (نسخہ خواجہ)
(۱) لا ابالی خرام محجوبہ ایست مقنعہ از رُخ بر داشتہ و دامن بکمر بر زدہ	"ایک بے نیازانہ چہل قدمی کرتی ہوئی مستورہ ہے جس نے پردہ دری کے انداز میں چہرے سے نقاب اٹھا لیا ہے، دامن کمر سے باندھ لیا ہے" ص ۳۴۳

اصل عبارت	اُردو ترجمہ (نسخۂ خواجہ)
(۲) پہناور پرندیست مانندِ سپہرِ ثوابت گوہر آگیں	"ستاروں بھرے آسمان کی مانند موتیوں سے بھرا ہُوا ایک کشادہ ریشمی پھریرا ہے" ص ۳۴۲
(۳) ارتنگے است بنمایشِ نقشہائے بدیع پشتِ دستِ مانی وارژنگ برزمین سای	"ایسا مرقع ہے جس کی نادر تصاویر کی نمایش دیکھ کر مانی وارژنگ بھی کورنش بجالاتے ہیں،" ص ۳۴۲
(۴) فروزندۂ چراغِ دودہ آمہ	"دوات کی روشنائی کا چراغ روشن کرنے والے"، ص ۳۴۳
(۵) برشستہ پیش طاقِ شناسائی برآویزد	"آگاہی کی محراب کے روزن پر معلق کردے۔" ص ۳۴۵
(۶) ھمگی اشعارِ شعرای شعار	"جملہ اشعار . . ." ص ۳۴۵

مثالِ اوّل میں "دامن بکمر برزدہ" دامن کمر سے باندھ لیا ہے کے بجائے "دامن کمر تک لے آتی ہے" کا محل تھا جب کہ "تنقیدِ غالب کے سو سال" میں مندرج ہے (دیکھیے ص ۶۲۳) دامن بر کمر زدن اصلاً "دامن بالا زدن" کا مترادف ہے مثال دوم میں "پہناور پرندیست" کا ترجمہ "کشادہ ریشمی پھریرا" کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ "پرند" کا معنی "پارچۂ ابریشمی" ہے لہٰذا اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے: "ایسے دُور تک پھیلا ہوا ریشمی کپڑا سمجھیے"۔ مثال سوم میں "پشتِ دستِ مانی وارژنگ برزمیں سای" کا مفہوم "مانی وارژنگ بھی کورنش بجالاتے ہیں" درج کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ کورنش بجالانے کو فارسی میں "پشتِ دست برزمین نہادن" کہتے ہیں جیسا کہ ظہوری کے اِس شعر سے ظاہر ہے:

بہ تسلیم چوں چاکرانِ کمیں   فلک پشتِ دستے نہد برزمیں

مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم یہ ہوگا: "عجز کے اظہار کے طور پر اپنی پشتِ دست زمین پر رگڑتے ہیں۔" یہی مفہوم "تنقیدِ غالب کے سو سال" میں ملتا ہے اور یہی فصیح اور درست ہے۔

مثالِ چہارم میں فارسی عبارت کا صحیح مفہوم یہ ہونا چاہیے: "دوات کے خانوادے کا چراغ روشن کرنے والے" مثالِ پنجم میں "شمسہ" اور "پیش طاق" کے لفظ قابلِ غور ہیں۔ اِن دونوں کا مترادف یہاں "محراب" اور "روزن" کے بجائے "قبہ" اور "صحنِ خانہ" یا "دروازۂ بلند" ہونا چاہیے۔

مثالِ ششم میں "شعرای" کا ترجمہ نہیں دیا گیا۔ پورے ٹکڑے کا ترجمہ یوں ہوگا: "مجلہ روشن لقا اشعار"۔

دیوانِ غالب کے اِس نسخۂ خواجہ کے آخر میں "مزید مآخذ" کے زیرِ عنوان آٹھ کتابوں کے نام دَرج ہیں ان میں سے تین کا اندراج قطعی بے محل ہے یعنی امیرِ کبیر نواب شمس الامرا بہادر کی "علم جرِ ثقیل و علم ہیئت"، رجب علی بیگ کی "فسانۂ عجائب" (طبعِ اوّل) اور ملّا معین الدین کی "معارج النبوۃ"۔ کیا مرتب نے اِن تینوں مذکورہ کتب سے کوئی حوالہ دیا ہے یا اقتباس کیا ہے کہ انھیں مآخذ کا نام دیا ہے؟ کیا مرتب پر "مآخذ" کے معنی روشن نہیں؟ پھر یہاں مکرر "معارج النبوۃ" (قلمی نسخہ) کو معین الدین واعظ الکاشفی سے منسوب کیا ہے حالانکہ یہ کتاب مُلّا معین الدین فراہی کی ہے۔ فراہ ہرات کے نزدیک کا دہ معروف قریہ ہے جو بڑا مَردم خیز رہا ہے۔ ابونصر فراہی مصنف "نصاب الصبیان" کا تعلق اسی قریے سے تھا۔

قارئینِ کرام! مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ دیوانِ غالب کی زیرِ نظر تدوین میں متن و مفہوم کی کس قدر نارسائیاں، لغزشیں اور تسامحات ہیں۔ اِن تسامحات کے پیشِ نظر مرتب کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے اِس متن کی تدوین میں عمرِ عزیز کے پندرہ سترہ برس صرف کر دیے، سوائے شاعرانہ غلو کے اور

کیا ہے۔ جس کتاب میں اغلاط کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہو، اسے کسی درجے میں بھی تدوین کا قابلِ فخر کارنامہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ تدوین بھی ایک ایسے قلمی نسخے کی ہو جس کے مالِ مسروقہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ستم بالائے ستم یہ کہ اِس نسخے کو خواجہ منظور حسین مرحوم جیسے شریف آدمی سے منسوب کر کے اسے "نسخۂ خواجہ" کا نام دیا گیا ہے۔ مالِ مسروقہ کو کسی مرحوم سے منسوب کرنا، اس کی رُوح کو اذیّت دینے کے مترادف ہے۔

پیشِ نظر مضمون کے آخر میں نسخۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (متعارفہ سیّد عبداللہ)، نسخۂ لاہور (متعارفہ عرشی) اور نسخۂ خواجہ (متعارفہ معین الرحمٰن) کے پہلے دو دو صفحات کے عکس شایع کیے جا رہے ہیں۔ اِسی طرح نسخۂ لاہور (متعارفہ عرشی) کے شعری متن کے پہلے ایک صفحہ کے روٹوگراف کا عکس اور انہی دو صفحات کا عکس از نسخۂ خواجہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ نیز نسخۂ لاہور کے آخری ورق کا عکس بھی شایع کیے جا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں "ماہِ نَو" جولائی سہ ۱۹۵ء میں شایع شدہ یونیورسٹی لائبریری کے نادر نسخے کے پہلے دو صفحات کے مقصّرہ عکس کا فوٹو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ نیز نسخۂ خواجہ کے صفحہ نمبر ۲۲ کے متن کا عکس بھی حاضرِ خدمت ہے جس کے زیریں حصّے سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا تفویض کردہ Acc. No چھیلا گیا ہے۔ شاید "فتے دین" کو اِس مقام پر اپنے نام کی چٹ لگانا یاد نہ رہا۔

آخر میں اِس امر کا اظہار بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ زیرِ بحث مخطوطے کے مختلف عکوس کا جو اس مضمون کے ساتھ قارئین کے مطالعے اور مشاہدے کی غرض سے شایع کیے جا رہے ہیں، باہمی موازنہ کرتے ہوئے یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ عکس پر تکنیکی تبدیلیوں، عدسوں اور مشینوں کے معیار، مختلف کمپنیوں کے ماڈلز اور مختلف مراحل یعنی تکبیر ENLARGEMENT اور تقصیر REDUCTION وغیرہ سے گزرنے کی بنا پر معمولی سا فرق پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ سیاہی کے گاڑھے یا

پتلے ہونے اور کاغذ کے کم یا زیادہ جاذب ہونے یا اس کی سطح کے چکدار یا کھردرا ہونے سے کسی حد تک فرق پیدا ہو جاتا ہے، مگر اس سے سوادِ خط اور حروف و الفاظ کی نشست اور پیچ و خم میں مسخ کر دینے والا فرق بہرحال نہیں پڑتا۔

مرتب نے نسخۂ خواجہ کا جو عکسی متن شایع کیا ہے وہ جدید ترین تکنیک سے تیار کیا گیا ہے جبکہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے مضمون (ماہِ نو جولائی ۱۹۵۴ء) کے ساتھ شایع شدہ عکس چوالیس برس پہلے مخطوطے کے فوٹو عکس سے پوزیٹو بنا کر پلیٹ سے تیار کیا گیا تھا۔ اسی طرح عرشی مرحوم کو ۱۹۵۸ء میں اسی قلمی نسخے کا روٹوگراف فراہم کیا گیا تھا۔ روٹوگراف میں تحریر سفید اور کاغذ سیاہ ہو جاتا تھا۔ یہ تکنیک اب مدت سے متروک ہو چکی ہے۔

عہدِ جدید کی تکنیکی پیشرفت کے باعث فرینزک تکنیک اور انفرا ریڈ کیمرے اور کیمیائی تجزیوں بشمول کاربن ٹیسٹ وغیرہ سے دستاویزات میں نقطے برابر ردوبدل اور تحریف و تغیر کا بھی ناقابلِ تردید تعین ممکن ہے۔ چنانچہ ان جدید ترین تکنیکوں کا اطلاق نسخۂ خواجہ کی چند تحریفات پر بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے تاکہ حقیقتِ حال کھل کر سامنے آ جائے۔

اُمید واثق ہے کہ مندرجہ بالا گزارشات کے پیشِ نظر اور مذکورہ عکسی شواہد کی موجودگی میں قارئین فوراً بسہولت اندازہ لگا لیں گے کہ بظاہر تین نسخوں کی یہ مزعومہ تثلیث اصل میں ایک ہی نسخے کی توحید کی داستان بیان کر رہی ہے اور یہ داستان ہے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے قلمی نسخے کی گم شدگی اور نسخۂ خواجہ کی صورت میں اس کے ظہورِ ثانی کی۔ رہی یہ بات کہ اِس قلمی نسخے کی بازیافت کب تک ممکن ہے سو اس باب میں غالب ہی کا یہ شعر بڑی اُمید دلاتا ہے:

دیکھیے پاتے ہیں "عشاق" بتوں سے کیا فیض
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری مستعارۂ عرشی کے پہلے صفحے کے روٹوگراف کا عکس

مشام شمیم آشنایان را صلا و نهاد انجمن نشینان را مژده که لختی از
سامان مجمره گردانی آماده و دامنی از عود هندی دست بهم داده است
نه چوبهای سنگ کوب خورده و هنجار ناشناخته شکسته بی اندام تراشیده
بلکه به تیشه نگرفته به کارد ریز ریز کرده به سوهان خراشیده آمیده نفس
گداختگی شوق تجسّس آتش یارنی سنج آتشی که در گلخنهای هند افسرده
و خاموش و از کیف جانستان مرگ خود در شبستان نیستی چه بیرون مسلّم است
از نایابی بسی خواهان فرو بند تا هر سنگ سنجی واند دلواپسی برشته سمع فراز گشته
اند سخن [illegible] بدل گداختن عمر زده و بر نم افروختن زلف [illegible] آتش

بصنعت برافروختند و آتش پرست را به بادافراه هم در آتش سوختند

نیک دیده اند که شرر و سنگ در هوای آن جهنده و از نعل در آتش است که

به چشم روشنی همی سنگ از سنگ بیرون تافته و در ایوان لهراسپ نشو و نما یافته

خس را فروغ بست و لاله را رنگ و مغ را چشم و آتشکده را چراغ بخشنده یزدان

درون سخن برافروز است با هم که شراری ازان آتش تابناک بخاکستر خویش

یافته به کاوکاو سینه شکافته ام و از نفس دمه بران بر نهاده بو که در اندک مایه

روزگاران اندمایه فراهم تواند آمد که مجمره را فروغ روشنائی چراغ و رایحه

عود را بال شناسائی دماغ تواند بخشید همانا نگارنده این نامه را آن

در سر است که پس از انتخاب دیوان ریخته به گرد آوردن سرمایه دیوان فارسی

برخیزد و باستفاضه کمال این فرو رفت بس زانوی خویشتن نشیند

امید که سخن سرایان سخنور ستای پراکنده ابیاتی را که خارج ازین اوراق

یابند از آثار تراوش رگ کلک این نامه سیاه نشناسند و جامه گیر گستر آور را

در ستایش و نکوهش آن اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند یارب این نوباوه

هستی ناشنیده از نیستی به پیدائی نارسیده یعنی نقش بضمیر آمده

نقاش که به اسدالله خان موسوم و به میرزا نوشه معروف و به غالب

نسخۂ متعارفہ سید عبداللہ کے دوسرے صفحے کا مکتبی عکس

نسخہ متعارفہ عرشی کے دُوسرے صفحے کے روٹوگراف کا عکس

نسخۂ متعارفہ سیّد عبداللہ
کے دو صفحات
مطبوعہ 'ماہِ نو' جولائی ۱۹۵۴ء
کے مقصّرہ عکس

نسخۂ متعارفۂ عرشی کے شعری متن کے پہلے صفحے کا عکس

متخلص بہ اسد چنانکہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن است وانجام کار نجفی مدفن نیز باد
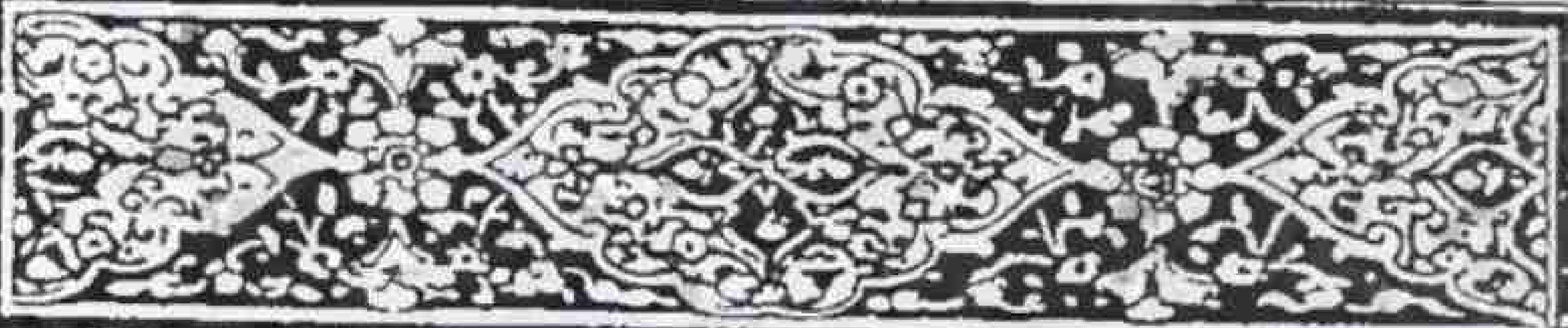
نقش فریادی ہی کسکی شوخی تحریر کا | کاغذی ہی پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانیہای تنہائی نپوچھ | صبح کرنا شام کا لانا ہی جوی شیر کا

جذبۂ بی اختیار شوق دیکھا چاہیی | سینۂ شمشیر سی باہر ہی دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہی بچھایے | مدعا عنقا ہی اپنی عالم تقریر کا

بسکہ ہون غالب اسیری مین بھی آتش زیر پا | موی آتش دیدہ ہی حلقہ میری زنجیر کا

جراحت تحفہ الماس ارمغان داغ جگر ہدیہ | مبارکباد اسد غمخوار جان دردمند آیا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروی کار | صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

آشفتگی نی نقش سویدا کیا درست | ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خوابمین خیال کو تجھسی معاملہ | جب آنکھ کھل گئی نہ زیان تھا نہ سود تھا

لیتا ہون مکتب غم دلمین سبق ہنوز | لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

این همایون صحیفه شناختیم همگی اشعار شعری شعار غزل و قصیده
و قطعه و رباعی هزار و پانصد و پنجه دانید یافتیم
الا یا توانا هوشیاران هوشی و شنوا گوشیان گوشی بر ساز زاده
شناخت فراوانی نیکو معانی باید رفت نه در مغوله شماره ز
خرده بر کلت ابیات گرفت چنانکه خود آن والا آموزگار در گذارش
این هنجار نیز تلمیحی نامه خویشتن در پرده سیاقت آن گفتار خود میسر آید

آری راست میفرماید مقطع	نگویم تا نباشد نغز نالب
چه غم گر هست اشعار من اندک	از من یادگاری و برای دیگران بدکاسی باد

فتح دین

نسخۂ متعارفہ معین الرحمٰن کے آخری صفحے کا عکس جہاں مدوّرہ مہر کے اوپر "فتح دین" کی

پس نوشت

"دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ ـــ اصل حقائق" کا پہلا ایڈیشن اوائل اپریل ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا تھا اور ایک ڈیڑھ ماہ کے قلیل عرصے میں ختم ہو گیا تھا۔ اہلِ علم نے اسے پذیرائی بخشی۔ تب سے اب تک اس کی بڑی مانگ رہی۔ اس دوران بہت سے نئے حقائق بھی سامنے آئے۔ اس سب کا تقاضا تھا کہ کتاب کا دُوسرا ایڈیشن شائع ہو۔ سو اب یہ اہلِ نظر کے ہاتھوں میں ہے۔ تماشائیوں سے نہ پہلے غرض تھی نہ اب ہے۔ اُمید ہے یہ نیا ایڈیشن بھی حسبِ سابق اِستحسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

کتاب کے شایع ہونے کے ایک ماہ بعد سنہ ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر مُعین الرحمٰن نے اس کا جواب "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ ـــ صحیح صُورتِ حال" کے نام سے اپنے ادارے سے شائع کیا۔ اِس جواب کو اہلِ علم نے عذرِ گناہ بدتر از گناہ جانا۔ اِس دوران میرے مَوقف کی حمایت میں پُورے ملک میں پے دَرپے تحریریں شائع ہوئیں۔ ان میں مضامین بھی تھے، کالم بھی اور نظمیں بھی۔ سیّد قُدرت نقوی نے اگست ۲۰۰۰ء میں "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ ـــ ایک جائزہ" کے زیرِ عنوان ایک بڑا عالمانہ مقالہ کتابچے کی صُورت میں شائع کیا جس میں نہ صرف مُعین الرحمٰن صاحب کے مُتعدد تحقیقی تسامحات (میرے گنائے گئے تسامحات کے علاوہ) بتائے گئے تھے بلکہ قوی دلائل کے ساتھ (میرے مَوقف کی تائید میں) یہ بھی ثابت کیا گیا تھا کہ مُعین صاحب کا شائع کردہ نسخہ وُہی نسخۂ لاہور ہے جس کا اوّلین تعارف جولائی ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ماہِ نو میں کرایا تھا اور جس پر بعد ازاں قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے قلم اُٹھایا تھا۔

سید قدرت نقوی کے کتابچے کے شائع ہونے کے ایک ماہ بعد ستمبر ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر عارف ثاقب نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اور میرے کتابچے کا ایک محاکمہ "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ اصل حقائق اور دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ، صحیح صُورتِ حال —— ایک تقابلی جائزہ" کے عُنوان سے شائع کیا جس میں شق وار تجزیہ کر کے ثابت کیا کہ مُعین الرحمٰن صاحب میرے علمی اعتراضات میں سے اکثر کا جواب دینے سے قاصر رہے اور جن اعتراضات کے جواب انھوں نے دیے ان کی حیثیت بے جان تاویلوں اور مضحکہ خیز حیلوں کی ہے اور بس۔

مئی ۲۰۰۰ء میں کتابچہ لکھنے کے بعد بھی معین صاحب اطمینان سے نہیں بیٹھے وہ اپنے بے بنیاد مؤقف کو بعض اخباروں میں پیش کرتے رہے اور میں نہ مانوں کی تفسیر بنے رہے۔ مذکورہ کتابچے کے بعد انھوں نے "بر سبیلِ غالب" کے نام سے ایک ضخیم کتاب شایع کی اور اس کے ایک دو ماہ بعد دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (اصلاً نسخۂ لاہور) کا ڈی لکس ایڈیشن شائع کیا۔ اِس ڈی لکس ایڈیشن پر سنہ اشاعت اگست ۲۰۰۰ء درج ہے جو درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دیوانِ غالب کا قلمی نسخہ معین صاحب نے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کو ۱۲ر اگست ۲۰۰۰ء کو واپس کیا تھا۔ تب تک اِس نئے ایڈیشن کا کہیں پتا نہ تھا۔ افسوس ناک اَمر یہ ہے کہ مؤخر الذکر کتاب اور ڈی لکس ایڈیشن دونو کو فروخت کے لیے مارکیٹ میں نہیں رکھا گیا۔ ایسا کیوں ہُوا اس کا ذِکر آگے چل کر ہوگا۔ اگلے اَوراق میں مُعین الرحمٰن کے شائع کردہ تینوں "کارناموں" کا مختصر جائزہ لیا جا رہا ہے سب سے پہلے ان کی مختصر تالیف" دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ۔ صحیح صُورتِ حال" پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا جسے میں نے اِختصار کی خاطر کہیں کہیں "..... صحیح صُورتِ حال" لکھا ہے۔

مُعین الرحمٰن صاحب نے اپنے کتابچے میں اپنے دفاع میں کُچھ دلیلیں اور زیادہ تر اِدھر اُدھر سے اِقتباسات دَرج کر کے اپنے مؤقف کو درست ثابت کرنا چاہا ہے مگر المیہ یہ ہے کہ ایک جُھوٹ کو چھپانے کے لیے انھیں کئی جھوٹ تصنیف

کرنا پڑے ہیں اور اُن کی وضاحتیں اکثر جگہ مضحکہ خیز ہو گئی ہیں۔ کہیں جگہ وہ اپنی فطرت کے مطابق تحریف کرتے ہیں۔ اقتباسات درج کرتے ہیں تو ان میں حسب منشا قطع و برید کرتے ہیں۔ کہیں طعن و تشنیع سے کام لیتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ کم حوصلہ عورتوں کی طرح کوسنے دینے اور طعنے مہنے کا اسلوب اپنانے کے بجائے وہ ڈھنگ سے میرے اعتراضات کا سلسلہ وار جواب دیتے مگر ان کی حالت تو اس باب میں سعدی کے اس درویش کے مانند نظر آتی ہے جس نے " دامن بیار " کے جواب میں عالم بے بسی میں کہا تھا :

"دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم" (جھولی کیسے پھیلاؤں کہ یہاں تو کرتا ہی نہیں ہے)

رفیق احمد نقش نے معین الرحمٰن کے اس طرزِ عمل کے باب میں لکھا ہے :

"ڈاکٹر سید معین الرحمٰن پر جعل سازی اور فریب کاری کے سنگین الزامات عاید کیے گئے ہیں۔ الزامات میں سے کچھ کو انھوں نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ کچھ کے جواب میں الزام لگانے والوں کو بد دعاؤں اور کوسنوں سے نوازا ہے اور کچھ الزامات کے جواب میں جو توقف اختیار کیا ہے اس سے عذرِ گناہ بد تر از گناہ کا عملی نمونہ سامنے آتا ہے۔"[۱]

معین الرحمٰن صاحب نے اپنے کتابچے کے آغاز میں ایک جگہ پاؤنڈ کا قول نقل کیا ہے جس کی رُو سے ناقص اور بے اثر دوائیں (دوائیاں نہیں جیسا کہ معین الرحمٰن نے لکھا ہے) بنانے والا تو سماجی مجرم سمجھا جاتا ہے مگر ناقص رویوں اور خیالات اور معلومات کی اشاعت کرنے والا عالم اور دانشور صاف بچ نکلتا ہے جبکہ اس کا دار منافع خور اور جعلی دوائی کمپنیوں کے وار سے آگے جاتا ہے۔

اپنی کتاب کے ذریعے میرا کام دراصل انھی ناقص رویوں اور خیالات اور معلومات

---

[۱] ماہنامہ سورج فروری ۲۰۰۱ء، ص ۱۸

کی اشاعت کرنے والے اِس غالب شناس "عالم" اور "دانشور" کو بے نقاب کرنا تھا۔ الحمد للہ میں اس میں کامیاب رہا اور ملک اور بیرونِ ملک کے مُتعدد اہلِ علم نے میرے اِس تحقیقی کام کو سراہا۔ اِن حضرات میں سے بعض کی آرا اِس نئے ایڈیشن کے اختتامی صفحات میں نقل کی جائیں گی۔

کتابچے کے ص ۱۳ پر مُعین الرحمٰن صاحب نے خود کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور جناب مشفق خواجہ کے قبیلے کا ادنیٰ فرد کہا ہے۔ میرے خیال میں یہاں ان کے حافظے نے خطا کی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے فرمان فتحپوری اور مشفق خواجہ کبھی ادبی سرقے کے مرتکب نہیں ہوتے۔ معین صاحب کو تو خود کو کسی ایسے قبیلے یا طائفے میں شامل یا شمار کرنا چاہیے جس کا ذکر حضرتِ سعدی نے بایں الفاظ کیا ہے: "یکے از طائفۂ دُزداں بر قُلّۂ کوہ نشستہ بودند"۔ میں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۲ پر ان کے بعض ادبی سرقوں کا سرسری ذکر کیا تھا اور بعض کا ذکر آئندہ کے لیے اُٹھا رکھا تھا۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں کم ازکم ان کی ایک ایسی ہی دھاندلی کا ذکر کر دیا جائے۔ محترمہ عاصمہ وقار نے سہ ماہی "ارتکاز" کراچی کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں "ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک نادر خط" کے زیرِ عنوان اپنی ایک مختصر سی تحریر شائع کی تھی۔ آغاز میں انھوں نے چند مختصر تمہیدی کلمات لکھے تھے اور سید عبداللہ کے خط کے اندراج کے بعد آٹھ مختصر حاشیے تحریر کیے تھے۔ نہ صرف یہی تمہیدی کلمات بادنیٰ تغیر معین الرحمٰن صاحب نے ماہنامہ "علامت" لاہور کے نومبر ۱۹۹۵ء کے شمارے میں اپنے نام سے چھپوائے بلکہ عاصمہ وقار کے لکھے ہوئے آٹھوں کے آٹھوں مختصر حاشیے بھی ہتیا کر من و عن اپنے نام سے شائع کر دیے۔ قارئین ان دونو تحریروں کے کامل عکس ملاحظہ فرمائیں اور پاؤنڈ کا مذکورہ بالا قول بالجہر دُہرائیں۔ جو شخص عاصمہ وقار کے چند سطری مضمون پر دندانِ آز تیز کیے بغیر نہیں رہ سکتا وہ پرکھنوی چندر کی تین سو سے زاید صفحات پر مشتمل "جاگیرِ غالب" غصب کرنے میں کیونکر تامّل کر سکتا ہے؟

متعارفہ :۔ عاصمہ وقار
- الوقار- ۵۰ - لوئر مال - لاہور

ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک نادر خط

ڈاکٹر سید معین الرحمن کے ذخیرہ نوادر کا ایک بڑا منضبط حصہ (سیکشن) اکابر اہل علم و ادب کے قلمی خطوں پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں سب سے قیمتی اور قدیم، غالب (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء) کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط ہیں۔ غالب کے تین نئے خط انھوں نے سالنامہ نقوش لاہور ۱۹۹۴ء اور "ارتکاز" کراچی کے پہلے شمارے (۹۵ - ۱۹۹۴ء) میں پیش کیے۔* غالب کے پانچ مزید خط انھوں نے شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور کے ریسرچ جرنل "تحقیق نامہ" کے غالب نمبر ۹۵-۱۹۹۴ء میں متعارف کرائے ہیں۔

آج، ڈاکٹر سید عبداللہ (ولادت منگور ضلع ہزارہ ۵ اپریل ۱۹۰۶ء، وفات لاہور ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء) کے ایک خط کا تعارف مقصود ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم عہد موجودہ کے محترم، معروف اور ممتاز ترین اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن کے پاس ان کے قلمی خطوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جس میں سے متعدد خط پچاس برس سے بھی زیادہ پہلے کے ہیں۔

قارئین "ارتکاز" کے لیے اگلے صفحات میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء کا ایک خط پیش کیا جا رہا ہے۔۔۔ کوئی اٹھاون (۵۸) برس پہلے کا لکھا ہوا یہ خط، غالب کے نامور اسکالر ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام (ولادت چک جھمرہ، فیصل آباد، اگست ستمبر ۱۹۰۸ء، وفات لاہور ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء) کے نام ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا اس سے پرانا کوئی خط شاید ہی کہیں اور محفوظ ہو۔ خط کا متن ملاحظہ ہو۔۔۔ متن کے وضاحتی حواشی میرا اضافہ ہیں۔

عاصمہ وقار

---

*۔ یہ خط "قومی زبان" (کراچی)، ہفت روزہ "ہماری زبان" (دہلی)، سہ ماہی "نقد و نظر" (علی گڑھ) اور "تحقیق نامہ" غالب نمبر، لاہور کے علاوہ سال ۱۹۹۴ء کے انتخاب مقالات، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر میں بھی شامل اشاعت ہوئے۔

سہ ماہی ارتکاز کراچی
اکتوبر ۱۹۹۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Syed Muhammad Abdullah
M.A. D.litt

یونی ورسٹی لائبریری لاہور
تاریخ - یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء

مکرم و محترم! السلام علیکم

اس غائبانہ تعارف کی بنا پر جو مجھے آپ سے آپ کی زرین کتاب "غالب نامہ" *۱ کی بنا پر حاصل ہے، حاضر ہوتا ہوں۔ امید کہ بیگانہ محض نہ خیال کیا جاؤں گا لطیف صاحب *۲ کی غیر معتدل تنقید جب پہلے پہل شایع ہوئی تو *۳ اس کے تیر و نشتر کو دیکھنے کے لیے میں نے انھی دنوں میں اس کا مطالعہ کیا تھا۔

مصنف نے اپنی افتاد طبع، اور مغرب کے غلط اثرات سے متاثر ہو کر بطور ایک ناانصاف پسند جج کے جو فیصلہ غالب کی عظمت کے متعلق دیا ہے اس سے بہت رنج ہوا۔ محسوس ہوا کہ بے چارے غالب مرحوم کو جن کی زندگی عصر کی بے قدری اور ابنائے عصر کی بے مہری کے ماتم میں گزری، مرنے کے بعد بھی ایسے تذکرہ نگار ملے جن کی بے مہری میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

تاہم جیسا کہ آپ نے اپنی بلند پایہ تصنیف میں ذکر فرمایا ہے، اس سے غالب کو سمجھنے کے لیے نئی راہیں کھل گئیں اور ڈاکٹر صاحب نے جو اصول دریائی پیش کیے، ان پر عمل کرتے ہوئے اس ستم کی تلافی ہو سکتی ہے جو روا رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ اس خیال میں رہا کہ کشاکش غم روزگار سے کبھی نجات ملے تو اس طرز پر لکھنے کے لیے بات اٹھاؤں --- پھر مکرمی مہر صاحب *۴ سے سنا کہ وہ غالب پر قلم آزمائی کر رہے ہیں۔ توقع تھی کہ اس پہلو کو چھیڑیں گے --- لیکن کتاب نکلی *۵ تو دیکھا کہ انھوں نے "تزک غالب" تیار کی ہے، اگرچہ چیز خوب ہے لیکن ہمارا مقصود مفقود تھا -------- تاآنکہ انھیں کی زبانی معلوم ہوا کہ "غالب نامہ" آرہا ہے جو سب پر غالب ہوگا۔ چنانچہ آیا دیکھا گیا

میں نے یہ مانا *۶ کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آپ نے خوب لکھا ہے! اب "غالب" کی تصویر مکمل ہوئی --- اب "گردش دوراں" کے گرمنڈ شاعر کے ساتھ انصاف ہوا! زمانہ اپنی جفاؤں پر پشیمان ہوا!

کیا یہ عرض کرسکتا ہوں کہ اس "نایاب" تالیف کو (نایاب بلحاظ معنی) آپ نے انگریزی میں کیوں شایع نہ کیا ---- شاید یورپ کو ہمارے شاعر کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ---- کیا اب انگریزی میں تبدیل نہ کر دیں گے؟ ضرورت تو ہے اور خدمت بھی!

ایک شکایت بھی ہے (اور دوستانہ بلکہ مخلصانہ) کہ کتاب کے ہر ہر ورق سے تعجیل بے صبری اور بے پروائی کے آثار ظاہر ہیں۔ کاتب کی غلطیوں کی اصلاح نہیں کی گئی۔ بعض جگہ نہایت نمایاں اغلاط ہیں۔ مطبع کی طرف سے ذوق کی کمی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ غالب کی کتاب کو ذوق سے بے گانہ ہونا چاہیے تھا۔ "ماخذ" کو جس صفحے پر چسپاں کیا گیا ہے، گویا بازار میں کاغذ کی گرانی تھی۔

جنگ یورپ میں وہ کہتے ہیں گراں ہے کاغذ

ان فروگزاشتوں کا اثر مصنف کی تحقیق پر پڑ رہا ہے۔ "یادگار غالب" کے متعلق ۱۹۰۸ء میں لکھی گئی ہے (صفحہ ۱۰۳) حالانکہ ۱۸۹۸ء کی چھپی ہوئی کتاب بھی موجود ہے، وغیرہ وغیرہ تبصرہ و تنقید مراد نہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ چاند کے چہرے پر یہ چھائیاں کیوں ہیں۔ مہر صاحب کی کتاب بہتر خیر مقدم کی مستحق تھی لیکن خیر یہ باتیں آپ مصنف حضرات جانیں ----ہم نامحرمان اسرار کو کیا معلوم!

تنقید نپی تلی ہے۔ واقعی کسی یوربین نقاد کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ ایک دور کا دوسرے دور سے اور ایک واقعے کا دوسرے سے جو ربط قایم کیا گیا ہے، خوب ہے!

کیا آپ مہدی حسن "افادات مہدی" کے نقش قدم پر نہ چل سکیں گے!

صرف اتنی ہی گزارش مطلوب تھی۔

جس والسلام

نیاز مند

سید محمد عبداللہ

۱۔ کتاب "غالب نامہ" مرکنٹائل پریس لاہور، باہتمام سید عظیم الدین منادی پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر مسلم، گجرات سورت سے شایع ہوئی۔ طبع اول ستمبر ۱۹۳۶ء

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف ولادت کرنول ۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء وفات حیدرآباد دکن ۳ نومبر ۱۹۷۱ء

۳۔ "غالب۔اے کریٹیکل انٹروڈکشن آف ہزلائف اینڈ اردو پوئٹری (انگریزی کتاب) طبع اول نومبر ۱۹۲۸ء

۴۔ مولانا غلام رسول مہر، ولادت ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء وفات ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء

۵۔ "غالب" مولانا مہر، طبع اول مسلم پرنٹنگ پریس لاہور جون ۱۹۳۶ء

۶۔ غالب کے متداول دیوان میں "جانا" بجائے: "آنا"

۷۔ مہدی افادی، مہدی حسن، ولادت گورکھپور ۱۸۷۰ء۔ وفات لکھنؤ نومبر ۱۹۲۱ء

۸۔ "افادات مہدی" مرتبہ بیگم مہدی، طبع اول ۱۹۲۳ء، مہدی حسن کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھیے عبدالقوی دسنوی کی کتاب "مہدی حسن افادی" طبع اول نسیم بک ڈپو لکھنؤ جنوری ۱۹۷۷ء۔

سہ ماہی "ارتکاز" کراچی، اکتوبر ۱۹۹۵ء

اکابر کے خطوط

متعارفہ:
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

میرے شخصی ذخیرہ نوادر کا ایک بڑا مضبوط حصہ (سیکشن)، اکابر اہل علم و ادب کے قلمی خطوں پر مشتمل ہے (اس میں سب سے قیمتی اور قدیم، غالب (۱۷۹۷ء --- ۱۸۶۹ء) کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط ہیں(۱)----) آج ڈاکٹر سید عبداللہ (ولادت منگلور ضلع ہزارہ ۵ - اپریل ۱۹۰۶ء، وفات لاہور ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء) کے ایک خط کا تعارف مقصود ہے-----
ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کا شمار عہد موجودہ کے محترم، معروف اور ممتاز ترین اہل قلم میں ہوتا ہے۔ میرے پاس ان کے قلمی خطوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ جن میں سے متعدد خط؟ اب سے پچاس برس پہلے تک کے ہیں۔]

قارئین "علامت" کے لیے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا اکتوبر ۱۹۳۷ء کا ایک خط پیش کر رہا ہوں۔ کوئی ستاون (۵۷) برس پہلے کا لکھا ہوا یہ خط، غالب کے نامور اسکالر ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام (ولادت چک جمرہ، لیئل آباد اگست ستمبر ۱۹۰۸ء، وفات لاہور ۱۷۔ جنوری ۱۹۷۳ء) کے نام ہے------ میرا گمان ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا اس سے پرانا کوئی خط شائد ہی کہیں اور محفوظ ہو-----

خط کا متن اور اصل قلمی خط کا عکس ملاحظہ ہو---- متن کے وضاحتی حواشی میرا اضافہ ہیں۔

سید معین الرحمٰن
("الوقار" ۵۰۔ لوئر مال لاہور)

۱۔ غالب کے کچھ نئے خط میں نے سالنامہ "نقوش" لاہور ۱۹۹۳ء اور کچھ غیر مطبوعہ خطوط، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور کے ریسرچ جرنل "تحقیق نامہ" غالب نمبر ۱۹۹۳ء میں متعارف کرائے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یونیورسٹی لائبریری لاہور

Syed Muhammad Abdullah

M.A. D. Litt.

Dated یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء

مکرم و محترم! السلام علیکم

اس غائبانہ تعارف کی بنا پر جو مجھے آپ سے آپ کی زرین کتاب "غالب نامہ"(۱) کی بنا پر حاصل ہے، حاضر ہوتا ہوں۔ امید کہ بیگانہ محض نہ خیال کیا جاؤں گا۔

لطیف (۲) صاحب کی غیر معتدل تنقید جب پہلے پہل شائع ہوئی(۳)، تو اس کے تیر و نشتر کو دیکھنے کے لیے میں نے انہی دنوں میں اس کا مطالعہ کیا تھا۔ مصنف نے اپنی "افتادِ طبع" اور مغرب کے "غلط اثرات" سے متاثر ہو کر بطور ایک ناانصاف پسند جج کے جو فیصلہ غالب کی عظمت کے متعلق دیا ہے، اس سے بہت رنج ہوا۔ محسوس ہوا کہ بیچارے غالب مرحوم کو جن کی زندگی عصر کی بے قدری اور ابنائے عصر کی بے مہری کے ماتم میں گزری، مرنے کے بعد بھی ایسے تذکرہ نگار ملے جن کی بے مہری میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ ع

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

تاہم جیسا کہ آپ نے اپنی بلند پایہ تصنیف میں ذکر فرمایا ہے، اس سے غالب کو سمجھنے کے لیے نئی راہیں کھل گئیں اور ڈاکٹر صاحب نے جو اصول و مبانی پیش کیے، ان پر عمل کرتے ہوئے، اس ستم کی تلافی ہو سکتی ہے جو روا رکھا گیا ہے۔

اس کے بعد ہمیشہ اس خیال میں رہا کہ کشاکش غم روزگار سے کبھی نجات ملے تو اس طرز پر لکھنے کے لیے ہاتھ اٹھاؤں۔۔۔۔ پھر مکرمی مہر(۴) صاحب سے سنا کہ وہ غالب پر قلم آزمائی کر رہے ہیں۔ توقع تھی کہ اس پہلو کو چھیڑیں گے۔۔۔۔ لیکن کتاب نکلی(۵) تو دیکھا کہ انہوں نے "تزک غالب" تیار کی ہے، اگرچہ چیز خوب ہے لیکن ہمارا مقصود، مفقود تھا۔۔۔۔ تا آنکہ انہیں کی زبانی معلوم ہوا کہ "غالب نامہ" آ رہا ہے جو سب پر غالب ہو گا، چنانچہ آیا اور دیکھا گیا ع

میں نے مانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے(۶)

آپ نے خوب لکھا ہے! اب "غالب" کی تصویر مکمل ہوئی۔ اب "گردش دوراں) کے گلہ مند شاعر کے ساتھ انصاف ہوا! زمانہ اپنی جفاؤں پر پشیمان ہوا!

۱۔ مرکنٹائل پریس لاہور باہتمام سید عظیم الدین منادی پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر مسلم، گجرات سورت سے شائع ہوا، طبع اول ستمبر ۱۹۳۶ء

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف ولادت کرنول ۱۱۔ ستمبر ۱۸۹۱ء وفات حیدر آباد دکن ۴۔ نومبر ۱۹۷۱ء۔

۳۔ "غالب۔ اے کریٹیکل اپریسی ایشن آف ہز لائف اینڈ اردو پوئٹری" (انگریزی کتاب) طبع اول نومبر ۱۹۲۸ء۔

۴۔ مولانا غلام رسول مہر، ولادت ۱۳۔ اپریل ۱۸۹۵ء، وفات ۱۶۔ نومبر ۱۹۷۱ء

۵۔ "غالب" از مولانا مہر، طبع اول مسلم پرنٹنگ پریس لاہور، جون ۱۹۳۶ء

۶۔ غالب کے متداول دیوان میں "جانا" بجائے: مانا۔

کیا یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اس "نایاب" تالیف کو (نایاب بلحاظ معنی) کے آپ نے انگریزی میں کیوں شائع نہ کیا------ شاید یورپ کو ہمارے شاعر کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا۔ کیا اب انگریزی میں تبدیل نہ کریں گے؟ ضرورت تو ہے اور خدمت بھی!

ایک شکایت بھی ہے (اور دوستانہ بلکہ مخلصانہ) کہ کتاب کے ہر ہر ورق سے تعجیل۔ بے صبری اور بے پرواہی کے آثار ظاہر ہیں۔ کاتب کی غلطیوں کی اصلاح نہیں کی گئی۔ بعض جگہ نہایت نمایاں اغلاط ہیں۔ مطبع کی طرف سے ذوق کی کمی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ غالب کی کتاب کو ذوق سے بیگانہ ہونا چاہیے تھا۔ "مافقہ" کو جس (طرح) صفحے پر چسپاں کیا گیا ہے "گویا بازار میں کاغذ کی گرانی تھی ع

جنگ یورپ میں وہ کہتے ہیں گراں ہے کاغذ

ان فروگزاشتوں کا اثر مصنف کی تحقیق پر پڑ رہا ہے۔ "یادگار غالب" کے متعلق ۱۹۰۸ء میں لکھی گئی ہے (صفحہ ۱۰۳) حالانکہ ۱۸۹۷ء کی چھپی ہوئی کتاب بھی موجود ہے' وغیرہ وغیرہ۔ تبصرہ و تنقید مراد نہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ چاند کے چہرے پر یہ چھائیاں کیوں تھیں۔

سر صاحب کی کتاب بہتر غیر مقدم کی مستحق تھی لیکن خیر یہ باتیں آپ مصنف حضرت جانیں------ ہم نامحرمان اسرار کو کیا معلوم!

تنقید نپی تلی ہے۔ واقعی کسی یورپین نقاد کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ ایک دور کا دوسرے دور سے اور ایک واقعے کا دوسرے واقعے سے جو ربط قائم کیا گیا ہے' خوب ہے!

کیا آپ مہدی حسن(۱) ("افادات مہدی")(۲) کے نقش قدم پر نہ چل سکیں گے؟ صرف اتنی گزارش مطلوب تھی' بس والسلام۔

نیاز مند

سید محمد عبداللہ

۱۔ مہدی افادی' مہدی حسن' ولادت گورکھپور ۱۸۶۷ء' وفات لکھنؤ ۱۵۔ نومبر ۱۹۲۱ء۔

۲۔ "افادات مہدی" مرتبہ بیگم مہدی' طبع اول ۱۹۲۳ء' مہدی حسن کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھیے عبدالقوی دسنوی کی کتاب: "مہدی حسن افادی"' طبع اول نسیم بک ڈپو لکھنؤ جنوری ۱۹۷۷ء۔

معین صاحب غلط بحث پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں نے اپنی کتاب کے ص ۱۴۱ پر سات ایسے مصرعوں کی نشاندہی کی تھی جو ناموزوں تھے۔ میں نے دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (پہلا ایڈیشن) کے ص ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۹ اور ۳۱۰ پر مرقوم ان خارج از وزن مصرعوں کا ذکر کیا تھا نہ کہ متن میں جیسا کہ معین صاحب نے تاثر دینے کی کوشش کی ہے (دیکھیے ان کے کتابچے کا ص ۱۸، ۱۹)۔ متن میں یہ مصرعے بلا شبہ صحیح ضبط ہوئے مگر سوال یہ ہے کہ آگے چل کر ناموزوں کیسے ہوگئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں متن سامنے نہیں تھا اور مرتب نے محض حافظے سے کام لیا تھا۔ چونکہ معین صاحب کا حافظہ موزوں شاعری کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے اس کی رہنمائی کے نتیجے میں وہ بے راہ ہو گئے۔[۱] حد یہ ہے کہ اپنے کتابچے کے ص ۲۲ پر معین صاحب نے اپنے پیر و مرشد رشید احمد صدیقی میں بھی اپنا عکس لطیف ملاحظہ کیا ہے اور اپنی طرح انھیں بھی ناموزوں طبع قرار دے ڈالا ہے۔ یہ ہے اپنے پیر و مرشد و مقتدیٰ کی عزت افزائی جسے وہ "میری زمین، میرا آسمان، میرے نگہبان، میری ساری کائنات تھے وہ" (ص ۲۳) کے الفاظ میں یاد فرماتے ہیں۔ اُن کی اس بے دردانہ روش کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مشرف احمد نے بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں:

---

[۱] ڈاکٹر گیان چند جین نے ذرا ہلکے انداز میں میرے موقف کی حمایت میں یہی بات کہی ہے:
"انھوں (تحسین فراقی) نے مرتب کے ناموزوں طبع ہونے کے بارے میں ص ۳۹، ۴۰ کے فٹ نوٹ میں جو دو مثالیں دی ہیں اگر ان میں سہوِ کتابت کا دخل نہیں تو معترض کا دعویٰ ثابت کرتی ہیں۔ ص ۴۰ سے ص ۴۲ تک دیوان میں ناموزوں مصرعوں کی جو فہرست دی ہے ان میں سے بیشتر کا تعلق آدھے قاف یا ہمزہ یا آخری نون کے نقطے سے ہے جو کتابت و طباعت کی غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذیل کے مصرعے یقیناً غیر موزوں ہیں: محرم نہیں تو ہی نوا ہائے راز کا ص ۳۰۶، بھلتے ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے، ص ۳۰۹، ہاں یہ نو ہم سنیں اس کا نام، ص ۳۱۰ بچوں کا بھی نہ دیکھا تماشا کوئی دن اور ص ۳۱۶" — ہماری زبان دہلی ۱۵ تا ۲۱ دسمبر ۲۰۰۰ء ص ۲۔

"رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین ہوں یا علمی، ہر جگہ آپ کو موزوں اشعار ملیں گے۔ رشید صاحب کے دسیوں شاگردوں کو ہم جانتے ہیں۔ کسی نے آج تک ان میں یہ عیب نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے رشید صاحب نے یہ بات (اپنے ناموزوں طبع ہونے کی) بہ طور تفنن کے کبھی کہی ہو جسے ناموزوں طبع افراد نے گرہ میں باندھ لیا ہو۔ کراچی میں علی گڑھ کے ایک ان پڑھ شاعر استاد عمر فاروقی رہا کرتے تھے۔ انھوں نے مشہور داستان "کلیلہ و دمنہ" کا نام سنا اور ایک دن رشید صاحب سے جا کر پوچھا کہ "کلیلہ دو مُنہ" کا کیا ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے کہا کہ حاضرینِ محفل آجائیں تو اس کے معنی بتاؤں گا۔ اس کے بعد وہ اکثر اس داستان کو "کلیلہ دو مُنہ کا" ہی کہا کرتے تھے۔ اب اگر ان کا کوئی شاگرد یہ کہے کہ اس کا درست نام وہی ہے جو رشید بتایا کرتے تھے تو اس سے شاگرد کی عقیدت مندی تو ظاہر ہوگی مگر نام غلط ہی رہے گا۔ خواجہ منظور حسین نے کلاسیکی روسی افسانوں کے اردو میں تراجم کیے تھے۔ اس کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ تراجم انھوں نے اردو زبان میں اپنی مشق اور استعداد بڑھانے کی غرض سے کیے ہیں۔ کیا آج کوئی کج فہم شخص ان کے انکسار کو یہ معنی پہنا سکتا ہے کہ انھیں اردو نہیں آتی تھی؟[1]

معین صاحب نے اپنے کتابچے میں میرے بعض اقتباسات حسبِ عادت قطع و برید کے ساتھ نقل کر کے غلط تاثر پیدا کرنا چاہا۔ میں نے اپنی کتاب کے ص ۵۲ پر "چشم ر دستی" کی ترکیب کے مبیّنہ غلط معنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

---

[1] "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ کا تنازعہ" (کالم) مطبوعہ روزنامہ "ایکسپریس" کراچی، ۶ر جون ۲۰۰۰ء

"فارسی متن میں" چشمِ ردِ شنی " کی جو ترکیب استعمال ہوئی ہے اس کے معانی کی تفہیم نہ ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں درست ہے نہ ظہورالدین احمد کے یہاں، نہ اعظم علوی کے یہاں اور نہ احمد سعید انصاری ہی کے یہاں۔ جابر علی سید نے بھی اس کا مفہوم غلط سمجھا۔"

معین صاحب نے اِس اقتباس میں تحریف کرتے ہوئے یہ تاثر دینا چاہا گویا میں نے فارسی دیباچے کے اُن اُردو تراجم کو جو ڈاکٹر نذیر احمد، ظہورالدین احمد، اعظم علوی، احمد سعید انصاری اور جابر علی سید نے کیے تھے۔ کلیتہً غلط قرار دے ڈالا۔ حالانکہ میں نے ان تمام تراجم کی اپنی اپنی خوبیوں کا اِعتراف کیا تھا۔ معین صاحب کا محرف اقتباس ملاحظہ فرمائیں اور ان کے "حسنِ نیت" کا اندازہ کریں:

"فارسی متن . . . . . کے معنی کی تفہیم نہ ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں درست ہے نہ (ڈاکٹر) ظہورالدین احمد کے یہاں، نہ اعظم علوی کے یہاں اور نہ احمد سعید انصاری ہی کے یہاں۔ جابر علی سید نے بھی اس کا مفہوم غلط سمجھا اور (غلط) ترجمہ کیا۔"[1]

اسی طرح اپنے کتابچے کے ص ۲۴ پر ایک (بدونِ نقاط کی بحث) کے باب میں بھی میرے اقتباسات میں تحریف کی گئی۔ تقابل کے لیے میری کتاب کا ص ۱۹، ۲۰ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ تحریف درتادیل بدقسمتی سے معین صاحب کی شخصیت کا جُزدِ لاینفک بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس باب میں صرف میرے اِقتباسات کے ساتھ ہی یہ سلوک روا نہیں رکھا، مرحوم سید قدرت نقوی کے اِقتباسات کو بھی تحریف کی کُند چھُری سے ذبح کیا ہے۔ مرحوم نقوی صاحب نے دیوانِ غالب کے نسخۂ لاہور پر پڑنے والی متعدد اُفتادوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کتابچے میں ایک جگہ لکھا تھا:

---

[1] . . . . "صحیح صورتِ حال"، ص ۱۹

"اِس نسخہ پر کئی اُفتادیں پڑیں۔ پہلی اُفتاد اس کی پیش کش کے سلسلے میں واقع ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ خطوطِ غالب (فارسی و اُردو) میں موجود ہے۔ دُوسری اُفتاد جے پور میں تقسیمِ ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ ریاست جے پور سے کوئی اُڑا لایا اور پنجاب یونیورسٹی کو بیچ دیا۔[1] تیسری اُفتاد: لائبریری سے کسی نے کسی طرح اُڑا لیا جو شُدہ شُدہ مُعین الرحمٰن کے ہاتھ آیا۔ یہ مسروقہ نسخہ اب مقبوضہ معین الرحمٰن ہے جسے انھوں نے نسخۂ خواجہ" کے نام سے چھاپ کر اس کی بازیافت کی۔ طباعت اور پیش کش اچھی ہے۔[2]

مُعین صاحب نے اپنی کتاب "بر سبیلِ غالب" میں دو جگہ اِس اقتباس میں تحریف کی ہے۔ یہ تحریف "میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو تھو" کی ایک عبرت ناک مثال ہے۔ معین صاحب نے قدرت نقوی کی ذکر کردہ پہلی اُفتاد کو گول کر دیا جس میں مرحوم نے دلائلِ قاطع سے ثابت کر دیا تھا کہ دیوانِ غالب کا زیرِ بحث نسخۂ لاہور اصل میں مہاراجہ جے پور کو پیش کرنے کے لیے غالب نے بصرفِ زرِ کثیر تیار کرایا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی منقش لوح کے تعویذ یا چھوٹی محراب اور اس کی تحتی پٹی میں کوئی متبرک کلمہ نہیں اور یہ واحد نسخہ تھا جو کسی ہندو راجہ کو پیش کرنے کی غرض سے تیار کرایا گیا تھا۔ چونکہ اس دلیل سے مُعین الرحمٰن کی ایک سے زیادہ نقلوں اور نسخوں والی دلیل کی کوئی حیثیت نہیں رہتی تھی اس لیے پہلی اُفتاد کا ذکر گول کر کے دُوسری اُفتاد کو پہلی اُفتاد قرار دیا گیا۔ پھر اس نسخے کے مسروقہ اور مقبوضۂ معین الرحمٰن ہونے کا ذِکر حذف کیا گیا۔ "طباعت اور پیش کش اچھی ہے" والے جملے کو رہنے دیا گیا کہ مرتّب کی تعریف میں تھا۔ یہ ہے معین الرحمٰن صاحب کی علمی

---

[1] ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اکرام کی تحقیق کے مطابق یہ نادر قلمی مخطوطہ ڈاکٹر تیموری سے ۱۹۵۲ء میں ایک سو روپے میں خرید کر پنجاب لائبریری میں محفوظ کیا گیا تھا۔

[2] "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ"، ص ۴۷

دیانت۔ اب ان کا محرف اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس پر واوین کا اہتمام تک معین صاحب نے نہیں کیا۔

"دیوانِ غالب کے اِس نسخے پر کئی اُفتادیں پڑیں۔ پہلی اُفتاد جے پور میں تقسیمِ ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ اسے ریاست جے پور سے کوئی اڑا لایا اور پنجاب یونیورسٹی کو بیچ دیا۔ پھر یونیورسٹی لائبریری سے کسی نے کسی طرح اڑا لیا جو شدہ شدہ معین الرحمٰن کے ہاتھ آیا جسے انھوں نے نسخۂ خواجہ کے نام سے چھاپ کر اس کی بازیافت کی۔ طباعت اور پیش کش اچھی ہے۔"[۱]

یہی اقتباس انہی تحریفات کے ساتھ "بربیلِ غالب" کے ص ۲۱۷ پر بھی درج کیا گیا ہے اور کہیں یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ یہ اقتباس سید قدرت نقوی کی کس تحریر سے لیا گیا ہے۔[۲]

دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ کے مقدمے کی طرح اپنے کتابچے میں بھی معین الرحمٰن نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیوانِ غالب کے کئی قلمی نسخوں کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا ہے۔ اِس نام نہاد قیاس کے پیچھے یہ نیت کارفرما ہے کہ نسخۂ خواجہ کو باقی مزعومہ نسخوں سے الگ اور منفرد قرار دیا جا سکے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیوانِ غالب کے صرف دو خطی نسخے تھے۔ ایک نسخۂ شیرانی جس کا ACC NO: 4894 تھا اور جو اب بھی وہاں موجود ہے اور ۱۹۶۹ء میں اس کا کامل عکس مجلس ترقیِ ادب لاہور شائع کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک اور نسخہ تھا جو ۱۹۶۳ء تک تو وہاں ضرور موجود تھا۔[۳] جب کوئی تیسرا نسخہ تھا ہی نہیں تو معین صاحب آ ہے

۱۔ "بربیلِ غالب"، ص ۱۸۹

۲۔ اِس تحریف کی نشاندہی عارف ثاقب صاحب نے ماہنامہ "سورج" کے فروری ۱۹۹۱ء کے شمارے میں کی ہے۔ ملاحظہ ہوں ص ۲۱-۲۲

۳۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۶۳ء میں ایم اے اُردو کے ایک طالب علم (جاری ہے)

کہاں سے پیدا کریں گے۔ کسی تیسرے نسخے پر اصرار استدلال کے پائے چوبیں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ممتاز محقق ڈاکٹر گیان چند جین نے کس قدر درست لکھا ہے:

"غالب کی زندگی کے دیوان کے مرتبہ نسخے سڑکوں میں بکھرے ہوتے نہیں کہ لائبریری میں دو دو نسخے ہوں اور لائبریری کے کاغذات میں صرف ایک کو چڑھایا گیا ہو۔ ایسا کوئی شخص نہیں جس نے وہاں دو نسخے دیکھے ہوں۔ لائبریری کے Accession رجسٹر میں دیوان کے جتنے نسخے چڑھے ہوں گے، اتنے ہی وہاں رہے ہوں گے۔ اگر صرف ایک نسخہ چڑھا ہے تو دو کے ہونے کا امکان نہیں"[1]

یہ دوسرا نسخہ وہی نسخہ ہے جسے معین صاحب نے نسخۂ خواجہ قرار دیا ہے اور جو اصلاً نسخۂ لاہور ہے اور جس کا Acc. No 6812 ہے۔ خوش قسمتی سے راقم کو دیوانِ غالب کے اس نسخے کے رد ٹوگراف مملوکہ رضا لائبریری رامپور کے ص ۲۱ اور ۲۲ کا عکس مل گیا ہے۔ اس عکس کے دونو صفحات پر یونیورسٹی لائبریری کا Acc. No 6812 صاف پڑھا جاتا ہے۔ صفحہ ۲۱ پر یہ محض نمبر کی صورت میں ہے جبکہ ص ۲۲ پر یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مدوّر مہر کے اندر درج ہے۔ یہی مدوّر مہر دیوانِ غالب کی اوّلین اشاعت (۱۹۹۸ء) کے صفحہ ۲۲ سے، جو یونیورسٹی لائبریری کا سیکرٹ پیج ہے، کھرچ دی گئی تھی اور جس کی نشاندہی میری کتاب کے ص ۲۳ اور ص ۲، پر کی جا چکی ہے معین الرحمٰن صاحب نے یونیورسٹی لائبریری کو یہ مسروقہ نسخہ ۲۱ر اگست ۲۰۰۰ء کو بڑے ڈرامائی انداز میں ہدیے کے طور پر واپس کیا۔ انھوں نے اس پورے نسخے کو

(گزشتہ سے پیوستہ) محمد افضل ملک نے اپنے تحقیقی مقالے "فہرستِ مخطوطاتِ اُردو شاعری" میں اس قلمی دیوان کا اندراج کیا تھا اور اس کا ایکسیشن نمبر 6812 بھی درج کیا تھا۔ نیز دیکھیے: "اُردو مخطوطات کی فہرستیں" (مرتبہ رفاقت علی شاہد) جلد اوّل، ص ۱۹۵ و ص ۲۰۷

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ان کا معرکے کا مقالہ: "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ یا نسخۂ لاہور" مشمولہ ہماری زبان، نئی دہلی شمارہ ۱۵ تا ۲۱ر دسمبر ۲۰۰۰، ص ۲۔

لیمینیٹ کروا کر واپس کیا تاکہ ص ۱۲ پر مندرج ACC. NO 68-2 کے اوپر اور اس صفحے کی پشت پر لگائی گئی چیپیاں اور ص ۱۲۰ یعنی تمت پر مدور مہر کے دو پر شبت نفتے دین کی چیپی کو چھڑا کر اصل صورت حال معلوم نہ ہو جاتے۔ لیکن چونکہ ضمیر کی خلش بھی چین نہیں لینے دیتی اس لیے معین صاحب نے ناچار ڈی لکس ایڈیشن کی اشاعت (۶۲۰۰۰) میں صفحہ ۲۲ پر جہاں چھپلی ہوئی مہر اور ACC. NO کے ساتھ زیریں جدول بھی چھیل دی گئی تھی' اب دوبارہ جدول بنا دی ہے۔ دراصل انھیں جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ، اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ مٹا دوگے۔ اگلے صفحات میں صفحہ ۲۲ کی چھپلی ہوئی جدول، روٹوگراف کے ص ۲۱ اور ص ۲۲ اور ڈی لکس ایڈیشن کے ص ۲۲' ان تینوں کے عکس قارئین کی عبرت اندوزی کے لیے شائع کیے جا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر معین الرحمٰن کا نسخہ سید عبداللہ یا عرشی رامپوری کے بیان کردہ نسخہ لاہور سے الگ کوئی نسخہ تھا تو اس کا ACC. NO بھی نسخہ لاہور سے الگ ہونا چاہیے تھا۔ نیز صفحہ ۲۲ (ورق ۱۱) سے ACC. NO کا پہلے چھیلنا (دزدِ دانامی کشد اوّل چراغِ خانہ را) اور اس کا پہلا ایڈیشن اس چھلے ہوئے ثبوت کے ساتھ شائع کرنا اور اگلے ایڈیشن (ڈی لکس ایڈیشن ۲۰۰۲ء) سے اس چھلی ہوئی مُہر کے باقی ماندہ آثار کو بھی مٹا کر زیریں جدول پھر بنا دینا اس سب میں کیا مصلحت کار فرما ہے ؟ یہی کہ دزد اپنے نقوشِ پا ہٹا دیا کرتے ہیں یا مٹا دینا چاہتے ہیں مگر ایسے نقش مٹانے سے کب مٹتے ہیں ؟ دزدِ حنا ز دست بہ شستن نمی رود۔ کیا سچ کہا تھا میر نے ؎ جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میر ز بس ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے۔ اور کیسی صداقت بیان کی تھی میر سے دو سو سال پہلے شیکسپیر نے جب اس کی لیڈی میکبتھ اپنی کفِ دست پر مقتول کے لہو کے غیر مرئی دھبے دیکھ کر حالتِ کرب میں چلاتی تھی :

" Out damned spot, out, I say! "

معین الرحمٰن اپنے نسخے کو اپنے کتاب خانے کی سب سے قیمتی متاع قرار دیتے ہیں۔ (دیوانِ غالب' نسخہ خواجہ' اوّل ایڈیشن ص ۶' نیز "بر سبیلِ غالب" ص ۱۸۶) دوسری طرف

اپنے کتابچے میں فرماتے ہیں :

"میری حیثیت مالک کی نہیں ، اس کے امین اور محافظ کی سی ہے"۔ (ص ۳۰)
دیکھا آپ نے ، بالآخر معین صاحب کے منہ سے سچی بات نکل ہی گئی ۔ اگر آپ کی حیثیت مالک کی نہیں؛ امین اور محافظ کی ہے تو پھر یہ دیوان آپ کے کتاب خانے کی سب سے قیمتی متاع کیسے قرار پایا ؟ بات یہ ہے کہ معین صاحب نے غالباً کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ یہ نسخہ انھوں نے خریدا ۔ وہ یہی لکھتے ہیں "۱۹۸۱ء کے پس و پیش مجھے آگے پیچھے پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے تین نادر مطبوعہ کتابیں (علم جر ثقیل، علم ہیئت ، فسانۂ عجائب طبع اول) اور دو قیمتی مخطوطے (معارج النبوۃ ، دیوانِ غالب مکتوبہ ما قبل اگست ۱۸۱۶ء) ملے " (دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ، پہلا ایڈیشن ص۵) "دیوانِ غالب مجھے پرانی کتابوں کے کاروباری سے کتابوں کے ڈھیر میں فٹ پاتھ سے ملا" (دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ صحیح صورتِ حال ص۲۸) " یہ نسخہ بچ رہا اور مجھ تک پہنچا" (ایضاً ، ص ۳۰)۔ " ۱۹۸۱ء کے پس و پیش آگے پیچھے لاہور میں پرانی کتابوں کے ایک کاروباری مرکز ، انارکلی کے فٹ پاتھ سے تین نادر مطبوعہ کتابیں اور دو قیمتی مخطوطے ملے ۔ ان میں غالب کے اردو دیوان کا ایک . . . مخطوطہ بھی تھا (دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ڈی لکس ایڈیشن ص۱) " ۱۹۸۱ء کے لگ بھگ مخطوطہ "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ میرے ذخیرے میں آیا" (بر سبیلِ غالب ص۱۶۷) معین صاحب نے ہر جگہ " مجھے ملا" ، " مجھ تک پہنچا" "میرے ذخیرے میں آیا" کے الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلے ایڈیشن کا " ایک کاروباری " ڈی لکس ایڈیشن میں "ایک کاروباری مرکز" میں مبدل ہوگیا ۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ پرانی کتابوں کا یہ کاروباری کون ہے ؟ نئے ایڈیشن میں معین الرحمٰن نے " کاروباری " کا ٹنٹا ہی نہیں پالا ۔ اسے نہایت سہولت سے " کاروباری مرکز " سے بدل کر سرِدست میرے سوال اور اپنے ضمیر کی خلش مٹادی ۔

اوّل تو یہ کہ معین الرحمٰن صاحب کے پاس کون سی سلیمانی ٹوپی ہے جسے پہن کر

وہ پرانی کتابوں اور مخطوطوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ انارکلی بازار کی خاک چھاننے والے خاکسارانِ تحقیق سے آج تک ان کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ غالب کی زندگی کے دیوان کے مرتّع نسخے بقول گیان چند جین سڑکوں میں بکھرے ہوئے نہیں ملتے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہدیہ وہی چیز کی جاتی ہے جو آپ کی ملکیت ہوتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے کسی کی امانت ہدیۃً کسی فرد یا ادارے کی نذر کردی ہو۔ معین صاحب اگر خود کو دیوانِ غالب کا امین اور محافظ قرار دے رہے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بقائمی ہوش و حواس یہ جانتے ہیں کہ یہ نسخہ اُن کا نہیں، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مملوکہ ہے۔ معین الرحمٰن نے ۷ راگست ۱۹۹۹ء کو پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر خالد حمید شیخ کو دیوانِ غالب کا یہ قلمی نسخہ ہدیہ کرنے کی پیش کش کی تھی: "ذرا سی شرط" اور یہ "ضمانت" حاصل کر لینے کے بعد کہ بطور سربراہ جامعہ اس کی حفاظت کا مستقل انتظام کیا جائے گا۔ خالد حمید شیخ نے اس پیش کش کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس پیش کش پر ایک سال سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا تا آنکہ معین صاحب نے نئے وائس چانسلر صاحب کو جن کو اوّل اوّل صحیح صورتِ حال معلوم نہ تھی، یہ نسخہ ۱۲ راگست ۲۰۰۰ء کو بطور ہدیہ laminate کروا کر اور ایک نقرئی بکس میں بند کر کے پیش کر دیا۔ اس موقع پر اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اکرم چودھری بھی موجود تھے جن کے نام معین صاحب نے متعدد مراسلات لکھے تھے جن میں موجودہ وائس چانسلر صاحب کو "ہمارا سرمایہ" اور "ہمارا فخر" کہہ کر اپنے تملق آمیز اسلوب کو راہ دی تھی۔ معین صاحب نے پہلے سے ایک کیمرہ مین کا بھی اہتمام کر رکھا تھا جس نے اس "تاریخی واقعے" کو "کیمرہ بند" کر لیا۔ یہ تصویریں بعد میں اخباروں اور "بر سبیلِ غالب" کی زینت بنیں[ل]۔ سوال یہ ہے

ل یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو اس نسخے کی ڈرامائی پیش کش پر ڈاکٹر اجمل نیازی نے بڑا لطیف تبصرہ کیا: "اس میں اتنی شان و شوکت کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کوئی کسی اغوا شدہ لڑکی کو اس کے باپ کے گھر اس طرح لے جاتا ہے کہ وہ دلھن بنی ہوئی ہو جبکہ اس کے ساتھ دو بچے بھی ہوں۔" روزنامہ "دن" ۲۳ راگست ۲۰۰۰ء

کہ سابق وائس چانسلر کی مسلسل خاموشی کے بعد معین صاحب نے ایک سال سے زیادہ عرصے تک اپنی اس قیمتی متاع اور اس "قومی ورثے" کو کسی اور حکومتی ادارے مثلاً نیشنل لائبریری اسلام آباد یا عجائب گھر لائبریری لاہور کو تفویض کیوں نہ کر دیا ؟ اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ انھیں خوب معلوم تھا کہ یہ کس ادارے کی "متاعِ بُردہ" ہے۔ لہٰذا اُسے اُسی ادارے کو لوٹانا ضروری تھا۔ اِس ضمن میں ایک نہایت اہم سوال رفیق احمد نقش نے اُٹھایا ہے وہ لکھتے ہیں :

> "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معین صاحب کو کیا کوئی ایسی ضمانت فراہم کر دی گئی ہے کہ آئندہ اِس نسخے کی حفاظت کا مستقل اِنتظام ہوگا۔
> اگر ہاں تو معین صاحب نے اپنا سارا ذخیرۂ غالبیات وہاں کیوں نہ "محفوظ" کرا دیا کہ اس سے اِستفادے کا دائرہ وسیع ہو جاتا ؟
> اگر نہیں تو اتنا قیمتی نسخہ ایسی جگہ کیوں جمع کرایا جہاں سے قبل ازیں ..
> ... بقول سیّد معین الرحمٰن دیوانِ غالب کے دیگر مخطوطے غائب ہو چکے ہیں۔ اِن سوالات پر غور کرتے ہوئے ایک ہی قوت دیوانِ غالب کا مخطوطہ جامعہ پنجاب کو واپس کرنے کے پسِ پشت کارفرما نظر آتی ہے اور اِس قوت کو عُرفِ عام میں "ضمیر کی خلش" کہا جاتا ہے ۔
> امجد اسلام امجد نے اپنے ایک شعری مجموعے کی ابتدا میں کسی ستم ظریف کا قول نقل کیا ہے کہ ضمیر آپ کو بُرائیوں سے روک نہیں سکتا البتّہ ان کا مزہ ضرور خراب کر دیتا ہے[1]۔"

رفتہ رفتہ جب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ریٹائرڈ جنرل ارشد محمود کو صحیح صورتِ حال کا علم ہوا تو ان کا ردِّ عمل ایک قومی اخبار روزنامہ "پاکستان" میں بایں الفاظ سامنے آیا :

---

[1] ملاحظہ ہو نقش کا مضمون مطبوعہ "سُورج" فروری ۲۰۰۱ء، ص ۱۸

"پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹننٹ جنرل (ر) ارشد محمود نے پنجاب کی ادبی تاریخ کے ایک بڑے فراڈ کی تحقیقات کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اُردُو کے صدر ڈاکٹر مُعین الرحمٰن نے دیوانِ غالب کا نسُخۂ لاہور اپنے نام سے "نسخۂ خواجہ" کا نام دے کر (اور) شائع کرا کے نہ صِرف مجھے دھوکا دیا بلکہ علم و اَدب کے ساتھ بھی بے وفائی کی وہ پیر اور منگل کی درمیانی شب کو گورنر ہاؤس میں ایک عشائیے کے موقعے پر روزنامہ پاکستان سے گفتگو کر رہے تھے۔ وائس چانسلر نے کہا ڈاکٹر مُعین الرحمٰن نے مذکورہ نسخہ یہ کہہ کر میرے حوالے کیا تھا کہ یہ ان کا دریافت کردہ مخطوطہ ہے جسے وُہ پنجاب یونیورسٹی کے لیے عطیہ کر رہے ہیں۔ اِس خاص موقع کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں تو بعض علم دوست حلقوں اور افراد نے میری توجہ اِس جانب مبذول کرائی کہ دیوان کا یہ نُسخہ تو پہلے ہی جامعہ پنجاب کی ملکیت ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہو گیا تھا۔ مَیں نے مذکورہ مخطوطے کا بغور جائزہ لیا تو اس میں واقعی ٹمپرنگ کی گئی تھی۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے نسُخۂ خواجہ کے نام سے غالب کا نایاب دیوان شائع کر کے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ مخطوُطہ انھیں برسوں پہلے ایک کباڑیے کی دُکان سے ملا تھا لیکن بعض محققین کے انکشاف پر وہ پریشان ہو گئے اور انھوں نے نسخہ بطور عطیہ جامعہ پنجاب کی لائبریری کے لیے وائس چانسلر کو دے دیا۔ یہ اَمر قابلِ ذکر ہے کہ چند سال پہلے بھارت کے معروف غالب شناس پرتھوی چندؔ[1] کی تالیف "جاگیرِ غالب" بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے نام سے شائع کر دی تھی۔"[2]

---

[1] صحیح نام پرتھوی چندر ہے

[2] روزنامہ "پاکستان"، لاہور، ۱۷ جنوری ۲۰۰۱ء

اپنے کتابچے کے ص ۲۰ پر "معارج النبوۃ" (مُلا معین الدین فراہی) کے ذکر میں معین الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ اِس باب میں ت۔ ف (معین صاحب نے اپنے کتابچے میں مجھے کم و بیش ہر جگہ ت۔ ف لکھا ہے) کی معلومات محدود، ناقص یا نا تمام ہیں۔ ایسی صورت میں کامل اور شافی معلومات کا بہم پہنچانا معین صاحب کا فرض تھا مگر افسوس ان سے میری معروضات کا کوئی جواب بن نہ پڑا اور وہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے۔

میں نے اپنی کتاب کے ص ۳۹ پر لکھا تھا:

"معین صاحب کی یہ بے خبری نہایت قابلِ افسوس ہے۔ اِس بے خبری کا نتیجہ ہے کہ وُہ نثر کی مُقفّیٰ عبارات کو منظوم عبارات سمجھ بیٹھے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ کسی شعری مخطوطے کی تدوین کرنے وُہ شخص جا رہا ہے جو نثر اور شعر میں اِمتیاز کرنے سے قاصر ہے؟"

اِس اعتراض کے جواب میں معین صاحب نے اپنے کتابچے میں یہ مضحکہ خیز وضاحت کی:

"اِس عبارت میں" نیم "کا لفظ کتابت سے رہ گیا ہے"[1]

قارئین! یہ بیچارہ کاتب دُنیا کی مظلوم ترین مخلوق ہے۔ اپنی ہر نام نہاد غلطی کاتب کے سر مڑھ دی جاتی ہے۔ یہ شعر کیسا برمحل ہے ؎

ہر ورق پر ہے میرے کی اصلاح۔ لوگ کہتے ہیں سہوِ کاتب ہے

اب اگر معین صاحب سے پوچھا جائے کہ "نیم منظوم" کس چڑیا کا نام ہے تو انھیں کہتے ہی بنے گی "عنقا کا!!" اِس ضمن میں گیان چند جین کا نقل کردہ قاضی عبدالوُدُود کا ارشاد بے محل نہ ہو گا۔ گیان چند لکھتے ہیں:

"معین الرحمٰن نے اپنے جوابی کتابچے میں توجیہ پیش کی ہے کہ وہ نیم منظوم لکھنا چاہتے تھے مگر" نیم "چھُوٹ گیا (ص ۴۰-۴۱)۔ قاضی عبدالوُدُود

---

[1] ..... "صحیح صُورتِ حال"، ص ۲۱

نے ایک اصول قائم کیا ہے: "کبھی کسی بات کی خواہ اپنی ہو یا کسی دوسرے کی، غلط تاویل نہ کی جاتے۔ اپنی غلطی کی خواہ مخواہ تخفیف کی کوشش فائدہ مند نہیں"[1]

مَیں نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ تحقیقی و تمدینی معاملات میں معین الرحمٰن کی شہرت اچھی نہیں اور اِس ضمن میں مَیں نے رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑنے اور بُشریٰ باسط کے مقالے کے بیشتر حصے اور پرتھوی چندر کی تالیف "جاگیرِ غالب" کی اپنے نام سے اشاعت کی مثالیں دی تھیں۔ بدقسمتی سے معین صاحب نے اِن تین امور کی جو تاویلیں کی ہیں وہ بھی قاضی عبدالودود کے بقول "اپنی غلطیوں کی خواہ مخواہ تخفیف" کی ذیل میں آتی ہیں۔ وہ انھیں ناگوار اور بے بُنیاد امور قرار دیتے ہیں جو ان سے منسوب کیے گئے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر تیار کرنے پر انھوں نے یہ مضحکہ خیز تاویل کی ہے کہ چونکہ انھوں نے رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی کو ریزہ ریزہ تشکیل دیا تھا اِس لیے اس کی مناسبت سے انھوں نے رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی تیار کی جس پر انھیں قریب اور دُور کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی داد ملی (ص ۵)۔ یہی بات انھوں نے "بر سبیلِ غالب" میں لکھی ہے (ص ۹۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ رشید صاحب کی آپ بیتی کو ریزہ ریزہ تشکیل دینے کے ساتھ یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ان کی تصویر سے اپنی تصویر جوڑ کر جعل سازی کی جائے۔ قارئین! آپ کو یاد ہوگا کہ معین صاحب سے برسوں پہلے نثار احمد فاروقی نے غالب کی تحریروں سے اسی طرح غالب کی آپ بیتی ریزہ ریزہ تشکیل دی تھی تو کیا وُہ بھی غالب کے ساتھ اپنی تصویر تیار کرتے؟ دُوسری بات یہ کہ جب از رہِ عقیدت و محبت اور آپ بیتی کی رعایت کے پیشِ نظر آپ نے یہ تصویر بنائی یا بنوائی تو کیا آپ بیتی کے دیباچے میں آپ نے اس کی وضاحت کی یا بعد ازاں جب

---

[1] "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ لاہور" مشمولہ "ہماری زبان" ۱۵ تا ۲۱ دسمبر ۲۰۰۰ء ص ۲

یہی تصویر آپ نے "جدید اُردو غزل" کے پس وَرق پر شائع فرمائی تو کیا کتاب کے دیباچے میں اس کی توضیح کی ؟ آپ نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا۔ ہاں بیین دیسار سے اعتراضات ہونے کے بعد آپ نے اس کی بے مغز تادیل آرائی شروع کی۔ اس "صناعی و طباعی" اور "اپج" (یہ معین صاحب کے اپنے الفاظ ہیں) پر جن خوش ذوق بزرگوں اور دوستوں سے آپ نے داد پائی، ان کے نام اور ان کے ارشادات ضبطِ تحریر میں لانا آپ کو کیوں یاد نہ رہا جبکہ آپ اپنی تعریف و توصیف میں لکھا گیا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف محفوظ فرمالیتے ہیں اور تسلسل اور تواتر کے ساتھ اُنھیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ ڈھٹائی اور ذہنی دیوالیہ پن کی علامت ہے کہ اپنے جہل و جُرم کو صواب بنا کر پیش کیا جائے۔

میں نے لکھا تھا کہ معین صاحب نے اپنی شاگرد بُشریٰ باسط کے ایم اے اُردو کے مقالے "ادا جعفری۔ شخصیت اور شاعری" کا بیشتر حصّہ "نقوش" کے شمارہ ۱۳۹ میں اپنے نام سے شائع کیا تھا اس پر موصوف نے ایک طویل بے تکی داستان تصنیف فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مقالہ خُود انھوں نے بُشریٰ باسط کو لکھ کر دیا تھا تاکہ اسے ایم اے کی ڈگری مِل جائے۔ اگر یہ بات درست ہے تو یہ اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا کسی اور کا اِمتحانی پرچہ حل کرنا۔ یونیورسٹی حکام کا فرض ہے کہ وہ اِس کھلے اور واضح اعترافِ جُرم کے بعد اس کے مرتکب کے خلاف قانونی و تادیبی کارروائی کریں۔

رفیق احمد نقش نے اِس مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہُوئے لکھا ہے :

"اپنی شاگرد کی تحریروں کو سرقہ کرنے کے الزام کا جواب دیتے ہُوئے معین صاحب نے ایک جُرم کا اِعتراف کیا ہے کہ دراصل مذکورہ طالبہ کے مقالے کے لیے یہ تحریریں انھوں نے خُود لکھ کر دی تھیں تاکہ طالبہ جلد از جلد امریکہ جاکر اپنی بیمار والدہ سے مِل سکے . . . . واضح رہے کہ ایم اے کی ڈگری کے لیے مقالہ ۲۰۰ نمبر کا ہوتا ہے اور ملکی قوانین کے تحت اِمتحانات میں اُمیدوار کی اعانت قابلِ دست اندازیِ پولیس جُرم ہے۔ معین صاحب کہتے ہیں " اگر کسی نہ کسی طور پر ان کا تھیسس

مکمل نہ ہو پاتا تو وہ ایم اے کے دوسرے سالانہ امتحان میں شرکت کے لیے پاکستان نہ آپاتیں اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل میں والدہ سے دور، تین برس کی طویل مدت گزارنے کے بعد صرف بی اے کی بی اے رہ جاتیں۔"

"گویا اگر کوئی طالب علم کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو انسانی ہمدردی کے تحت اس کی جگہ امتحان دیا جا سکتا ہے . . . . افسوس کہ ہمارے ملکی قوانین انسانی ہمدردی کے اس عظیم فعل کو نظرِ استحسان سے نہیں دیکھتے۔[1]"

رہا "جاگیرِ غالب" (پرتھوی چندر) کو اپنے نام سے شائع کرنے کا مسئلہ، تو یہاں بھی، ان کا طرزِ استدلال اتنا بودا ہے کہ ہنسی آتی ہے۔ دوسروں کے اقتباسات سے کتابچے کا شکمِ تنگ بھرنے کے بجائے معین صاحب کو اس بات کا جواب دینا چاہیے تھا کہ اگر آپ صرف ترتیبِ نو کے ذمہ دار ہیں تو صفحۂ اوّل پر بطور مؤلف پرتھوی چندر کا نام کیوں درج نہ کیا گیا آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دُکھ بھریں بی فاختہ اور کوّا میوہ کھاتے۔ رہا یہ سوال کہ "جاگیرِ غالب" کی اس ترتیبِ نو کا معیار کیا ہے تو اس ضمن میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا موقف یہ ہے کہ معین صاحب کی مرتبہ "جاگیرِ غالب" ترتیب کا کوئی ایسا نمونہ نہیں کہ اسے پرتھوی چندر کی تالیف پر اضافہ قرار دیا جا سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جاگیرِ غالب کا پاکستانی ایڈیشن مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اسی نسخے (پرتھوی چندر) کی صدائے بازگشت ہے۔ اور اس میں کوئی تحقیقی یا علمی اضافہ نظر نہیں آتا حتیٰ کہ پرتھوی چندر کے ہاں جو فروگزاشتیں اور اغلاط رہ گئی ہیں، ڈاکٹر صاحب کے مرتبہ ایڈیشن میں بعینہٖ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر "جاگیرِ غالب" میں جو دستاویز

---

[1] ماہنامہ "سورج" فروری ۲۰۰۱ء، ص ۲۰

مکمل شائع ہو گئی تھی، ڈاکٹر معین الرحمٰن نے بھی اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور اس کے بارے میں تبصرہ نہیں کیا۔ پروف خوانی کی اغلاط اور فروگزاشتیں ..... اس اشاعت میں بھی جُوں کی توں موجود ہیں۔"[ل]

یہ ترتیب نو اس اعتبار سے مضحکہ خیز ہے کہ اصل مؤلف کی ترتیب کو اُلٹ دیا گیا ہے۔ یہاں انگریزی عبارتیں پرتھوی چندر کی ترتیب کے برعکس دائیں سے بائیں کو چلتی ہیں۔ پھر یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس کے مختلف صفحوں پر دو الگ الگ انتساب ہیں۔ ص ۹ پر انتساب جمیل الدین عالی کے نام ہے اور ص ۵۲ پر آنجہانی پرتھوی چندر کے بیٹے دید پرکاش کے نام۔ معین الرحمٰن صاحب نے باپ بیٹے دونوں کو ایک آنکھ سے دیکھا ہے، ایک سے کتاب چھپنی، دوسرے سے انتساب، فاعتبروا یا اُولی الالباب۔

کچھ ذکر "بر سبیلِ غالب" کا

کتاب پر سالِ اشاعت ستمبر ۲۰۰۰ء درج ہے لیکن یہ تب سے اب تک مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔ کتاب پر مرتب کے طور پر مُعین الرحمٰن کے صاحبزادے وقار معین کا نام درج ہے جنھوں نے مسرت اور تشکر کے ساتھ یہ اعلان فرمایا ہے کہ اس کتاب کا اوّلیں حصہ سُورج کے غالب نمبر میں شائع ہونے والی لطیف الزماں خاں کی تحریروں کا جواب ہے جو انھیں اپنے والد کے "کتب خانے میں علی الحساب مُنتشر کاغذات کے انبار میں سے" دستیاب ہُوا اور جو معین الرحمٰن صاحب نے ۱۹۹۷ء میں لکھا تھا۔ یہ کیسا حُسنِ اتفاق

ل "غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر اُمور"، مُقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۱۴۳۔ "جاگیرِ غالب" مرتبہ معین الرحمٰن پر تفصیلی محاکمہ کے لیے ملاحظہ کیجیے لطیف الزمان خاں کی تحریریں مشمولہ "سُورج" غالب نمبر، ۱۹۹۶ء

ہے کہ معین صاحب کو انارکلی کے فٹ پاتھ پر کتابوں کے انبار سے "دیوانِ غالب" کا مخطوطہ ملا اور بیٹھے کو منتشر کاغذات کے انبار سے "بر سبیلِ غالب" کے لیے مواد دستیاب ہوا۔ وقار معین نے دستیابی کی تاریخ نہیں بتائی البتہ حرفِ چند کے آخر میں ۱۸ر جولائی ۲۰۰۰ء کی تاریخ درج کی ہے۔ ممکن ہے اس تاریخ سے کوئی تین ماہ پہلے یہ مواد انھیں دستیاب ہو گیا ہو اسی لیے معین الرحمٰن صاحب نے اس مواد میں سے کچھ اقتباسات چن کر انھیں میری کتاب کے جواب میں لکھے جانے والے کتابچے میں بھی من و عن سجادیا اور یہ کتابچہ مئی ۲۰۰۰ء میں شائع ہو گیا۔ خوشی ہوئی کہ معین الرحمٰن دوسروں کے اقتباسات ہی سے اپنے مضامین کا پیٹ نہیں بھرتے، اپنے اقتباسات سے بھی اپنے مضامین کو سیراب کرتے رہتے ہیں۔

"بر سبیلِ غالب" کے ابتدائی اوراق میں معین صاحب نے "جاگیرِ غالب" کے قضیے پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

> "کتاب کے سرورق پر بھی اُن (پرتھوی چندر) کا نام ہوتا یا آجاتا تو بہت مناسب ہوتا۔" (ص ۲۴)

سوال یہ ہے کہ حضرت! کتاب کی ترتیب تو آپ فرما رہے تھے یا آپ کا کوئی حواری؟ اگر یہ کارِ خیر آپ ہی کے ہاتھوں انجام پا رہا تھا تو سرورق پر آنجہانی پرتھوی چندر کا نام درج کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟ یہ فتورِ نیت نہیں تو کیا حسنِ نیت ہے؟ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اُردوئے معلیٰ"، "پنج آہنگ" اور "دستنبو" کی بعض اشاعتوں کے سرورق پر "غالب" کا نام بھی تو شائع نہیں ہوا۔ اس طرزِ استدلال پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ موصوف ذکر ترتیب کا کر رہے ہیں اور مثالیں تصنیف کی درج کرتے ہیں "اُردوئے معلیٰ" کے بارے میں ایک دنیا جانتی ہے کہ اس کا مصنف غالب تھا اور یہ ۱۸۶۹ء سے لے کر اب تک متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ یہی معاملہ "پنج آہنگ" اور دستنبو" کا ہے کہ غالب کے ادنیٰ طالب علم بھی ان کے نام سے واقف ہیں جبکہ "جاگیرِ غالب" بقول آپ کے چھپ کے بھی چھپی رہی اور شائع نہ ہو سکی۔ اول تو یہ بات

ہی درست نہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ چھپ کر بھی شائع نہ ہوسکی تو ایسی صورت میں تو اس کے سرورق پر بدرجۂ اولیٰ مرتب یعنی پرتھوی چندر کا نام شائع ہونا چاہیے تھا۔ اعتراض کا محل یہ نہیں کہ اردو دتے معلی، پنج آہنگ اور دستنبو کے سرورقوں پر بالترتیب مرتضیٰ حسین فاضل، محمد عمر مہاجر اور خواجہ احمد فاروقی کے نام بطور مرتب یا مترجم درج ہیں۔ اعتراض تب ہوسکتا تھا کہ کوئی معین الرحمٰن اردو دتے معلی سے مرتضیٰ حسین فاضل کا نام بطور مرتب کھرچ ڈالے اور اس کی جگہ اپنا نام رقم کر دے یا محمد عمر مہاجر یا خواجہ احمد فاروقی کے نام حذف کر کے اپنا اسم وہاں درج کر دے اور اپنے کسی آئندہ کے وضاحتی کتابچے میں ارشاد فرما دے کہ اگر بطور مرتب یا مترجم فلاں فلاں حضرات کے نام بھی سرورق پر ہوتے یا آجاتے تو بہت مناسب ہوتا۔ بریں عقل و دانش ببا ید گریست!

کتاب کے ص ۴۰ پر معین صاحب نے پھر اسی تاویل بارد اور عذرِ لنگ کی تکرار کی ہے جو اس سے پہلے وہ بشریٰ باسط کے مقالے کے باب میں اپنے کتابچے (۔۔۔ صحیح صورتِ حال) میں پیش کر چکے ہیں۔ میں اِس ضمن میں اقبال کا ایک الہامی مصرع، جو لگتا ہے خاص اسی طرح کی صورتِ حال پر چسپاں ہونے کے لیے لکھا گیا تھا، معین صاحب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ع ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل ؟

کیا ستم ہے کہ اسی کتاب میں لطیف الزماں خاں کی اِس بات کی تردید کرنے کے لیے کہ رشید صاحب طلبا کو رعایتی نمبر بہت دیتے تھے، رشید صاحب کا قول بحوالہ "خنداں" درج کرتے ہیں جس کا کلیدی جملہ یہ ہے کہ "یہ ناممکن ہے کہ امتحان کے معاملے میں رُو رعایت یا بے ایمانی کو دخل دوں" اور اپنے انہی پیرو مُرشد رشید احمد صدیقی (جنھیں یہ اپنی کائنات لکھتے تھے) کے اسی قول کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے یہ مرید باصفا "امتحان کے معاملے میں بے ایمانی" کا نہ صرف ایک نیا ریکارڈ قائم کرتے ہوئے اپنی شاگرد کو دوسو نمبر کے مقالے کا بیشتر حصّہ لکھ کر اسے ایم اے اردو کی ڈگری دلواتے ہیں بلکہ اپنے اس فعلِ نامسعود کی افسوس ناک تاویلیں بھی کرتے ہیں!! پھر مزید ستم یہ کرتے ہیں کہ اپنی دی ہوئی خیرات کو کچھ

عرصے بعد اپنے نام سے "نقوش" میں شائع کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مشرف احمدان کے اس فعل پر کس قدر تأسف بھرے لہجے میں لکھتے ہیں:

"اگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کی یہ خیرات دے ہی دی تھی تو اس کے اظہار اور اسے واپس اپنی جیب میں ڈالنے کا کیا جواز ہے؟ اس طرح تو انھوں نے اپنی طالبہ کے بہ حیثیت مصنفہ مستقبل کو تاریک! در مشکوک بنا دیا ہے۔"[۱]

"بر سبیلِ غالب" کے ص ۱۶۲ پر انھوں نے کم و بیش اعتراف کر لیا ہے کہ ان کا مرتبہ نسخۂ خواجہ اور عرشی کا نامزد کردہ "نسخۂ لاہور" ایک ہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نسخۂ خواجہ کے نسخۂ لاہور ہونے کے ضمن میں بڑے قوی دلائل اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں پیش کر چکا ہوں مگر حال ہی میں رامپور سے محفوظ روڈ گراف کے صفحہ ۲۱، ۲۲ (فولیو ۱۱) کی ملنے والی فوٹو اسٹیٹ کے بعد اور ڈاکٹر گیان چند جین کے "ہماری زبان" دہلی کی دو اشاعتوں (۸ تا ۱۴ دسمبر اور ۱۵ تا ۲۱ دسمبر ۲۰۰۰ء) میں شائع شدہ مضمون: "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ لاہور" کے بعد تو اب اس باب میں شک و شبہ کی ذرہ برابر گنجائش نہیں رہتی۔ ذیل میں گیان چند جین کے مقالے سے متعلقہ حصہ درج کیا جا رہا ہے۔ قارئین سے اِس طویل اقتباس کے لیے معذرت:

"ایک ہی کاتب ایک نسخے کی دو نقلیں تیار کرے تو بھی یہ ممکن نہیں کہ دونوں نقلوں کی ہر سطر کا پہلا اور آخری لفظ یکساں آئے۔ یہ تو فوٹو عکس ہی میں ممکن ہے۔ تینوں مبینہ نسخوں کے فوٹو پکار پکار کر اعلان کر رہے ہیں کہ ہم ایک ہی نسخے کا عکس ہیں۔ ان کے تعارف دینے میں ڈاکٹر عبداللہ، عرشی صاحب اور قاضی صاحب تینوں نے بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔ معین کے مبینہ اختلافات کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے رضا لائبریری رامپور کے ڈائریکٹر کو لکھ کر درخواست کی کہ وہ روڈ گراف میں دیکھ کر صحیح

---

[۱] روزنامہ "ایکسپریس"، کراچی، ۸ جون ۲۰۰۰ء

صورتِ حال سے مطلع کریں اور چاہیں تو رامپور کے ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کو بلاکر یہ کام ان کے سپرد کر دیں۔ میرے پاس ڈاکٹر ظہیر کا جواب آگیا ہے۔ معین الرحمٰن نے اپنے کتابچے میں لکھا ہے:

"نسخۂ لاہور میں عرشی صاحب کی شہادت کے مطابق مصرعے کی صورت یہ ہے:
"جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہوگا" جبکہ صحیح ردیف 'ہونا' ہے 'ہوگا' نہیں۔ رامپور میں موجود عکسی نقل کے اِس مقام کو دیکھ لیا جائے کہ یہاں صورت عرشی صاحب کے مشاہدے کے مطابق ہے یا ان سے چُوک ہوئی ہے اگر عکس کی شہادت عرشی صاحب کے مشاہدے کی تائید نہ کرے تو گویا پھر نسخۂ خواجہ کے عین مین نسخۂ لاہور ہونے کے بارے میں بظاہر کوئی اِشتباہ نہیں رہ جاتے گا۔" ص ۲۴

"روٹو گراف دیکھ کر ڈاکٹر ظہیر نے میرے اِستفسارات کا جو جواب دیا ہے میں اس میں نسخۂ خواجہ کا صفحہ نمبر شامل کر کے لکھتا ہوں:

(۱) نسخۂ خواجہ کے ص ۱۱ کی غزل کے تیسرے شعر میں 'مژگاں' کے بعد ردیف 'ہونا' ہی ہے۔ ہوگا نہیں۔ (معلوم نہیں عرشی صاحب نے اِس روٹو گراف میں "ہوگا" کہاں سے پڑھ لیا)

(۲) نسخۂ خواجہ کے ص ۲۲ کی نقل میں روٹو گراف میں مُہر ہے جس پر Accession No. 6812 تحریر ہے۔

(۳) نُسخۂ خواجہ میں صفحہ ۳۳ کی غزل ع لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اَور۔ موجود ہے۔

(۴) وَرق ۲۴ پر (نسخۂ خواجہ ص ۵۰) تین شعروں کی یہ غزل موجود ہے: "دونوں جہان ۔۔۔۔ تکرار کیا کریں۔"

(۵) روٹو گراف میں نسخۂ خواجہ ص ۱۲۳ کی طرح تقریظ کے اُوپر جلی قلم سے "خاتمہ" لکھا ہے۔ تقریظ کی پہلی سطر میں "بفرِ فروغ گستری" ہے۔ دُوسری سطر کے آخر اور تیسری سطر کے شروع میں "خرامِ خامۂ دل رُبا" ہے۔ (قاضی صاحب

نے پہلی سطر میں "فروغ گستری" اور دُوسری میں "خرامِ دل رُبا" غلط نقل کر کے معین الرحمٰن کو دونوں نسخوں کو مختلف لکھنے کا موقع دیا۔)

(۶) نسخے کے اِختتام پر مُہر میں تحریر ہے "نواب یونیورسٹی لائبریری، عربک سیکشن 6812 " جسے ڈاکٹر ظہیر نے "نوآب" پڑھا وہ "پنجاب" ہونا چاہیے معلوم نہیں۔ یہ نسخہ عربک سیکشن میں کیوں داخل کیا گیا۔"[ف]

کیا گیان چند جین کے ان مشاہدات و دلائل کے بعد معین صاحب میں اتنی اخلاقی جُرأت ہے کہ وُہ نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور کو ایک ہی نسخہ ماننے کا اقرار کر لیں؟ مُعین الرحمٰن صاحب کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے کتابچے میں بعض باتوں کی تصدیق ہو جانے کی شرط پر نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور کے عین بین ایک ہونے کو تسلیم کرنے پر تیار نظر آتے ہیں[ف] اور دُوسری طرف وہ اپنے کتابچے کے شائع ہونے کے تین ماہ بعد اپنی کتاب "بر سبیلِ غالب" میں اپنے پاؤں پر پھرتے اور اُلٹی زقند لگاتے نظر آتے ہیں :۔

"قاضی صاحب کے فراہم کردہ مواد اور اطلاعات پر مبنی مولانا امتیاز علی عرشی نے ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اس نسخے کا تین صفحات میں تعارف کرایا (نسخۂ عرشی دیباچہ ۱۹۵۸ء) عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کا مخطوطہ خوُد نہیں دیکھا۔ ان کے بیانات یا مشاہدات ثانوی ماخذ پر مبنی ہیں۔ انھوں نے اسے ضمناً "نسخۂ لاہور" لکھا۔ اس

[ف] "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ لاہور" مشمولہ ہماری زبان، نئی دہلی شمارہ ۸ تا ۱۴ دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۔ ڈاکٹر جین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں تب سے اب تک اُردو، فارسی اور عربی مخطوطات کا ایک ہی شعبہ ہے۔ تب مخطوطات پر مُہر عربک سیکشن ہی کی لگتی تھی۔

[ف] دیکھیے ۔۔۔ "صحیح صُورتِ حال۔" ص ۴۰۔

میں اور نسخۂ خواجہ میں بھی فرق نمایاں ہے۔ اگرچہ مماثلتیں بھی ہیں۔"
آپ نے دیکھا معین صاحب نے کس سہولت کے ساتھ غالبیات کے ممتاز ترین محقق عرشی رامپوری کی تخفیف کر دی۔ ان کے بیانات اور مشاہدات کو ثانوی ماخذ پہ مبنی قرار دیا۔ ان کے خیال میں "نسخۂ لاہور" بھی ضمناً کہا گیا۔ یہ درست کہ عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کا مخطوطہ خود نہیں دیکھا لیکن کیا اس کا روٹوگراف بھی ان کی نظر سے نہیں گزرا اور کیا نسخۂ لاہور پر تین صفحات کا نوٹ بھی روٹوگراف دیکھے بغیر لکھ مارا گیا۔ یہ وہی روٹوگراف ہے جو قاضی عبدالودود نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود زیرِ بحث دیوانِ غالب سے ۱۹۵۷ء میں بنوایا تھا۔ اور جسے بعد ازاں انھوں نے عرشی رامپوری کو تفویض کر دیا تھا۔ یہی روٹوگراف اب رامپور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے جس کے انچارج یہی مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری تھے۔ عجب نگیں ولی اللہ اکبر!!

دلچسپ بات یہ ہے کہ جسے اب معین الرحمٰن "ضمناً" "نسخۂ لاہور" کہہ کر اس کی تخفیف کر رہے ہیں اور اسے "نسخۂ خواجہ" قرار دے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں اپنی کتاب اشاریۂ غالب (۱۹۶۹ء) وہ خود اسے "نسخۂ لاہور" لکھ چکے ہیں اور حاشیے میں اس کے باب میں مزید معلومات کے حصول کے لیے قاری کو ڈاکٹر سید عبداللہ کے اسی مضمون کی طرف راغب فرما رہے ہیں جو جولائی ۱۹۵۷ء میں "ماہِ نو کراچی" میں شائع ہوا تھا اور جس کے حوالے سے میں نے اپنی زیرِ نظر کتاب کا آغاز کیا ہے۔ رفیق احمد نقش لکھتے ہیں :

> "واضح رہے کہ "نسخۂ لاہور" امتیاز علی عرشی نے ۱۹۵۸ء میں قرار دیا تھا اور ۱۹۶۹ء میں جب سید معین الرحمٰن نے "اشاریۂ غالب" شائع کیا تو عرشی صاحب (بتوسط قاضی عبدالودود) اور سید عبداللہ کے متعارف نسخوں کو ایک ہی نسخہ مانا ہے۔ اشاریۂ غالب میں دیوانِ غالب اردو کے

لے "بر سبیلِ غالب"، ص ۱۶۶، ۱۶۷

اہم خطی اور مطبوعہ نسخوں کا تاریخ وار اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے نویں نمبر پر نسخۂ لاہور ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء کو رکھا ہے۔ . . . نسخۂ لاہور کو "نسخۂ خواجہ" بننے تک کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک عبرت ناک داستان ہے۔[۱]"

"نسخۂ خواجہ" کے "نسخۂ لاہور" ہونے کی ایک نہایت مسکت دلیل ممتاز غالب شناس مرحوم سید قدرت نقوی نے اپنے کتابچے میں یہ دی ہے:

"اگر غالب نے معین الرحمٰن کے احساس کے مطابق کئی نسخے لکھوائے تھے تو وہ کسے کسے نذر کیے۔ معلوم حد تک تو صرف ایک نسخہ لکھوانے کا ذکر خطوط میں ہے اور وہ صرف مہاراجہ جے پور کی نذر کرنے کی خاطر نہایت اہتمام سے منقش و مزین مع عمدہ جزدان پیش کرنے کا تذکرہ خطوط میں پایا جاتا ہے اور اس کی تیاری میں معقول رقم صرف کی گئی۔ یہ کئی (نسخوں) والی بات صرف اپنے مقبوضہ و مدوّنہ نسخہ کی اہمیت جتانے کی خاطر ہے ورنہ معین الرحمٰن کئی ہونے کا ثبوت داخلی و خارجی ذرائع سے پیش کریں۔ صرف احساس و قیاس سے کام نہیں چلے گا۔ خارجی ذرائع یعنی غالب کے فارسی و اردو خطوط صرف ایک نسخہ کے لکھوانے کی شہادت مہیا کرتے ہیں اور وہ مہاراجہ جے پور کو نذر کیا جانے والا نسخہ ہے۔ داخلی شہادت نسخہ کی لوح میں کسی متبرک لفظ یا جملے کا نہ لکھا جانا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے کسی متبرک لفظ یا جملے کا لکھوانا اس لیے مناسب خیال نہیں کیا کہ وہ یہ نسخہ ایک غیر مسلم کو بطور نذرانہ پیش کر رہے تھے . . . . سید عبداللہ نے اس کا تعارف مضمون لکھ کر کرایا۔ قاضی عبدالودود نے اس نسخہ کے عکس ۱۹۵۷ء میں لاہور میں حاصل کیے۔ یہ عکس یقیناً سید عبداللہ کی نشاندہی اور تعاون سے

---

[۱] "سورج"، فروری ۲۰۰۱ء، ص ۱۶

حاصل کیے گئے ہوں گے۔ بھارت پہنچ کر یہ عکس مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو بھیج دیے۔ انھوں نے نسخۂ لاہور کے نام سے اس کا تعارف اپنے مدوّنہ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) کے مقدمہ میں کر دیا۔ قاضی عبدالودود نے ۱۹۵۸ء میں ایک مضمون لکھا۔ مولانا عرشی نے بھی اسی سن (کذا) میں مقدمۂ دیوان میں تعارف لکھا اور قاضی عبدالودود کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے نسخۂ شیرانی اور اس نسخہ کے عکس دیے۔ اِس طرح اِس نسخۂ لاہور کے تین گواہوں کی گواہیاں موجود ہیں۔ لوح اور ص ۲ الف کا عکس سید عبداللہ نے شائع کرایا تھا۔ اس کو جب مرحوم نسخۂ خواجہ کے عکس سے ملایا تو بالکل مطابق پایا۔ سرِ مو تفاوت نظر نہیں آیا۔ عین مین دونو ایک ہیں[1]۔"

رہا دیوانِ غالب کے نسخۂ لاہور (نسخۂ پنجاب یونیورسٹی) کو "نسخۂ خواجہ" کہنے پر معین الرحمٰن کا اصرار تو برِ عظیم کے چوٹی کے محققین نے اس پر ناپسندیدگی یا اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ سید قدرت نقوی کا کہنا ہے:

"خواجہ منظور حسین نہ اس کے مالک تھے کہ بوجہِ ملکیت اس کے نام سے منسوب ہوں جیسے حافظ محمود شیرانی کی ملکیت ہونے کی وجہ سے نسخۂ شیرانی مشہور ہے اور نہ یہ مرحوم کا مدوّنہ ہے جیسے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مدوّنہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کہلاتا ہے۔ عقیدت کا اظہار بذریعہ اِنتساب کیا جاتا ہے۔ مرحوم کے نام سے موسوم کرنا تو مرحوم کی مدح بالذم ہے۔ وہ ان کے نام معنون کر سکتے تھے جس کا اظہار انھوں نے "میرے کرم فرما" کے زیرِ عنوان منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ کیا ہے۔ کیا معین الرحمٰن "منسوب"

---

[1] دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ، ص ۴۴ - ۴۶

اور "موسوم" کے فرق کو نہیں جانتے ؟ کتنی عجیب بات ہے جس کے نام سے موسوم کیا جائے، اسی کے نام سے منسوب بھی کیا جائے۔[۱]
جناب رشید حسن خاں نے اپنی تازہ ترین کتاب "املاے غالب" (سالِ اشاعت ۲۰۰۰ء) میں معین الرحمٰن کے مرتبہ نسخہ کو نسخۂ خواجہ کے بجائے نسخۂ لاہور ہی کا نام دیا ہے اور لکھا ہے کہ اسے "نسخۂ خواجہ" کہنے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا۔[۲]
رشید حسن خاں کے متذکرہ قول کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر گیان چند جین نے بڑے پتے کی بات کہی ہے :

"میری پختہ رائے یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کا جواز نہیں بلکہ یہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ اس نسخے کا خواجہ منظور حسین سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے شاید دیکھا بھی نہیں۔ وہ ماہرِ غالبیات نہیں تھے۔ معین صاحب کی ان سے عقیدت سر آنکھوں پر لیکن وہ اپنے کام کو دوسرے کے نام کیوں کر کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دولت خانے کا نام "خواجہ منظور حسین منزل" رکھ دیں تو اس سے ان کا مکان تلاش کرنے والوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے سوا اور کیا ہوگا۔"[۳]

آگے چل کر انھوں نے معین الرحمٰن کے بار بار نسخۂ خواجہ لکھنے پر زچ ہو کر اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے مضحک پہلو کی نشاندہی کی ہے :

"وہ جو بار بار مخطوطے کو نسخۂ خواجہ کہتے ہیں اس سے مجھے دھچکا لگا ہے (ص ۱۵، ۲۰، ۳۱۶، ۳۲۲ وغیرہ) مثلاً لکھتے ہیں نسخۂ خواجہ میں غالب کے اپنے قلم سے جو ترمیم یا تنسیخ ہوتی ہے (ص ۲۰)۔ غالب نے خواب میں

۱۔ دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ، ص ۷۴۔
۲۔ املاے غالب، (غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی)، ص ۲۶
۳۔ دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ یا نسخۂ لاہور،" ہماری زبان نئی دہلی، شمارہ ۱۵ تا ۲۱ر دسمبر ۲۰۰۰، ص ۲

بھی نہ سوچا ہو گا کہ وہ جس نسخے میں تصحیح کر رہے ہیں وُہ نسخۂ غالب نہیں، نسخۂ خواجہ ہے۔ کون سا خواجہ۔ خواجہ نظام الدین اولیا۔ یا خواجہ میر دردؔ؟"[1]

یہاں ایک اَمر کی طرف توجہ دلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ معین الرحمٰن صاحب نے اپنی تالیف "غالب کا علمی سرمایہ" میں غالب کی تصنیف "گلِ رعنا" کے ذکر میں خواجہ محمد حسن کے مملوکہ قلمی نسخۂ گلِ رعنا کو "نسخۂ خواجہ" قرار دیا ہے (ص ۱۴ ۵، ۵۱۵) اور بجا طور پر کہ یہ خواجہ محمد حسن کا مملوکہ تھا۔ ظاہر بات ہے کہ دیوانِ غالب کا نسخۂ لاہور مملوکۂ خواجہ منظور حسین نہ تھا۔ (نہ مملوکۂ معین الرحمٰن کیونکہ معین الرحمٰن تو بقول خُود اس کے امین اور محافظ تھے ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھیے ۔ ۔ ۔ ۔ صحیح صُورتِ حال، ص ۳۰) ایسی صُورت میں اسے نسخۂ خواجہ کہنا اور اس پر اصرار کرنا بے معنی ہے اَور وہ بھی اس صُورت میں کہ اس قلمی دیوان کا حوالہ اب سے تقریباً تیس برس پہلے وہ خُود "نسخۂ لاہور" کے نام سے اپنی کتاب "اشاریۂ غالب" میں دَرج کر چکے ہیں!

اپنے کتابچے اور "بر سبیلِ غالب" میں ایک جگہ معین صاحب نے "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ، اہلِ حقائق" کو خُبث اور بُغض سے بھرا کتابچہ قرار دیا ہے (ص ۱۶۵) اَور کُچھ آگے چل کر لکھا ہے کہ میں (تحسین فراقی) حَسد اور حسرت کا مارا ہوں۔ قبل ازیں اپنے کتابچے ۔ ۔ ۔ صحیح صُورتِ حال" میں میری بعض عِلمی تجاویز کے ضمن میں فرمایا:

"موصُوف نے ان تراجم کے سلسلے میں مُتعدد اصلاحیں تجویز کیں اَور بے طلب بہت سے مشورے بھی ارزانی فرماتے ہیں۔ (ص ۱۹)

سوال یہ ہے کہ اگر میرا کتابچہ آپ کے بقول خبث اور بغض سے بھرا ہے، میں حاسد ہوں اَور فارسی سے اُردو میں "تشکیل دِیے گئے" آپ کے تراجم کے باب

---

[1] "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ یا نسخۂ لاہور"، ہماری زبان، نئی دہلی شمارہ ۱۵ تا ۲۱ دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲

میں میرے بے طلب مشورے آپ کے لیے لائق توجہ نہ تھے تو پھر دیوانِ غالب کے ڈی لکس ایڈیشن (۲۰۰۰ء) میں آپ نے خبث اور بغض سے بھرے اسی کتابچے کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی کم و بیش ساری چھوٹی بڑی تحقیقی اور لسانی غلطیوں کی اصلاح کس خوشی میں کی ہے؟ اس سوال کا جواب اور بہت سے سوالوں کی طرح معین الرحمٰن پر قرض ہے۔ وہ تو معلوم نہیں اس قرض یا فرض سے کب عہدہ برآ ہوں گے۔ آئیے ان کے تازہ ترین کارنامے "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ (ڈی لکس ایڈیشن ۲۰۰۰ء) کا اجمالی ذکر اور میرے علمی اعتراضات کی روشنی میں ان کی جانب سے کی گئی اصلاحوں کی تفصیل گوشواروں کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ڈی لکس ایڈیشن ۲۰۰۰ء

"بر سبیلِ غالب" کی طرح دیوانِ غالب کا ڈی لکس ایڈیشن جس پر اشاعت کا مہینہ اگست اور سال ۲۰۰۰ء درج ہے اور جس کی قیمت : ۱۴۹۰/- روپے رکھی گئی ہے، مارکیٹ میں کہیں دستیاب نہیں۔ میں نے اپنے ایک کرم فرما سے مستعار لے کر اس کے مشمولات پر نظر ڈالی ہے۔ "بر سبیلِ غالب" کی طرح دیوانِ غالب کا ڈی لکس ایڈیشن بھی معین الرحمٰن صاحب نے صرف اپنے احباب کی نذر کیا ہے، اسے تا حال پاکستان میں فروخت کے لیے مارکیٹ نہیں کیا۔ "بر سبیلِ غالب" کا بیشتر حصہ لطیف الزماں خاں کے اعتراضات اور قلیل حصہ میرے بعض اعتراضات کا "جواب" ہے، اس کے بعد اپنی شان میں بعض غیر معروف و کم معروف لکھنے والوں یا بعض کالم نگاروں کی قصیدہ نما تحریریں درج کی ہیں۔ چوں کہ ان تحریروں کے ذریعے خود کو بعض سنگین الزامات سے بری کرنے اور اپنے بہی خواہوں کی نظر میں اپنے تشویش ناک حد سے بگڑتے ہوئے امیج کو بحال کرنا مقصود تھا اس لیے یہ کتاب صرف اپنے بہی خواہوں تک پہنچائی گئی اور مارکیٹ نہیں گئی۔ یوں لگتا ہے جیسے منجدھار میں ڈوبتا ہوا شخص ہات پاؤں مارتے ہوئے اپنے ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ یہ استدلال نہیں ریگستان پر دیوار کھڑی کی

ہے جو اپنے سائے کے سامنے چشم زدن میں سجدہ کرتی نظر آتی ہے۔

دیوانِ غالب کے ڈی لکس ایڈیشن کو پاکستان میں فروخت کے لیے اِس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے معین الرحمٰن کو بذریعہ خط اس کے پہلے ایڈیشن کے بعد کسی مزید ایڈیشن کی اشاعت سے روک دیا تھا۔ چنانچہ قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے معین الرحمٰن صاحب نے درمیانی راہ یہ نکالی کہ اسے چھاپ کر چھپا دیا۔ صرف اپنے خاص خاص احباب کو اس کی رُونمائی سے فیض یاب کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ معین الرحمٰن کو اشتہار اور استتار دونو کا فن خوب آتا ہے۔

معین الرحمٰن نے اپنے کتابچے میں "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ" میں میری نشان دادہ تحقیقی متنی اور ترجمے کی اغلاط کو بنظرِ تحقیر دیکھ کر صرف دو چار اغلاط کو مانا اور ایک خسروانہ شانِ بے نیازی کے ساتھ لکھا کہ کسی اگلی اشاعت میں ان سے فائدہ اٹھاؤں گا حالانکہ انھیں لکھنا چاہیے تھا کہ کسی اگلی اشاعت میں بغیر حوالہ دیے جو میری فطرتِ ثانیہ ہے، "میں" معترض "کے بعض علمی اعتراضات سے فائدہ اٹھاؤں گا چنانچہ ڈی لکس ایڈیشن کے ص ۸ پر ارشاد ہوتا ہے:

"اب نسخۂ خواجہ کی یہ دُوسری اِشاعت مباحث و مطالب میں ضروری ترمیم اور ترقی کے بعد ڈی لکس ایڈیشن کی صُورت میں غالب دستوں کی نذر کی جا رہی ہے"۔

کیا المیہ ہے کہ یہ "ضروری" "ترمیم" اور "ترقی" جن دو مقالوں یعنی "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ ــــ اصل حقائق" اور "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ" (سیّد قدرت نقوی) کے باعث ممکن ہوتی، ان کا کہیں بھول کر بھی اس ایڈیشن میں ذکر نہیں۔ یہ ہے اس "غالب شناس" کی علمی دیانتداری۔

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ کے متن کا ص ۲۲ معین الرحمٰن صاحب کے لیے کابوس بن گیا تھا۔ اِس صفحے پر یونیورسٹی لائبریری کی مُہر اور اس میں درج ایکسشن نمبر 6812 تھا۔ پہلے ایڈیشن (۱۹۹۸ء) کی جدول سے یہ کھُرچ کر کم و بیش مٹا دیا

گیا تھا لیکن چونکہ اِس کوشش میں اقبالؔ کے اِس مصرع کے مصداق کہ "میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ" جدول کا کچھ حصہ بھی چھل گیا تھا اور جعل بزبانِ حال پکار پکار کر اپنا اعلان کر رہا تھا اِس لیے اس سے پہلے کہ کابوس شخصِ بے خبر کو حالتِ صرع تک لے جاتا، شخصِ بے خبر نے بیدار ہو کر آنکھیں ملیں اور جدول کے انحنا کو مستقیم اور برابر کر دیا۔ چنانچہ نئے ڈی لکس ایڈیشن کے ص ۲۲ کی جدول اصل کے مطابق کر دی گئی ہے:

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے!!

میں نے اپنی کتاب میں متن کی نستعلیق قرأت (بازنوشت) کی متعدد غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے معین الرحمٰن کی متنی قرأت کو ناقص قرار دیا تھا۔ میرے اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے ڈی لکس ایڈیشن سے انھوں نے اپنی اِس نستعلیق قرأت کا کانٹا نکال دیا اور صِرف اصل متن کا رنگین عکس شائع کر دیا۔ اِس ڈیڑھ سو سالہ پرانی کتابت کو آج کا قاری کیسے پڑھے گا، یہ مرتّب کا دردِ سر نہیں، قاری کا دردِ جگر ہے۔

میرے نشان دادہ نوّے پچانوے فیصد اعتراضات کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے (مگر بغیر کسی تحریری اعتراف کے) معین الرحمٰن صاحب نے اپنے ڈی لکس ایڈیشن میں "ترمیم و ترقی" کر لی ہے۔ اسے ایک کھلا مگر بے اعلان اعترافِ شکست نہ کہیے تو کیا کہیے! مثلاً میں نے اپنی کتاب میں سوال اُٹھایا تھا کہ معین صاحب کو انارکلی کے کس کاروباری سے مخطوطۂ دیوان ملا تھا معین صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ ڈی لکس ایڈیشن میں "کاروباری" کو "کاروباری مرکز" سے بدل دیا (دیکھیے ص ۱۰) میں نے اعتراض کیا تھا کہ معین الرحمٰن نے قطعات کے عنوانات کو منظوم لکھا ہے حالانکہ وہ نثرِ مقفّیٰ ہیں۔ نئے ایڈیشن سے انھوں نے منظوم فارسی عنوانات والا جملہ حذف کر دیا ہے۔ (دیکھیے ڈی لکس ایڈیشن ص ۱۹) میں نے لکھا تھا کہ "کم و بیش" کی ترکیب مرتّب کے ذہنی خلجان کی آئینہ دار ہے۔ مرتّب نے یہ الزام اپنے سر لینے کے بجائے نئے ایڈیشن سے "کم و بیش" کی ترکیب حذف کر دی۔ (ص ۲۶) میں نے لکھا تھا کہ "معالج

النبوۃ" کا مصنف واعظ الکاشفی نہیں مُلّا معین الدین فراہی ہے۔ اب مقدمے سے ا... کتابوں کے ساتھ "معارج النبوۃ" اور اس کے مُصنّف کا نام خارج کر دیا گیا۔ بے محل نہ ہوگا اگر ذیل میں پہلے ایڈیشن (۱۹۹۸ء) میں راہ پا جانے والی اغلاط اور ڈی لکس ایڈیشن (۲۰۰۰ء) میں میری معروضات کی روشنی میں کی جانے والی اصلاحوں کا ایک تقابلی گوشوارہ قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کر دیا جائے۔ یہ محض چند مثالیں ہیں :

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (نسخۂ لاہور) پہلا ایڈیشن		دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (نسخۂ لاہور) ڈی لکس ایڈیشن ۲۰۰۰ء	
کیوں جانِ عزیز	(ص ۲۹)	کیوں جان عزیز	(ص ۳۱)
اوراق بفروغ گستری	(ص ۳۰)	اوراق بفرِ فروغ گستری	(ص ۳۲)
لختے از سامانِ مجمر گردانی	(ص ۳۲)	لختے از سامانِ مجمرہ گردانی	(ص ۳۵)
رہی نہ طرزِ ستم اور کوئی جاں کیلیے	(ص ۳۴)	رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کیلیے	(ص ۳۷)
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے	(ص ۳۵)	اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے	(ص ۳۸)
۱۳۲۱ھ/۱۸۱۶ء	(ص ۳۷)	۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء	(ص ۴۱)
بزمِ شہنشاہ	(ص ۳۸)	بزمِ شاہنشاہ	(ص ۴۲)
میں اور بزم سے	(ص ۳۸)	میں اور بزمِ مے سے	(ص ۴۲)
کہتے ہو تم	(ص ۳۹)	کہتے تو ہو تم	(ص ۴۳)
پہلے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا	(ص ۳۰۰)	پہنچے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا	(ص ۱۷۷)
لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا	(ص ۳۰۱)	لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا	(ص ۱۷۷)
لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی	(ص ۳۰۳)	لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی	(ص ۱۸۰)
بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرۂ خوں وہ بھی	(ص ۳۰۵)	بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرۂ خوں وہ بھی	(ص ۱۸۲)
محرم نہیں تو ہی نواہائے راز کا	(ص ۳۰۶)	محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا	(ص ۱۸۲)
کہتے ہو تم سب	(ص ۳۰۹)	کہتے تو ہو تم سب	(ص ۱۸۶)

ہاں سرِ نو ہم سُنیں اس کا نام (ص ۳۱۰)	ہاں سرِ نو سُنیں ہم اس کا نام (ص ۱۸۷)
بچّوں کا بھی نہ دیکھا تماشا... (ص ۳۱۶)	بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا... (ص ۱۹۲)
سالِ وفات ۱۸۳۴ء بتایا ہے (ص ۳۲)	سالِ ولادت ۱۸۳۴ء بتایا ہے (ص ۱۹)

"خدا پرستاں! از بہرِ خدا ایں عربی مفہم فارسی مداں نمی پرسم کہ کیست می پرسم کہ چیست" ـــــ قاطعِ برہان ص ۴۹

میں نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ معین الرحمٰن فارسی نہیں جانتے اور ان کے مرتبہ دیوانِ غالب میں فارسی متون کے "تشکیل دیے گئے تراجم" (یہ معین صاحب کے اپنے الفاظ ہیں) کتنی جگہ بڑے ناقص اور کچھ مقامات پر مضحکہ خیز ہیں۔ چنانچہ اب انھوں نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب کے ڈی لکس ایڈیشن میں بغیر حوالے کے میری کم و بیش ساری تجاویز قبول کرلی ہیں۔ مثلاً پہلے ایڈیشن میں ایک جملے کا ترجمہ یوں تھا: "اس آتشِ پارسی کی پاکیزگی مسلّم ہے" (ص ۳۴۰)۔ میری توجہ دلانے پر (دیکھیے... اصل حقائق ص ۱۰۵) انھوں نے اِس جملے میں ترمیم کرکے لکھا ہے: "اِس آتشِ ہندی کی مسلّمہ خاصیت ہے (ڈی لکس ایڈیشن ص ۲۱۶)۔ میں نے "چشمِ روشنی" کے صحیح معانی اور توضیحات اپنی کتاب (دیکھیے ص ۵۲-۵۴) میں درج کی تھیں چنانچہ معین صاحب نے اپنے ڈی لکس ایڈیشن میں ان کی روشنی میں تصحیح کرلی۔ ایک جگہ انھوں نے غالب کی مستعمل ترکیب "بخشی مدفن" کو "مدفن بخشی" کر ڈالا تھا۔ میری نشاندہی پر اب انھوں نے اس کی بھی تصحیح کرلی۔ ذیل میں میرے تجویز کردہ جملے اور ان کی روشنی میں معین الرحمٰن کی ڈی لکس ایڈیشن میں کی گئی ترامیم کا ایک گوشوارہ تقابلی مطالعے کے لیے پیش ہے:

میرا مجوزہ ترجمہ مشمولہ..."اصل حقائق"	ڈی لکس ایڈیشن میں کی گئی تصحیحات
(۱) یہ شاعری (اُردو) کسی طرح اس لائق نہیں کہ اس سے دل پگھلے نہ یہ بزم افروزی کے لیے مناسب خیال کی جا سکتی ہے۔ (....."اصل حقائق" ص ۵۴)	یہ کسی صورت بھی گدازیِ قلب کے لائق نہیں نہ ہی بزم افروزی کے قابل ہے (ص ۲۱۶)
(۲) جستجو میں مگن آرزومند شاعر اس روشن آگ کے حصول کے لیے بے چین ہے جو ہوشنگ کو مبارک باد دینے کے لیے پتھر سے باہر نکل آئی تھی۔ (...اصل حقائق ص ۵۴)	یہ جوئندہ (مرزا غالب) اس آتشِ تابندہ کی تلاش میں بے قرار ہے جو ہوشنگ کو مبارک باد دینے کے لیے پتھر سے نکلی تھی۔ (ص ۲۱۶)
(۳) خس (〃 ص ۵۴)	خس و خاشاک (ص ۲۱۶)
(۴) سخن / شعر کی روشنی (〃 ص ۵۵)	شعر و سخن کی روشنی (ص ۲۱۶)
(۵) اُمید ہے کچھ ہی دنوں میں (〃 ص ۵۵)	ممکن ہے کچھ دنوں تک (ص ۲۱۷)
(۶) جامع دیوان (〃 ص ۵۶)	اس دیوان کے مرتب (ص ۲۱۷)
(۷) وجودِ موہوم اور وجود اعتباری (〃 ص ۵۶)	وجودِ معدوم اور ہستی موہوم (ص ۲۱۷)
(۸) اس کی عاقبت ایسی ہو کہ اسے مدفن بھی نجف میں نصیب ہو جائے (〃 ص ۵۶)	بالآخر نجفِ اشرف میں تربت بھی عطا فرما (ص ۲۱۷)
(۹) دامن کمر تک لے آتی ہے (〃 ص ۵۷)	دامن کمر تک اُٹھا لیا ہے (ص ۲۱۸)
(۱۰) دوات کے خانوادے کا چراغ روشن کرنے والے (〃 ص ۵۷)	دوات کی روشنائی کا چراغ روشن کرنے والے (ص ۲۱۸/۲۱۹)
(۱۱) یعنی ہمارے جیب میں اِک تار بھی نہیں۔ (ص ۲۸)	یعنی ہمارے جیب میں اِک تار بھی نہیں۔ (ص ۲۲۴)

بے محل نہ ہوگا اگر میں عرض کردوں کہ فارسی متن کی قرأت اور اُردو ترجمے میں میری تجویز کردہ تصحیحات کو ڈاکٹر گیان چند جین نے مایۂ فخر قرار دیا ہے[۱]۔

میری نشاندہی پر مرتب نے ڈی لکس ایڈیشن میں فہرستِ اشعار بڑھا دی ہے یہ پہلے ایڈیشن سے غیر حاضر تھی۔ مرتب نے اِس ڈی لکس ایڈیشن میں چند غلطیاں پھر دُہرائی ہیں جن کی میں اپنی کتاب میں نشاندہی کر چکا ہوں مثلاً ڈی لکس ایڈیشن کے ص ۲۷ کے حاشیہ نمبر ۳ میں "خورشید" کے املا کا مسئلہ (دیکھیے میری کتاب ۔ ۔ ۔ ۔ اہل حقائق کا ص ۱۹، ۲۰) ۔ میں نے لکھا تھا کہ صحیح لفظ "مرتبع" نہیں "مرتع" ہے ۔ نئے ایڈیشن میں پھر "مربع" شائع کیا گیا ہے (ص ۳۵) ۔ میری نشاندہی کے باوجود (دیکھیے ص ۴۳) نئے ایڈیشن میں "بفرِ فروغِ گستری" کو "فروغ گستری" لکھا گیا ہے (ص ۳۵) ۔ "تیرہ شبِ سواد" ۔ ۔ ۔ کو پھر "تیرۂ شب سواد" لکھا گیا ہے (دیکھیے ڈی لکس ایڈیشن ص ۳۵) ڈی لکس ایڈیشن کے ص ۳۷ کا حاشیہ نمبر ایک بے معنی ہے اِس لیے کہ صحیح شعر کی نشاندہی بحوالہ سیّد عبداللہ میں نے اپنی کتاب کے ص ۴۰ کے حاشیے میں کر دی تھی۔

ڈی لکس ایڈیشن میں کچھ نئی غلطیاں بھی در آئی ہیں ۔ صفحہ چھے پر "اور غالب پہ مہرباں رکھے" ہونا چاہیے تھا کیونکہ "اور غالب پر مہرباں رکھے" سے ذہن کو دھچکا لگتا ہے ۔ غالب کا صحیح مصرع تو یوں ہے "اور غالب پہ مہرباں رکھیو" ص ۲۱ پر مِصرع : "ہو موج گردِ راہ مرے سر کو دوش ہے" درست نہیں ۔ ص ۳۵ اور ۴۰ پر ترکیب "شعریٔ شعار" "شعریِ شعار" ہوگئی ہے ۔ اس کی تصحیح ضروری ہے ۔

ص ۴۱ پر معین صاحب نے پھر اپنے بے بُنیاد موقف کا اعادہ کیا ہے کہ ان کا نُسخہ عرشی و قاضی عبدالودود کے مخطوطۂ دیوانِ غالب سے بڑی حد تک مماثل اور سید عبداللہ کے متعارفہ مخطوطے سے مماثل مگر اس سے مختلف ہے ۔ زیرِ نظر ایڈیشن

---

[۱] دیکھیے : "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ لاہور"، ہماری زبان، ۱۵ تا ۲۱ ردسمبر سنہ ۲۰۰۰ء، ص ۲۔

میں جو شواہد پیش کیے جا رہے ہیں اس کے بعد معین صاحب اپنے اس بے اصل توقف سے یقیناً دستبردار ہو جائیں گے۔ مالِ مسروقہ وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں جمع کرا چکے اب انھیں کھل کر سچ بول دینا چاہیے۔

جن دنوں میری کتاب . . . ". . . اصل حقائق" کے جواب میں معین الرحمٰن کی . . . . . . "صحیح صورتِ حال" چھپی، مجھے اپنے ایک ممتاز معاصر کا ۵ ارپریل . . . ۲ کا مرقومہ خط ملا جس میں ایک جملہ معین صاحب کے جوابِ دعویٰ کے بارے میں تھا:

"عافیت اسی میں تھی کہ موصوف آپ کے مقالے کو شیرِ مادر کی طرح پی جاتے، انجان بن جاتے تو ان کی رسوائی میں مزید اضافہ نہ ہوتا۔"

خط پڑھ کر میرے ذہن میں کسی فارسی شاعر کا ایک مصرع گونجا: مرغِ عاقل چوں بدام افتد تحمّل بایدش، مگر معاً خیال آیا کہ یہ شرط تو "مرغِ عاقل" کے لیے ہے۔ پھر اکبر کا ایک شعر یاد آیا: ؎ تڑپو گے جتنا جال کے اندر۔ جال گھسے گا کھال کے اندر۔ خیال آیا یہ تو کچھ معین الرحمٰن صاحب کی کتھا کا تمثیلی بیان لگتا ہے۔ اور پھر . . . . پھر "بر سبیلِ غالب" شائع ہوئی جو ان کے بازاری اسلوب کا شاہکار ہے۔ میرا کتابچہ شائع ہونے پر انھی معاصر نے لکھا تھا:

"آپ پر رشک آیا کہ کس علمی شان سے آپ نے موضوع سے انصاف کیا ہے۔"

معین الرحمٰن صاحب نے کس علمی شان سے اپنے موضوع سے انصاف کیا۔ اس کے کچھ نمونے درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

(۱) "خواجہ دا گواہ ڈڈو کا محاورہ ان پر صادق آتا ہے۔ ڈڈو پنجابی میں مینڈک کو کہتے ہیں۔ جو اپنے ٹرّانے کی واحد شہرت رکھتا ہے۔"

. . . . "صحیح صورتِ حال" ص ۱۱

(۲) "ت۔ف کی مناظراتی اور اتہامی مزاج کی نگارش" (" ص ۱۲)

(۳) "انگور بننے سے پہلے منقّیٰ بن جانے کے اس رویّے پر (" ص ۱۹)

(۴) "عالم فاضل" ہونے اور "عقل سے پیدل" ہونے میں بُعد یا بیر کا رشتہ نہیں۔"
... "صحیح صورتِ حال، ص ۵۰
(۵) "کتنے کے باولے پن کو بہادری کا نام کیوں کر دیا جا سکتا ہے"
"برسبیلِ غالب" ص ۱۸
(گویا لطیف الزماں خاں کے آپ پر اعتراضات کتے کے باؤلے پن کے مترادف ہیں)
(۶) "خاکساری برتی جائے تو دُنیا بے وقوف سمجھتی ہے۔ اس لیے یہ زمانہ جوتے مارنے کا ہے"
"ص ۱۲۷"
(۷) "لطیف الزماں خاں کی دریدہ دہنیاں اور دُر فطنیاں بڑی اذیت دہ اور ناقابلِ برداشت ہیں۔ انھیں لگام دینے کی ضرورت ہے .... ملتانی فوجدار کو روکنا اور ٹوکنا چاہیے۔ مغالطے کی پیش رفت اہلِ ملتان کی جانب سے چاہیے کہ یہ ولدّرا اور کوڑا ان کے سر پر نہ رہے۔"
ایضاً، ص ۱۳۳
اسی کتاب میں ایک جگہ لطیف الزماں خاں کو چھوٹے قد اور موٹی عقل کا جھانپلو کہا گیا ہے۔ ایک جگہ "عقل سے پیدل" قرار دیا گیا ہے۔ یہ چند مثالیں "مشتے نمونہ از خروارے" کا مصداق ہیں۔ پوری کتاب اسی سوقیانہ اسلوب کی بساندا ور بدبو سے اَٹی ہے۔ کہاں تک نقل کیا جائے۔ یہ ہے اس شخص کا اسلوبِ تحریر جو اپنے ظاہر میں بڑا نستعلیق نظر آتا ہے۔ سعدی کا یہ شعر کیسا برمحل ہے:

در برابر چو گوسپندِ سلیم
در قفا ہمچو گرگِ مردم در

جی چاہتا ہے اس موقع پر اس نام نہاد غالب شناس کی خدمت میں غالب ہی کا ایک شعر پیش کر دوں:

در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد بلے
ننگ دارد علم از کارے کہ آغا کردہ است

ے "آغا" کی جگہ "سید" بخوبی آسکتا ہے۔

معین الرحمٰن کے اِس دُشنامی اُسلوبِ تحریر کا نوٹس اہلِ علم نے لیا ہے۔ ڈاکٹر مشرف احمد نے لکھا:

"ڈاکٹر معین الرحمٰن نے مخالفوں اور معترضوں کو معاف کرنے اور اعلیٰ ظرفی اختیار کرنے کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے اقتباسات نقل کیے ہیں مگر خود ان کا یہ حال ہے کہ ایک خالص علمی بحث میں وُہ آپے سے باہر ہو گئے ہیں اور اپنے معترض کا پُورا نام لینا بھی اُنھیں ناگوار ہے۔ اور اگر بامرِ مجبوری نام لکھتے بھی ہیں تو اس کے ساتھ ہر جگہ ت۔ ف بھی لکھتے ہیں"۔[۱]

رفیق احمد نقش لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے کتابچے میں علمی وقار قائم رکھا ہے۔ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کا ذکر کرتے ہوئے یا تو ان کا پورا نام لکھا ہے یا 'مُعین صاحب' لکھا ہے۔ معین صاحب نے جوابی کتابچے کے ابتدائی 'حرفے چند' میں صورتِ حال کی مماثلت کا لحاظ روا رکھتے ہوئے ڈاکٹر نثار احمد فارُوقی کی تحریر کا اقتباس دیا ہے: "جس شخص کو دوست سمجھا ہو اس کے خلاف توہین و تحقیر کے الفاظ میرے قلم سے نہیں نکل سکتے۔ . . . " لیکن آگے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس اقتباس میں دیے گئے اصول کی دھجیاں اُڑا کر اخلاقی دیوالیے پن کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مذکورہ جوابی کتابچے میں معین صاحب نے پانچ جگہ تحسین فراقی اور کم از کم پینتیس جگہ ت۔ ف لکھ کر ڈاکٹر تحسین فراقی کا ذکر کیا ہے"[۲]

"بر سبیلِ غالب" کی اشاعت پر ۵ ار دسمبر ۲۰۰۰ء کو ایک معاصر نے میرے نام اپنے مکتوب

---

[۱] روزنامہ ایکسپریس کراچی، ۸ر جون ۲۰۰۰ء

[۲] سورج، فروری ۲۰۰۱ء، ص ۱۷

میں لکھا :

"آپ نے "بر سبیلِ غالب" دیکھی۔ یہ اسی قسم کی کتابیں لکھ سکتا ہے کہ اس کی ذہنی سطح عورتوں کے کوسنوں والی ہے۔ اس میں بھی وہ بضد ہے کہ اس کا مسروقہ نسخہ ڈاکٹر عبداللہ، قاضی عبدالودود اور عرشی صاحب کے نسخوں سے الگ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اِس سے لاعلمی کا اظہار کرتا ہے کہ عرشی صاحب کے سامنے اِس نسخے کا فوٹو اسٹیٹ (روٹوگراف) تھا۔ ایسا شخص دیوانِ غالب تو کیا دیوانِ ناصر زیدی بھی مرتب کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا[1]"

مَیں معین الرحمٰن کے اِس جھلاتے ہوئے اُسلوب اور مُبتذل اور سوقیانہ زبان پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ اصلاً ایک ایسے شخص کا ردِ عمل ہے جو خبطِ عظمت میں مُبتلا ہو۔ رہی سہی کسر اِن تبصرہ نما قصیدوں نے پوری کردی جو معین الرحمٰن صاحب نے بعض اہم لکھنے والوں کو بار بار مجبور کرکے لکھوا لیے اور اپنی شان میں ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرکے اور خود اس پر حاشی لکھ کر اپنے ہی ادارے سے شائع کر دیے۔ بقول رفیق احمد نقش "اہلِ علم کو "نسخۂ خواجہ" کے نسخے بھیج بھیج کر ان سے فوری تاثرات لکھ بھیجنے کا تقاضا کیا۔ ظاہر ہے فوری طور پر تعریف تو ممکن ہے اور بیشتر افراد نے حسنِ طباعت کی بجا طور پر تعریف کی ہے۔ تحقیقی نقائص ظاہر کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اِسی لیے محتاط محققین نے سیّد معین الرحمٰن کے خاطر خواہ تعریف سے کام نہیں لیا۔" جب ان کو ان کے صحیح صحیح مرتبے کا نہ کم نہ بیش احساس دلانے کے لیے آئینہ دکھایا گیا تو وہ شدید صدمے سے دوچار ہوئے۔ یہ سارا خفقانی، اختلاجی اور اعصاب زدگی کا طرزِ عمل اسی آئینہ داری کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ انسان کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ اپنے تانبے کو سونا نہیں بناتا، باتیں کیمیاگری کی کرتا ہے۔ یہی حال معین الرحمٰن صاحب کا ہے :

---

[1] میرے ممتاز معاصر نے معین الرحمٰن صاحب کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے جو مناسب نہیں

نکردہ زر مسِ خود را و بہرِ عرضِ فریب
بہ پیشِ خلق حکایت ز کیمیا گویند (غالبؔ)

مَیں نے دیوانِ غالب (نسخۂ لاہور) مرتبہ معین الرحمٰن پر بڑی نیک نیتی سے علمی اعتراضات[1] اٹھائے تھے۔ للہ الحمد ان میں سے نوّے پچانوے فیصد اعتراضات معین الرحمٰن صاحب کو قبول کرتے ہی بنی اور انھوں نے دیوانِ غالب کے ڈی لکس ایڈیشن میں بغیر حوالے کے یہ تصحیحات قبول فرمالیں۔ بغیر حوالے کے دُوسروں کے تحقیقی اکتسابات کو ہڑپ اور ہضم کرنا ان کا ایک ناقابلِ علاج مرض معلوم ہوتا ہے۔ تحقیق چراغ سے چراغ جلانے کا عمل ضرور ہے مگر تحقیق کے نام پر دُوسروں کے چراغ گُل کرکے زاغوں کی طرح ان کی بتّی لے اُڑنا اور اسے اپنے بدہیئت دِیے میں سموکر اسے روشن کرنا حقائق کو تاریک کرنے اور صداقت کا خون کرنے کے مترادف ہے۔ مَیں معین صاحب کے لیے اُس ذات کے حضور دُعا گو ہوں جو سقم کو صحت سے بدلنے اور کجی کو مستقیم کرنے پر قادر ہے۔ ممکن ہے کسی سُہانی صبح جناب معین الرحمٰن اپنے سابقہ افعالِ نامسعود کو محسوس کرتے ہوئے اپنی طول طویل سَرقہ بازیوں کا کھل کر اعتراف کرلیں۔ دبے لفظوں میں اعترافات تو وہ بین السطور متعدد بار کرچکے۔

---

[1] ان علمی اعتراضات کی ذیل میں زبان و بیان کی ان متعدد فاحش اور مضحکہ خیز غلطیوں کو بھی شمار کرنا چاہیے جو معین الرحمٰن کی متذکرہ بالا کتابوں میں موجود ہیں مثلاً آسمان سنبھالنا۔ (... صحیح صُورتِ حال ص۱۱)، "غول" سے نکلیں (ص۱۶) "ممکن ہوسکا" (ص۵۹) ممکن کے ساتھ "سکنا" "یعنی چہ؟" "ان کی ذہنی غرابت کا مظہر ہے" (بہ سبیلِ غالب، ص ۲۷) یہ "ذہنی غرابت" کیا ہوتی ہے؟ معین الرحمٰن صاحب کو ترکیب سازی کا بھی شوق ہے مگر ان کی کتنی تراکیب "ایجاد بندہ" کی ذیل میں آتی ہیں مثلاً بادِ ہوائی (بہ سبیلِ غالب ص۱۱۵)، تخمینہ شناسی (ص۱۷۱)۔ اصلاحی دیوان (ڈی لکس ایڈیشن ص۱۵) ذالِ معجمہ کو کئی جگہ معجّمہ (بہ تشدیدِ جیم) لکھا ہے وغیرہ۔

6812

رضا لائبریری رامپور میں محفوظ دیوانِ غالب نسخۂ لاہور کے روٹوگراف کے ص ۲۱ کا عکس جہاں ایکیشن نمبر 6812 درج ہے۔

رشک کہتا ہی کہ اوسکا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہی کہ وہ بیمہر کسکا آشنا

ذرہ ذرہ ساغر میخانہ نیرنگ ہے
گردش مجنون بچشمکہای لیلا آشنا

شوق ہی سامان طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

مین اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنج رشک ہمدیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثال شیرین تہا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووی نہ پیدا آشنا

ذکر اوس پری وش کا اور پہر بیان اپنا
بنگیا رقیب آخر تہا جو رازدان اپنا

مے وہ کیون بہت پیتے بزم غیر مین یارب
آج ہی ہوا منظور اونکو امتحان اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادہر ہوتا کاشکے مکان اپنا

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی مین ٹالینگے
بارے آشنا نکلا اونکا پاسبان اپنا

درد دل لکہون کب تک جاون اونکو دکہلادون
انگلیان فگار اپنی خامہ خونچکان اپنا

گہستے گہستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستان اپنا

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت مین ہمنے ہمزبان اپنا

رشک کہتا ہی کہ اوسکا غیر سی اخلاص حیف
عقل کہتی ہی کہ وہ بیمہر کسکا آشنا

ذرہ ذرہ ساغر میخانہ نیرنگ ہے
گردش مجنون بچشمکہای لیلا آشنا

شوق ہی سامان طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

مین اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنج رشک ہمدیگر نہ رہنا چاہئے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثال شیرین تہا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اوس پریوش کا اور پہر بیان اپنا
بنگیا رقیب آخر تہا جو رازدان اپنا

مے وہ کیون بہت پیتے بزم غیر مین یارب
آج ہی ہوا منظور اونکو امتحان اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادہر ہوتا کاشکے مکان اپنا

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی مین ٹالینگے
بارے آشنا نکلا اونکا پاسبان اپنا

درد دل لکہون کب تک جاؤن اونکو دکہلا دون
انگلیان فگار اپنی خامہ خونچکان اپنا

گہستے گہستے مٹ جاتا آپنے عبث بدلا
ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستان اپنا

تاکرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت مین ہمنے ہمزبان اپنا

یہ دیوان غالب کا ڈیلکس ایڈیشن جس کی کھرچی ہوئی زیریں جدول درست کردی گئی
تھا پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مدورہ مہر تھی جس کے اندر Acc. No 6812 درج تھا۔

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ —— اصل حقائق

(مؤلفہ ڈاکٹر تحسین فراقی)

ممتاز دانشوروں، ادیبوں اور محققوں کی آرا کی روشنی میں

"تحسین فراقی کا کتابچہ 'اصل حقائق'، دقیق اور عالمانہ تحقیق کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے .... تحسین کے کتابچے کے آخر میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے نسخے، عرشی صاحب اور قاضی عبدالودود کے نسخے اور نسخۂ خواجہ کے بعض صفحات کے جو عکس دیے ہیں اُن کی وحدت و یکسانی کو بھانپنے کے لیے کسی ماہرِ تحریر کی ضرورت نہیں، ایک عطائی بھی بہ یک نظر پہچان سکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسخے کے عکس ہیں۔"

"تحسین نے فارسی متن کی قرأت اور اُردو ترجمے میں جو تصیحات تجویز کی ہیں وہ ... مایۂ فخر ہیں، اس سے مجھے یہ تذبذب ہوگیا ہے کہ تحسین شعبۂ اردو کے اُستاد ہیں یا شعبۂ فارسی کے۔ انھوں نے نسخۂ خواجہ سے پیشتر ان شروں کے ترجموں کی جو تفصیلی نشان دہی کی ہے وہ کم از کم میری معلومات میں اضافہ ہے۔"

ڈاکٹر گیان چند —— ماہنامہ "سورج"، جنوری ۲۰۰۱ء

"معین الرحمٰن کا نسخہ مشکوک تو تھا ہی۔ لکھنؤ میں حنیف نقوی ملے تھے کہتے تھے کہ یہ وُہی قدیمی نسخہ ہے۔ تحسین فراقی نے بہت محنت کرکے بات

قطعی طور پر ثابت کر دی۔ معین کی لغزش پر افسوس ہوا۔ اس سے پہلے انھوں نے پرتھوی چند فوٹو گرافر کی "جاگیرِ غالب" پر قبضہ کرنا چاہا تھا بعد میں مان لیے کہ وہ پرتھوی چند کی کتاب تھی۔"

ڈاکٹر گیان چند (کیلے فورنیا) مکتوب مورخہ ۲۹ر جون ۲۰۰۰ء

●

I never knew that this young professor possessd far more scholar'yshrewdness than the distinguished scholars from India and Pakistan who have bean complimenting Dr,Moeen for his discovery. Should I treat Tehseen Firaqi too as a rare discovery brought before us through NUSKHA-E-KHAWAJA?

Intizar Hussain-The Dawn, June 4,2000

●

"سید صاحب موصوف نے فراقی صاحب کے بے شمار وزنی اعتراضات میں سے کسی ایک اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا ہے بلکہ ؎

جوابِ خط پہ وہ عنوانِ مسلسل لکیریں سی بنا کر رہ گئے ہیں

البتہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کی کلیتہً تائید کے علاوہ مزید اعتراضات وارد کرتے ہوئے ملک کے مقتدر اربابِ فضل و کمال نے اعلائے کلمۃ الحق کے ضمن میں غالب شناسی کا حق ادا کر دیا ہے ..... سید معین الرحمان نے یہ نسخہ (نسخہ لاہور) کسی کباڑی سے خریدنے کی جو کہانی گھڑی ہے، وہ کذب بیانی کے سوا کچھ نہیں .... سید صاحب کسی مخطوطے کو سمجھنے اور اسے

مرتب کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں اسی لیے ان کے مُرتّبہ نُسخۂ خواجہ
میں لغزشوں کی بھرمار ہے۔"

خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، ماہنامہ سورج جنوری ۲۰۰۱ء

●

"تحقیق نامہ میں آپ کا خط پڑھا "نسخۂ لاہور" سے متعلق۔ آپ نے
یہ کیوں نہیں لکھا کہ یہ دراصل نُسخۂ لاہور ہی ہے۔ بلکیت بدل جانے سے
اصلیت تو نہیں بدلتی۔"

——— رشید حسن خاں ۲۸ جولائی ۹۹ء

●

"مخطوطۂ دیوانِ غالب کھلا ہوا چوری کا مال ہے۔ آخر یہ مصرع
بے معنی تو نہیں : چہ دلاور است . . . ."

——— رشید حسن خاں کے ایک اور مکتوبِ گرامی سے اقتباس

●

"کتابچہ (دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ۔ اصل حقائق) واقعتہً خوب ہے
اور آپ کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ معین صاحب نے ایک بات کا
بھی جواب نہیں لکھا اور بہت کچھ لکھا۔"

——— رشید حسن خاں کا مکتوب مورخہ ۲۸ جون ۲۰۰۰ء

●

"میں نے "مصطلحاتِ ٹھگی" کا انتساب عہدِ حاضر کے ادبی ٹھگوں
کے نام کیا ہے" جنھوں نے غالب کو اپنا ہدف بنا کر اس پرانی روایت
کی نئے انداز سے توسیع کی ہے۔"

——— رشید حسن خاں بنام لطیف الزماں خاں مورخہ ۱۶ اگست ۲۰۰۰ء

●

"تحسین صاحب کا لائقِ تحسین رسالہ نسخۂ خواجہ سے متعلق ایک صاحب نے عنایت کیا ہے۔ اِس قسم کی مجاہدانہ تحریریں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ اللہ مزید کی توفیق اور مواقع عطا کرے۔"

——— ڈاکٹر انصار اللہ علیگڑھ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مورخہ ۹ اگست ۲۰۰۰ء

●

"دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ ــ اصل حقائق" کا ایک نسخہ موصول ہوا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ اِس موضوع پر بات ہونی چاہیے تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کا آغاز آپ نے کیا۔"

——— ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی ــ ۱۹ اپریل ۲۰۰۰ء

●

"دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" کا نسخہ پہنچا۔ فوراً ہی پڑھ ڈالا۔ اور آپ کی حق پسندی، ذوقِ تحقیق اور دید و دریافت کے لیے دل سے دُعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو رواں دواں رکھے اور آپ علمی سینہ زوریوں کو اسی انداز سے بے نقاب کرتے رہیں۔"

——— ڈاکٹر اسلم فرخی، کراچی، ۱۵ جون ۲۰۰۰ء

●

"کتاب مل گئی اور تمھاری تحقیق، محنت، علم اور جستجو نے بہت متاثر کیا۔ مجھ پر تحقیق مت کرنا ورنہ میرے سارے جھوٹ منظرِ عام پر آجائیں گے۔"

——— لندن سے ساقی فاروقی کا مکتوب ۲۴ مئی ۲۰۰۰ء

●

"آپ کی کتاب" دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ــ اصل حقائق" نظر

سے گزری ۔ بے ساختہ آپ کی ژرف نگاہی کی داد دینے کو جی چاہا۔ آپ کی معلومات کی وسعت اور تعمق کا مزید قائل ہو گیا۔ اُردو اَدب کے حوالے سے اسے نئی صدی کے پہلے بڑے انکشاف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بمقام اطمینان ہے کہ اِس دَور میں بھی شیوۂ شیرانی کی پیروی جاری ہے۔"

——— افضل حق قرشی (لاہور)

●

"حال ہی میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا نام "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ ۔ اصل حقائق" ہے ۔ اِس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسخۂ خواجہ درحقیقت نسخۂ لاہور ہی ہے جسے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چُرا لیا گیا تھا ۔ میں ڈاکٹر تحسین فراقی کو اِس جرأت مندانہ تحقیق پر داد دیتا ہوں۔"

——— پروفیسر لطیف الزّماں خاں، سنڈے "پاکستان" ۱۴ مئی ۲۰۰۰ء

●

"ڈاکٹر معین کی کمزوریاں نہایت افسوس ناک ہیں ۔ وہ اپنی عزت آبرو کو خود اپنے ہاتھوں خاک میں مِلاتے رہتے ہیں ۔ ان کا عذرِ گناہ بد تر از گناہ ہوتا ہے ۔"

——— نظیر صدیقی ، مورخہ ۲ ستمبر ۲۰۰۰ء

●

"What Dr, Fi-raqi has done more convincingly in his monograph is pointing out the mistakes made by Dr Moin-ur Rehman while transcribing the diwan with vowels This critique reveales that Dr,Moin-ur-Rehman,s

editing and commentary are defective in places,,

Khalid Ahmad

The Friday Times (Lahore) July 7-13-2000

●

"اداریے میں معین الرحمٰن کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا ....
تحسین فراقی ایک معتبر شخصیت ہے۔ لطیف الزماں نے بھی ان کی حمایت کی ہے تو بات حتمی ہے۔"

——— حمایت علی شاعر، بنام مدیر "تخلیق" اگست ۲۰۰۰ء

●

"اس قلمی نسخے کے بارے میں اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ اُردو کے اُستاد پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی نے جو اعتراضات کیے اور اپنے کتابچے میں جن ناقابلِ تردید حقائق سے پردہ اُٹھایا وہ اِن دنوں غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔"

——— ڈاکٹر مشرف احمد (کراچی) روزنامہ ایکسپریس

۸ رجون ۲۰۰۰ء

●

"کبھی کبھار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے تقریباً سبھی شعبے ناجائز تجاوزات کا شکار ہو گئے ہیں۔ دیگر شعبوں کی طرح ادب کا شعبہ بھی ہمارے اسی غیر ذمہ دارانہ سماجی رویّے سے روز بروز سمٹتا جا رہا ہے۔ عام گلی محلوں اور بازاروں میں ایسے تجاوزات ہٹانے کا عمل شروع ہو تو رُکے ہوئے راستے کھل جاتے ہیں اور بظاہر بڑی دکانیں تنگ ہونا شروع ہو جاتی ہیں اُردو ادب میں بھی ایسے تطہیری عمل کی سخت ضرورت ہے جس کے آغاز کے بارے میں فی الحال کچھ

نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ خوش آیند بات ہے کہ اُدب کے اہم ترین شعبے یعنی تحقیق میں "عمل صفائی" کا یہ عمل شروع ہو گیا ہے جس کا سہرا ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے سر ہے۔ بازارِ تحقیق میں جو صاحب تجاوزات کیسے بیٹھے تھے اور اس باڑہ مارکیٹ میں اپنی دکان جس مالِ مسروقہ سے سجا رکھی تھی وہ ڈاکٹر موصوف کے متوشر عمل سے اتنی مختصر ہو گئی ہے کہ کسی سے پُوچھے بغیر اس کا اَتا پتا معلوم نہیں ہوتا۔

اُدبی تحقیق کے دبستانِ لاہور نے جو درخشندہ روایات قائم کر رکھی ہیں، ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کا یہ عمل اس کا حصّہ ہے۔ ایسے اہلِ علم لائقِ تحسین ہیں جن کی موجودگی میں غیر محتاط، کاتا اور لے دوڑی مزاج والے اور اپنی دکان کو خُوش نما اشتہاروں سے سجانے والے اربابِ تحقیق و تدقیق اپنے قلم کو ذرا احتیاط سے حرکت میں لاتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ جو کہانی مُحققین اُور غالب شناسوں کی نجی محفلوں میں موضوعِ بحث بنی رہی، اس کو انھوں نے مدلل انداز میں بصورتِ کتاب پیش کر دیا۔

ضربِ فراقی شدید ضرور ہے لیکن اس سے اُردو کی اُدبی تحقیق کے نحیف و نزار بدن میں صحت مندی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔ اِن شاء اللہ۔

——— محمد اکرام چغتائی۔ ڈائرکٹر جنرل اُردو سائنس بورڈ لاہور

●

"اِن (تحسین فراقی) کی کتاب دیکھ کر مسرت ہُوئی کہ اُنھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اِس "سومنات شکنی" پر اُنھیں میری طرف سے مُبارک باد کہہ دیجیے گا۔"

پروفیسر اشرف بخاری (پشاور) بنام محمد احسن خاں

●

"انھوں نے کوئی دعویٰ ایسا نہیں کیا جس کا ثبوت پیش نہ کیا گیا ہو۔ ان کے دلائل فی الواقع براہینِ قاطع کا حکم رکھتے ہیں جنھیں کوئی منصف مزاج شخص مانے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بات صرف یہیں تک محدود نہیں کہ تحسین فراقی صاحب نے معین صاحب کے دعویٰ باطل کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے ہیں بلکہ اس "ابطالِ باطل" کے ساتھ ساتھ ان کے علم و فضل کا بھانڈا بھی چوراہے میں پھوڑ دیا ہے۔"

"مسرت ہوئی کہ تحسین فراقی صاحب نے شگفتہ نثر لکھی ہے ... اور بڑی بات تو یہ ہے کہ بحث و جدل اور الزامات و طنزیات کے دفور کے باوصف کتاب پایۂ ثقاہت سے گرنے نہیں پاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گفتۂ غالب یہاں بھی ڈاکٹر تحسین فراقی کے پیشِ نظر رہا:

پیمانہ بر آں رند حرام است کہ غالبؔ
در بے خودی اندازۂ گفتار نداند!"

——— پروفیسر اشرف بخاری

روزنامہ "مشرق" (پشاور) ۱۸ر فروری ۲۰۰۱ء

●

"ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے موقف کی تائید میں جو سب سے وزنی دلیل دی ہے وہ یہ ہے لائبریریوں کے ضابطے کے مطابق لائبریری کی ہر کتاب کا ایک خفیہ صفحہ بھی ہوتا ہے جو کہ ایک مخصوص صفحہ اور مُہر شدہ ہوتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا بھی ایک مخصوص صفحہ ہے چنانچہ احتیاطی طور پر اس خاص صفحے پر جس کا نمبر ۲۲ ہے وہ مُہر کھرچ لی گئی ہے

تاکہ یہ لائبریری کی کتاب ثابت نہ ہوسکے۔ اِس بات کا معین صاحب
نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا اور اِس حساب سے سارا مُدہ انہی
کے خلاف جاتا ہے جب تک کہ مذکورہ کباڑیا اِس کی فروخت کی تصدیق
نہ کرے حال آنکہ ایسے نایاب نسخے کا کسی کباڑیے تک پہنچنا بجائے خود
ایک بہت بڑا سوال ہے جس کا جواب بھی خود معین صاحب ہی پر واجب ہے"
"چنانچہ اس مسئلے کا کھٹی کمانکالنے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے
کہ اِس نسخے کی پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہوجانے کا
پرچہ درج کرادیا جائے اور الزام بے شک کسی پر نہ لگایا جائے
البتہ اِس شبے کا اظہار ضرور کردیا جائے کہ یہ نسخہ وہی ہوسکتا ہے جو
ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پاس موجود ہے۔ اگر لائبریری مذکور کا کوئی افسر
مصلحتاً یہ پرچہ درج کرانے میں متامل بھی ہو تو فوجداری پرچہ کسی کی بھی
طرف سے درج ہوسکتا ہے جسے اس وقوعے کا تھوڑا سا بھی علم ہو۔"
—— ظفر اقبال۔ ہفت روزہ زندگی، لاہور
۲۷ر اگست تا ۲ ستمبر ۲۰۰۰ء

"ہمالیہ پہاڑ جیسے تین شواہد ایسے ہیں جنھیں اپنی جگہ سے جنبش دینا
محال ہے اور وہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ وُہی دیوان ہے جسے سید عبداللہ
صاحب اور امتیاز علی عرشی صاحب نے ملاحظہ فرمایا تھا۔"
"صفحہ ۲۲ شاید پنجاب یونیورسٹی لائبریری نے نمبر اندراج کے
لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اِس صفحے یعنی صفحہ ۲۲ پر نمبر کھرچا گیا ہے آخری
صفحے پر اسی جگہ مُہر ثبت تھی جو ڈاکٹر تحسین فراقی کے پیش کیے ہوئے
عکس میں صاف ہے۔ اس کی جگہ "فتے دین" کی چٹ لگی ہوئی ہے۔
اسے ہٹا کر کمپیوٹر کی مدد سے سراغ رسانی ممکن تھی۔"

"سید معین الرحمٰن صاحب کی یہ رائے کہ شاید ایک ہی کاتب نے ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ نسخے تیار کیے ہوں، درست معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو تحریر میں کہیں تو کوئی نقطہ، کوئی لفظ، کوئی سطر، کوئی کشش اِدھر سے اُدھر ہوتی۔ تینوں کے عکس ملا کر دیکھیے (جو فراقی صاحب نے دیے ہیں) کمپیوٹر پر رکھ کر دیکھ لیجیے، بال برابر کا فرق نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ تعداد صفحات یکساں۔ اشعار شماری میں سہو ضرور ہُوا ہے۔"

—— ڈاکٹر نور الحسن نقوی۔ بنام لطیف الزماں خاں
برگد ہاؤس، سول لائنز علی گڑھ

●

"آپ ایمانداری اور دیانتداری سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی مختصر کتاب کا مطالعہ کریں۔ آپ کو شروع سے آخر تک بحث کا ایک علمی انداز نظر آئے گا۔ کہیں بھی کوئی ذاتی نوعیت کا عناد دکھائی نہیں دیتا مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس مختصر کتاب کے جواب میں جو کتابچہ تحریر کیا اس کا انداز کہیں بھی علمی نہیں رہا . . . جو شخص علمی و ادبی سوالات کا جواب دینے کے بجائے گالیوں اور بد دعاؤں پر اتر آتے اس کے کمزور پہلوؤں کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔"

—— ڈاکٹر عارف ثاقب: "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ۔ اصل حقائق" اور "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ صحیح صورتِ حال"
—— ایک تقابلی جائزہ"

●

"معین الرحمان کے حوالے سے ایک ادبی بد دیانتی کا انکشاف حیران کُن

بھی ہے اور لمحۂ فکریہ بھی۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ اگر پروفیسر صاحب کی علمی و ادبی سطح کے لوگ اِس نوع کی ادبی تکفیر کا ارتکاب کر سکتے ہیں تو پھر عام شاعر و ادیب یا محقق کے ادبی ایمان کی پختگی کی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے۔ تحسین فراقی اور لطیف الزّماں کے حرف کو ان کی غیر جانب داری اور اصابت رائے کے سبب ادبی دنیا میں جو اعتبار حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ ساتھ آپ کے حوصلے کی پذیرائی بھی فرض خیال کرتے ہیں کہ جنھوں نے بلا خوف و خطر ایک بہت بڑے ادبی گھپلے کی نشان دہی کر دی ہے۔"

——— قیصر نجفی بنام مدیر "تخلیق" اگست ۲۰۰۰ء

●

مسروقہ مخطوطۂ دیوانِ غالب کی سراغ یابی پر

عصرِ نو یہ رنگ تیرا قابلِ افسوس ہے ۔۔۔ جو بھی کرگس ہے بزعمِ خویش وہ طاؤس ہے

ڈاکٹر تحسین فراقی نے کیا یہ راز فاش ۔۔۔ قدِ سارق سے بڑا چوری کا یہ ملبوس ہے

جب کہی تاریخ ہاتف نے تو تمہیداً کہا ۔۔۔ اے خدا تو دیر گیر و قاہر و قدوس ہے

نسخۂ مملوکۂ پنجاب یونیورسٹی

نسخۂ مسروقۂ گنجینۂ مانوس ہے

۱۴۲۱ھ

——— ہاتف زعفرانی

دیوانِ غالب

نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ
ایک جائزہ

سید قدرت نقوی

پہلی اشاعت : اگست ۲۰۰۰ء

نسخۂ خواجہ

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ۱۹۹۸ء میں دیوانِ غالب کے ایک مخطوطے کو "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ" کے نام سے مدوّن کیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر سید عبداللہ نے رسالہ "ماہ نو" کراچی بابت جولائی ۱۹۵۴ء میں بعنوان "دیوانِ غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ" ایک مضمون لکھ کر چھپوایا اور ساتھ ہی اس کے پہلے دو صفحات کے عکس بھی۔ ۱۹۵۷ء میں قاضی عبدالودود پاکستان آئے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں یہ نسخہ دیکھا اور اس کے فوٹو لے گئے جو بعد میں مولانا عرشی کو بھیج دیے کیونکہ اُسی زمانے میں وہ دیوانِ غالب مرتب کر رہے تھے۔ قاضی عبدالودود نے رسالہ "نقوش" لاہور ۱۹۵۸ء میں اس نسخے کا مختصر تعارف "متفرقات" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر کرایا۔ مولانا عرشی کا مرتب کردہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی بھی ۱۹۵۸ء میں چھپ کر آ گیا۔ انھوں نے قاضی عبدالودود کے ارسال کردہ فوٹوؤں سے استفادہ کیا اور اس کو "نسخۂ لاہور" کا نام دیا۔

ان تین بزرگوں کے بیانات کے پیشِ نظر معین الرحمٰن نے اپنے مرتبہ دیوانِ خواجہ میں بطور "مخطوطے کا تعارف" ص۳۵ کے زیرِ عنوان یہ تسلیم کیا ہے کہ:

> "قاضی عبدالودود نے "مخطوطۂ دیوانِ غالب" کتب خانہ دانش گاہ پنجاب (لاہور) اور مولانا امتیاز علی عرشی نے "نسخۂ لاہور" کے طور پر جس مخطوطے کے کوائف پیش کیے ہیں، بڑی حد تک جزئیات سمیت اس کی تفصیلات اور علامات وہی ہیں جو زیرِ نظر نسخۂ خواجہ میں موجود ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری (لاہور) کے جس نادر نسخے کا ڈاکٹر سید عبداللہ نے تعارف کرایا ہے، وہ بھی نسخۂ

خواجہ کے مماثل ہے لیکن اس میں کچھ اختلافات بھی ہیں۔ یہ اختلافات اور فرق تعداد اشعار اور مشمولات کا ہے۔"

اس بیان کے پیشِ نظر یہ بات ضروری ہے کہ پہلے ان بزرگوں کے بیانات کو پیش کیا جائے، کہ ان حضرات نے اس کے متعلق کیا کیا کہا ہے؟ اور وہ کہاں تک اور کس نظر سے اس مخطوطے کو دیکھ پائے ہیں؟ اصولاً معین الرحمٰن کو سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے کو پیش کرنا تھا کیونکہ سب سے پہلے انہی نے اس کو متعارف کرایا تھا۔ اسی تعارف کی بدولت قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی کو اس کا علم ہوا۔ بلکہ مولانا عرشی سے تو اس کے بارے میں خط و کتابت بھی ہوئی اور ڈاکٹر عبداللہ نے اپنے مضمون میں مولانا عرشی کے خط کا اقتباس بھی شامل کیا۔ مولانا عرشی کے مرتبہ دیوان اور قاضی عبدالودود کے مضمون "متفرقات" میں اس نسخے کی وضاحت و معلومات ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون ۵۴ء کے چار سال بعد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون بہرحال مقدم ہے، اس لیے اس کا ذکر پہلے ہونا چاہیے تھا۔ معین الرحمٰن نے اس کو موخر کر کے اصولِ تدوین کی خلاف ورزی کی ہے، جبکہ ان کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ قاضی عبدالودود کا مضمون ۱۹۵۸ء میں چھپا اور مولانا عرشی کا مرتب کردہ دیوانِ غالب نسخہ عرشی بھی ۱۹۵۸ء میں چھپا۔ ۱۹۵۴ء کا مضمون مقدم ہے، اس کے ذکر کو موخر کرنے میں شاید کوئی خاص مصلحت ہو۔ اب ہم ان تینوں بزرگوں کے مضامین من و عن پیش کر رہے ہیں۔

دیوانِ غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ

از : ڈاکٹر سید عبداللہ (ماہنامہ "ماہ نو" کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء)

مرزا غالبؔ کو وفات پائے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ان کی تصنیفی سرگرمیوں کا زمانہ بھی ہمارے زمانے سے چنداں فاصلے پر نہیں۔ مگر عجب اتفاق ہے کہ ان کی زندگی کے بعض عقدے ایسے لاینحل اور ان کی تصانیف سے متعلق بعض مسائل اس طرح پیچیدہ ہو کر رہ گئے ہیں گویا ہم میں ان میں کئی صدیوں کا فصل ہے۔ یہ تو خوش قسمتی ہے کہ مرزا اپنی زندگی کے بہت سے بھید اپنے خطوں کے ذریعے کھول گئے ورنہ مرزا کی شخصیت اور سیرت کے کئی پہلو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریکی میں رہ جاتے۔

اس کا ایک سبب یہ ہے کہ قرب زمانہ کے باوجود ہمارے پاس مرزا کی زندگی اور ان کے کارہائے نمایاں کے متعلق دستاویزی مواد کی بڑی کمی ہے اور جتنا کچھ مواد ہے وہ بھی یکجا نہیں۔ غالبؔ کی زندگی میں غدر کی آندھیاں کچھ اس طرح چلیں کہ بے شمار دوسرے اہلِ کمال کی طرح ان کی تصانیف کا شیرازہ بھی بکھر گیا اور کوئی ایسی صورت نہ نکلی کہ ان کے یہ "اوراق لختِ دل" جو "بباد" ہو چکے تھے، یکجا کر لیے جاتے۔ تاہم غنیمت ہے کہ زمانے نے جلد پلٹا کھایا اور مرزا کی قدر اور عزت کچھ اس طرح بڑھتی گئی کہ لوگوں کو ان کی تصانیف کی جستجو ہوئی۔ اس پر زمین خود بخود موتی اُگلنے لگی۔ ان کی تصانیف (یا ان کی زندگی کے ماخذ) جہاں کہیں موجود تھے منظرِ عام پر آنے لگے اور رفتہ رفتہ ان کی سوانح عمری کے تاریک گوشے معلومات کی شعاعوں سے روشنی پا کر روشن سے روشن تر

ہوتے گئے۔

اس طرح ہمارے پاس غالبیات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا جس کے سبب "محققین غالب" کے لیے مطالعہ غالب کی راہیں پہلے سے زیادہ کشادہ اور ان کی تحقیقی کوششیں پہلے سے زیادہ نتیجہ خیز ہوگئیں، بایں ہمہ ان کی زندگی اور فن کی سب گتھیاں ابھی تک سلجھ نہیں سکیں اور کئی اُمور ایسے ہیں جن پر تحقیق کی ابھی ضرورت ہے۔ ان حالات میں مرزا کے کلام اور زندگی کے متعلق جو نئی دستاویز بھی مل جائے، اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مرزا غالب کے دیوانِ اُردو کا ایک قلمی نسخہ داخل ہوا ہے جس کی میرے نزدیک کئی وجوہ سے اہمیت ہے۔ مجملہ ان کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے مرزا کے کلام کی زمانی حد بندی (توقیت) کے سلسلے میں خاصی امداد ملنے کی توقع ہے۔ غالب کے تقریباً بھی سوانح نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ مرزا غالب کے کلام کے کچھ مجموعے غدر میں لُٹ گئے تھے۔ مرزا نے اپنی نظم و نثر شاید خود کبھی جمع نہیں کی مگر "بعض نیازمندوں اور دوستوں نے ان تحریرات کے جمع کرنے کا اہتمام کیا تھا جن میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رئیس لوہارو اور ذوالفقار الدین حیدر عرف حسین مرزا خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔" یہ مولانا مہرؔ کا بیان ہے۔ ان کی تحقیق یہ بھی کہتی ہے کہ "نیّر نے غدر سے قبل غالب کی سب تحریرات اہتمام کے ساتھ جمع کر کے اُن کی پُر تکلف جلدیں بندھوائی تھیں۔ لیکن یہ مجموعے غدر میں لُٹ گئے۔" میرا قیاس ہے کہ ہمارا یہ گوہرِ آبدار یعنی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مذکورۃ الصدر نسخہ اسی لٹے ہوئے خزانے کا ایک درِ بے بہا ہے۔

دیوانِ غالب کے موجودہ قلمی نسخے کے کوائف یہ ہیں: "اوراق ۹۴ تقطیع ۸×۵، سرلوح و تعویذ مطلا شنگرف و لاجورد سے منقش مغلیہ نقاشی کے انداز پر، پہلے دو صفحے مطلا، حاشیہ اور بین السطور مطلا بیل بوٹے۔ ہر نئی غزل سے پہلے بیل بوٹے شنگرفی، خاتمے پر بھی مربع بیل بوٹے طلاکاری سے۔"

سب سے پہلے فارسی دیباچہ ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"مشام شمیم آشنایاں را صلا و نہادِ انجمن نشیناں را مژدہ کہ لختے از سامان عمرہ گردانی...... الخ" یہ دیباچہ مرزا غالب کا لکھا ہوا ہے، چنانچہ ان کا نام، عرف اور تخلص سب کچھ اس میں موجود ہے۔ اسی قسم کا دیباچہ بانکی پور لائبریری کے قلمی نسخوں میں بھی

ہے۔ رامپور لائبریری کے قلمی نسخے کے آغاز میں بھی یہ دیباچہ ہے جس کی تاریخ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء ہے۔ بانکی پور والے نسخے پر تاریخ ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء ہے۔ اس میں دیباچہ بلا تاریخ ہے۔ اس نسخے کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے ایک تقریظ ہے جو نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا سرنامہ یہ ہے:

"دمیدن سپیدہ سحری از تیرہ شب سواد اوراق بفر فروغ گستری عبارت تقریظ کہ پیدائی آں اثری ایست از آثار خرام خامہ دلربا۔ برادر بدل نزدیک بجاں برابر عالی دودمان والا گہر نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ۔"

اس تقریظ میں ۱۲۵۴ھ (یک ہزار بست و پنجہ و چار) موجود ہے، اس تقریظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "ہمگی اشعار شعریٰ شعار غزل و قطعہ و رباعی ہزار و پانصد و پنجہ و اند یاختم۔" تقریظ کا آخری جملہ یہ ہے جس پر نسخہ ختم ہو جاتا ہے۔ "از من یادگارے و برائے دیگراں تذکارے باد۔"

میں نے اس نسخہ کا صحیح زمانہ متعین کرنے کے لیے شیخ محمد اکرام صاحب اور مولانا امتیاز علی عرشیؔ (ناظم کتاب خانہ رامپور) سے بھی خط و کتابت کی۔ مولانا عرشیؔ کے گرامی نامے کا وہ حصہ جس میں "دیوانِ غالبؔ" کے مختلف نسخوں کی تفصیل دی گئی ہے، ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"اب میں دیباچۂ دیوان اور تقریظ کے بارہ میں کچھ عرض کرتا ہوں۔۔۔

(۱) میرزا صاحب نے اپنے دیوانِ اُردو کا دیباچہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ (مطابق ۱۴ اپریل ۱۸۳۲ء) کو لکھا تھا جیسا کہ برلن کے نسخے کے آخر میں موجود ہے۔

(۲) غالباً اس کی اشاعت کے چھپنے پر نواب ضیاء الدین خان بہادر نے ۱۲۵۴ھ میں تقریظ لکھی۔ یہ سنہ مطابق ہے ۱۸۳۸ء کے۔

(۳) اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیبِ دیوان کے ۵ سال بعد اشاعت و طباعت کا ارادہ کیا گیا تھا۔

(۴) ہمارے پاس ایک قلمی نسخہ ہے جس میں دیباچہ ہے مگر تقریظ نہیں ہے۔ اس میں اشعار کی مقدار ۱۰۶۷ ہے لیکن تقریظ میں ۱۰۹۰ سے کچھ اوپر اشعار بتائے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پانچ برس کے عرصے میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ ۲۵-۳۰ شعر سے زیادہ نہ تھا۔

(۵) سب سے پہلی بار دیوان کی طباعت و اشاعت دہلی میں سید محمد خان

بہادر کے چھاپے خانے کے لیتھو گرافک پریس میں شہر شعبان ۱۲۵۷ ہجری نبوی مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں سید عبدالغفور کے اہتمام میں واقع ہوئی۔

(۶) اس ایڈیشن میں تقریظ مذکورہ بالا جُوں کی تُوں چھپ چکی ہے۔ چنانچہ وہی ۱۲۵۴ھ سال اور وہی "ہزار و نود واند" مقدار اشعار مذکور ہے۔ گو مصحح نے "اند" کے ہوتے ہوئے لفظ ہشت بھی اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔

(۷) اس اشاعت کے چھ سال بعد مئی ۱۸۴۷ء میں دہلی ہی کے اندر دوبارہ طباعت کی نوبت آئی تو اس بار بھی تقریظ کا سنہ وہی ۱۲۵۴ھ رہا مگر مقدارِ اشعار بدل کر ۱۱۰۰ لکھی گئی۔

(۸) اس کے بعد مرزا صاحب نے جو کچھ کہا جب وہ خاصی تعداد میں اکٹھا ہوگیا تو انہوں نے ایک اور نسخہ صاف کرایا۔ اس میں بھی تقریظ کا سال وہی برقرار رکھا گیا لیکن تعداد اشعار ۱۵۵۰ سے اوپر بتائی گئی۔

یہ نسخہ وہی ہے جو آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔

(۹) بعدازاں ایک اور نسخہ مرتب کیا گیا۔ یہ نسخہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں پہلی بار تقریظ کا سنہ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء کر دیا گیا اور تعدادِ اشعار ۱۶۹۰ سے اُوپر ظاہر کی گئی۔

یہ نسخہ کہاں گیا؟ اس کا پتا نہیں چل سکا۔

(۱۰) اس کے بعد میرزا صاحب نے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم والئ رامپورؔ کے لیے ایک خوشخط نسخہ لکھوایا۔ اس میں سالِ تقریظ اور تعدادِ اشعار دونوں نمبر ۹ کے مطابق درج ہوئے۔ حالانکہ واقعی تعدادِ اشعار ۱۷۹۵ تھی۔

یہ نسخہ مئی ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل رامپور آیا اور کتاب خانے میں اب تک محفوظ ہے۔

(۱۱) دیوانِ غالبؔ کا تیسرا ایڈیشن ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں دہلی کے مطبع احمدی میں چھپا تو اس میں بھی تقریظ کا سال اور تعدادِ اشعار دونوں نمبر ۹ اور ۱۰ کے مطابق رہے۔

(۱۲) لیکن ہمارے نسخے کی نقل میرزا صاحب نے منشی شیو نرائن کو آگرے طباعت کے لیے بھیج دی تھی۔ یہ نسخہ چھپ کر نکلا تو سنہ میں ۱۲۷۰ھ رہا مگر تعدادِ اشعار ۱۷۹۰ سے اوپر مندرج ہوئی۔ اس کے بعد کے ایڈیشنوں میں سے

تقریظ خارج کردی گئی، اس لیے میں اب نتیجہ عرض کیے دیتا ہوں:

(الف) میرزا صاحب نے تقریظ کے سال میں تغیر کرنے میں بہت سہل انگاری سے کام لیا ہے، اس لیے اس سنہ سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔

(ب) یہی صورتِ حال تعدادِ اشعار کے اظہار میں بھی پیش آئی ہے للذا کسی ایڈیشن کی تقریظ میں جو تعدادِ اشعار ظاہر کی گئی ہو اسے بغیر شعر گنے ہرگز نہ ماننا چاہیے۔

(ج) آپ کے نسخے کی تقریظ کسی سابق نسخے کی نقل ہے اور یہ نسخہ ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان مرتب ہوا ہے، اس سے مقدم کسی طرح نہیں۔"

میں نے اس سلسلہ میں بانکی پور لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اس جستجو سے میں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کو یہاں درج کرتا ہوں:

اس نسخے کے سلسلے میں جو اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں، یہ ہیں:

(۱) کیا یہ نسخہ تقریظ کی عبارت کی رُو سے ۱۲۵۴ھ میں مرقوم ہوا؟ یا اس کے بعد؟

(۲) کیا یہ نسخہ ان نسخوں میں سے ہے جو نواب ضیاء الدین نیّر نے مرتب کرائے تھے، مگر بعد میں غدر میں گم ہو گئے تھے۔

(۳) کیا یہ وہ نسخہ تو نہیں جس کے متعلق مولانا مہؔر نے لکھا ہے کہ "ایک شہزادے نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل کی۔"

یہ صحیح ہے کہ تقریظ میں تاریخ موجود ہے۔ افسوس ہے کہ اس نسخے کی تقریظ میں جو تاریخ درج ہے ہم اس پر اعتماد نہیں کر سکتے، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالبؔ کا اُردو دیوان ۱۲۵۴ھ = ۱۸۳۸ء میں بھی مرتب ہوا جس کے لیے یہ تقریظ لکھی گئی۔ یہ تقریظ شاید طباعت کے خیال سے پہلی مرتبہ ۱۲۵۴ھ میں ہی لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد جتنے ایڈیشن مرتب ہوتے رہے ان کے آخر میں یہ تقریظ شامل ہوتی رہی مگر اصلی سن کو باقی رکھا جاتا رہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دیوان کے متعدد نسخے جن میں تقریظ ہے ان میں سن تو یہی ہے مگر تعدادِ اشعار مختلف ہوتی گئی ہے۔ مثلاً دیوانِ اُردو طبع اول کی تقریظ میں تعدادِ اشعار ۱۰۷۲، طبع ثانی میں ۱۷۹۳ پھر اس نسخے میں جو خود مرزا نے ۱۸۵۷ء سے قبل شاید

(۱۸۵۴ء=۱۲۷۱ھ) نواب محمد یوسف علی خان والی رامپور کے نذر گزرانا تھا۔ اس میں کل ۱۶۹۰ اشعار بتائے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو دیباچہ نظامی ایڈیشن)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ تقریظ کا سال قابلِ اعتماد نہیں یعنی جس نسخے میں یہ تقریظ ہو اور سال بھی یہی درج ہو ضروری نہیں کہ یہ نسخہ اسی سال کا ہو کیونکہ یہ تقریظ اصل سے نقل اور نقل در نقل ہوتی جا رہی ہے۔ اسی طرح مرزا غالبؔ کا اپنا لکھا ہوا دیباچہ بھی کہیں تو بقیدِ تاریخ ہے، کہیں بلاقیدِ تاریخ۔ رامپورؔ لائبریری کے قلمی نسخے کے شروع میں دیباچے کی تاریخ ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ درج ہے (مئی ۱۸۳۲ء/ اپریل ۱۸۳۲ء)۔ (نیز ملاحظہ ہو "ارمغانِ غالبؔ" ص ۲۷) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کے دیوان کا کوئی نسخہ ۱۸۳۲ء میں ضرور مرتب ہوا ہوگا جس کے لیے یہ دیباچہ مرقوم ہوا۔ بعد میں یہ دیباچہ اکثر نسخوں کے ساتھ شامل ہوتا رہا۔ البتہ بعض نسخوں میں رفع تضاد کے خیال سے سنہ کو حذف کر دیا گیا۔ چنانچہ ہمارا موجودہ نسخہ بھی بغیر تاریخ کے ہے، اس لیے اس نسخہ کا زمانہ تدوین (جہاں تک ان شواہد کا تعلق ہے) غیر متعین ہی رہتا ہے۔

اب اس بحث کے فیصلے کے صرف دو طریقے نظر آتے ہیں جن سے مسئلہ شاید آسان ہو جائے گا۔ اول تعدادِ اشعار سے زمانے کا تعین۔ دوم غزلیات اور دوسرے اشعار کی داخلی شہادتوں سے کسی نتیجہ پر پہونچنا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ غالبؔ کے اشعار کی تعداد میں بمرور وقت اضافہ ہوتا گیا۔ ان کا پرانا دیوان تو خیر پرانا ہوا، اس سے بحث نہیں۔ منتخب دیوان کے مختلف نسخوں کے اشعار میں بھی بہت فرق پایا جاتا ہے اور یہ فرق بالکل قدرتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے ۱۲۵۴ھ کے نسخے میں تعدادِ اشعار ۱۰۷۲ ہے، رامپورؔ کے نسخے میں ۱۶۹۰ اور طبع ثانی میں ۱۷۹۳۔ یہ تعدادِ اشعار کسی حد تک ہر نسخے کے زمانے کے لیے کلید کا درجہ رکھتی ہے یعنی کم اشعار والا نسخہ اقدم ہوگا اور زیادہ اشعار والا نسخہ موخر ہوگا۔ اس لحاظ سے موجودہ نسخہ رامپور والے نسخے سے پہلے کا ہونا چاہیے۔

اب ہمارے موجودہ زیرِ بحث نسخے میں ۱۵۶۸ اشعار ہیں، ان میں ۱۳۳۲ شعر غزل کے ہیں باقی دوسری اصناف کے، پس یہ تو ظاہر ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۳۸ء سے بعد اور ۱۸۵۵ء سے پہلے کا ہوگا مگر ذرا اور کوشش سے ہم شاید صحیح تاریخ کے قریب تر ہو جائیں۔ اس لیے آیئے اس مسئلہ کو دوسری حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کریں۔

شیخ محمد اکرام صاحب نے مرزا غالبؔ کے کلام کی توقیت کرتے وقت ان کے کلام کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے:

پہلا دور	۱۸۰۷ء سے ۱۸۲۱ء تک	(ریختہ)
دوسرا دور	۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۷ء تک	(خم خانہ شباب)
تیسرا دور	۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک	(بہارِ عجم)
چوتھا دور	۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک	(نوائے ظفر)
پانچواں دور	۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک	(چراغِ سحری)

یہ تو مسلّم ہے کہ ہمارا یہ نسخہ ۱۸۲۷ء سے بعد کا ہے مگر ۱۸۵۷ء سے کتنے سال پہلے کا ہے؟ اس کے لیے اس کی غزلیات کی چھان بین ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لیے بہت سی غزلیں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ اس نسخے میں جہاں تک میں سمجھ سکا ۱۸۵۱ء کے بعد کا کلام نظر نہیں آتا۔

۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں نسیمؔ نے ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا اور ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کو بھی اس میں دعوت دی تھی۔ اس مشاعرہ میں مرزاؔ نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع یہ ہے ؎

نویدِ امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

۱۸۴۵ء کی یہ غزل موجودہ نسخے میں موجود ہے، اس کے علاوہ مذکورہ بالا ادوار میں سے دورِ چہارم (۱۸۴۷ــ۵۷ء) (نوائے ظفر) کی بھی بہت سی غزلیات اس میں موجود ہیں۔ مگر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ارمغانِ غالبؔ" میں درج شدہ نوائے ظفر کی سب غزلیات اس نسخے میں نہیں، جو غزلیں موجود نہیں۔ ہم ان کے مطالع یہاں درج کرتے ہیں:

"درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا"
"درد منت کش دوا نہ ہوا"
"دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا"
"نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں"
"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"
"کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں"
"گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو"
"قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو"
"کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو"

"دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا"

"دل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے"

"غیر لیں محفل میں بوسے جام کے"

"پھر اس انداز سے بہار آئی"

"دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے"

"نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے"

"بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے"

"کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے"

"روندی ہوئی ہے خاک سرِ رہ گزار کی"

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"

"لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور"

"خوش ہوا اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا"

"ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو"

"سلام اسے کہ اگر بادشہ کہیں اس کو"

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز"

"اے شہنشاہ آسماں اورنگ"

"نصرۃ الملک بہادر مجھے بتلا کہ تجھے"

"اے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو"

"اے شاہ جہانگیر الخ"

متفرقات، رباعیات وغیرہ میں سے جو اس نسخے میں نہیں ان کی فہرست نظر انداز ہوتی ہے کیونکہ ہمارے مقصد کے لیے غزلیات کا حوالہ کافی ہے۔

"نوائے ظفر" کی یہ غزلیات (جو اس نسخے میں نہیں) اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اس نسخے میں ۱۸۵۷ء تک کا سارا کلام موجود نہیں جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ یہ نسخہ اس سے پہلے کا ہے۔ ان غزلوں میں مندرجہ ذیل غزلیات قابلِ توجہ ہیں:

(۱) "لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور"

(۲) "خوش ہوا اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا"

نمبر(۱) عارفؔ کا مرثیہ ہے۔ عارفؔ کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوتا ہے۔ اس مرثیے کا اس

دیوان میں نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ نسخہ اس سن سے پہلے مرتب ہوا ہوگا ورنہ اتنا اہم کلام اس سے کس طرح خارج ہوتا۔

نمبر(۳) وہ مشہور نظم ہے جس سے ذوقؔ و غالبؔ کے ایک ادبی معارضے کا واقعہ وابستہ ہے (اس کی تفاصیل "آبِ حیات" میں موجود ہیں) یہ واقعہ شیخ محمد اکرام صاحب کی تحقیق کی رُو سے دسمبر ۱۸۵۱ء میں پیش آیا تھا۔ اس اہم نظم کی عدم موجودگی بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ اس نسخے کی ترتیب ۱۸۵۱ء میں یا اس سے کچھ قبل عمل میں آئی ہوگی۔

اس سلسلے میں ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نسخے میں اگرچہ سہرا موجود نہیں مگر وہ معذرتی قطعہ موجود ہے جو سہرے سے وابستہ ہے، یعنی ۔

منظور ہے گزارشِ احوال واقعی

اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

یہ ایک معما ہے اور میں بر دست اس معمے کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتا۔ دو صورتوں میں سے ایک ہو سکتی ہے، یا تو یہ قطعہ سہرےؔ سے کچھ تعلق نہیں رکھتا یا پھر یہ دیوان مکمل نہیں۔

موجودہ حالات میں، میں ان دونوں قضایا میں سے کسی ایک کے متعلق کوئی قطعی رائے پیش نہیں کر سکتا کیونکہ قطعے میں استاد شہ سے پرُخاش کا اشارہ "سہرا لکھا گیا زرہ امتثال امر" اور "مقطع میں آ پڑی تھی سخن گسترانہ بات" یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ ان باتوں کی موجودگی میں اس کو سہرے والے واقعہ سے کس طرح غیر متعلق مان لیا جائے۔ دوسری طرف یہ تسلیم کرنا بھی مشکل ہے کہ یہ دیوان مکمل نہیں۔

بہرحال جو صورت بھی ہو ہم اس کو ۱۸۵۱ء سے بعد کا نسخہ نہیں کہہ سکتے۔ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ یہ نسخہ ۱۸۵۱ء میں مدون ہوا ہوگا۔ ممکن ہے اس کی تدوین اس شہزادے نے کی ہو جس کا ذکر مولانا مہرؔ نے کیا ہے یا کسی اور نے۔ یہ مسلم ہے کہ یہ کوئی خاص نسخہ ہے کیونکہ اس کی کتابت میں بڑا اہتمام کیا گیا ہے جس سے مرتب کی مرزا کے ساتھ غیر معمولی عقیدت اور محبت کا ثبوت ملتا ہے۔

اس نسخے کی دریافت سے شیخ محمد اکرام صاحب کا قائم کردہ عنوان "نوائے ظفر" دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے یعنی ایک نیا دور قائم ہو جاتا ہے جس کو ہم ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کا دور کہہ سکتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس نسخے کے گہرے مطالعہ سے کچھ اور انکشافات بھی ہوں مگر بر دست ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ذریعے کلامِ غالبؔ کی

تاریخی تدوین کی مشکل کسی قدر اور آسان ہوگئی ہے اور "نوائے ظفر" کی بہت سی غزلیات کے متعلق (جو اس نسخے میں موجود ہیں) یقینی طور پر معلوم ہوگیا ہے کہ وہ ۱۸۵۱ء سے پہلے کی ہیں۔"

--- O ---

ڈاکٹر سید عبداللہ مذکورہ مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ:

"حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مرزا غالبؔ کے دیوانِ اُردو کا ایک قلمی نسخہ داخل ہوا ہے۔ الخ"

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ سن ترپن اور سن چون کے مابین داخل ہوا اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کا تعارف شائع کرایا۔ تعارف کے ابتدائیہ یا تمہید میں معین الرحمٰن نے عمل تخفیف سے کام لیا اور عبارات کی تحذیف کی نشاندہی نقاط یا لکیر ڈال کر نہیں کی۔ یہ اصولِ تحقیق کی خلاف ورزی اور عدم دیانت ہے۔ تمہید کے بعد کی عبارت نقل کی ہے اس میں بھی "حال ہی میں" کے الفاظ محذوف کر دیئے ہیں۔ نسخے کا ذکر کرتے ہوئے سید عبداللہ نے مولانا مہرؔ کی کتاب "غالب، ص ۳۸۴" سے ان کی تحریر کا ایک اقتباس دیا ہے اور پھر دوسرا، یہ دونوں غالب کے خطوں سے مولانا مہر نے لیے ہیں۔ اصولاً ڈاکٹر سید عبداللہ کو اصل خطوط پیش کرنے تھے جن سے یہ بیان مقتبس ہے۔ مولانا مہر نے اپنی کتاب "غالب" میں خط بنام منشی شیو نرائن کا ذکر کیا بھی تو بغیر حوالۂ ماخذ۔ آپ اصل خط غالب کا ملاحظہ فرمائیے تاکہ صحیح صورتِ حال سامنے آ جائے۔ (غالب کے خطوط، از خلیق انجم، ۳:۱۰۶۴)

"کیا کہوں؟ تم سے! ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو، میرے نبی بھائی اور میرے شاگردِ رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں، مَیں نے کچھ لکھا وہ انہوں نے لے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چون پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز اور دیوانِ ریختہ سب مل کر سو سوا سو جزو مطلا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع، کہ کلام میرا سب ایک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اس مجموع نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ

(غدر) برپا ہوا اور شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوان یغما ہو گیا۔ ہرچند میں نے آدمی دوڑائے، کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔"

اس سے قبل حاتم علی بیگ مہر کو بھی کتب خانے کے لٹنے کے متعلق لکھا تھا۔
(غالب کے خطوط، از خلیق انجم، ۲:۱۰۰۷)

"میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔"

اسی زمانے میں یوسف علی خاں عزیز نے بھی غالب سے ان کا کلام طلب کیا تو انہیں لکھا: غالب کے خطوط ۲:۸۰۱

"تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا؟ کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان لٹے ہوئے کتاب خانوں کا ذکر کرنے کے بعد اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے:

"میرا قیاس ہے کہ ہمارا یہ گوہرِ آبدار یعنی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مذکورۃ الصدر نسخہ اسی لٹے ہوئے خزانے کا درِ بے بہا ہے۔"

سید عبداللہ کا یہ قیاس اس لیے درست نہیں کہ زیرِ بحث نسخے میں ۱۸۵۲ء تک کا کلام ہے۔ اگر یہ نسخہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری کا ہوتا تو اس میں ۱۸۵۶ء تک کا کلام ہوتا، جو نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری کا نہیں بلکہ کسی اور انقلاب میں لُوٹا گیا ہے۔ معین الرحمٰن کو اس پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تلاش و جستجو کرنی تھی جو نہیں کی گئی۔ گمشدگی کے حوالے بغیر کسی ماخذ کے صرف مکتوب الیہ کے نام کے ساتھ درج کرنے سے پہلے معین الرحمٰن نے سید عبداللہ ہی کے بیان کو اپنے الفاظ میں دہرا دیا کہ "دیوانِ غالب کا یہ نادر نسخہ ۱۸۵۷ء کی لُوٹ مار اور غارت گری کی باقیات میں

سے ہے" خود کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

سید عبداللہ نے جو باتیں دیباچے کے متعلق اپنے مضمون میں بیان کی ہیں وہ غور طلب اس لیے ہیں کہ انہوں نے دیباچہ کے لیے دو حوالے دیئے ہیں۔ ایک نسخہ رامپور اور دوسرا نسخہ بانکی پور، مگر بانکی پور والے نسخہ میں دیباچہ بلا تاریخ اور رامپور والے نسخہ میں بھی بلا تاریخ ہے، صرف نسخوں کی تاریخِ کتابت دی ہے جس سے یہ ظاہر ہوا کہ دیباچہ سب سے پہلے نسخہ رامپور قدیم میں شاملِ دیوان ہوا۔ البتہ مولانا عرشی نے نسخہ رامپور کو ۱۸۳۳ء کا مرتبہ قرار دیا ہے۔ معین الرحمٰن نے دیباچے کے متعلق کچھ نہیں لکھا، انہیں سید عبداللہ نے جو حوالے دیئے ہیں، وہ دیباچے کے کس پہلو کو اجاگر کرتے ہیں؟ اور دیباچے کی تاریخِ تحریر کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بیان کرنی تھی۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ دیباچہ کلکتہ میں گُلِ رعنا کے دیباچہ کے ساتھ لکھا گیا۔ میں نے اپنی مرتبہ گُلِ رعنا مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے ص۱۶ میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ دیباچہ کلیاتِ نثرِ غالب ص۵۶ پر چھپا ہے، اس سے پہلے دیباچہ گُلِ رعنا ہے اور بعد میں خاتمہ گُلِ رعنا ہے۔ گُلِ رعنا کے خاتمہ کی تاریخ غرہَ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری خود غالب نے لکھی ہے۔ (نقوش غالب نمبر، حصہ دوم، ص۳۳۰) گویا یہ دیباچہ دیوان ریختہ گُلِ رعنا کے دیباچہ کے بعد اور خاتمہ سے پہلے لکھا گیا۔ تاریخ مذکورہ کی مطابقت سن عیسوی سے ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء ہے۔ کلکتہ ہی سے یہ دیباچہ حکیم احسن اللہ کو بھیجا جس کا ذکر غالب نے اپنے ایک فارسی خط میں کیا ہے۔

"سطرے چند کہ بدیباچگی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ، و دود سودائی کہ بہ آرائش سفینہ موسوم بہ گُلِ رعنا بہ سویدا جوشیدہ است۔ ارمغان می فرستم و از شرم تنک مائگی آب می گردم۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب، ص۱۱۰)

یہ دیباچہ تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں بلا تاریخ شامل ہے۔ صرف مولانا عرشی نے ایک نسخہ مولانا نظامی بدایونی میں تاریخ دیباچہ منقول از مخطوطہ احمد علی شوق قدوائی ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۸ھ (بمطابق ۱۵ اپریل ۱۸۳۳ء) بتائی ہے۔ مخطوطے کی کوئی تفصیل نہیں لکھی، نہ کاتب کا نام اور نہ مقام کتابت بتایا۔ اس لیے یہ تاریخ نہ ترتیب کی ہو سکتی ہے اور نہ دیباچے کی کیونکہ دیباچہ تو ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء سے پہلے دیباچہ گُلِ رعنا کے ساتھ لکھا جا چکا تھا گویا اگر ایک مہینہ پہلے کا تصور کریں تو یہ اگست ۱۸۲۸ء کے پہلے عشرہ میں لکھا گیا ہو گا۔

مولانا عرشی کی بتائی ہوئی تاریخ اس مخطوطے کے کاتب نے جس دن کتابت دیباچہ مکمل کی وہ تاریخ لکھ دی۔ یہ تاریخ کسی اور جگہ نہیں درج کی گئی اور یہ تاریخ غالب کے علم میں نہیں تھی ورنہ وہ یہ مطبوعہ نسخوں میں تو ضرور درج کرتے۔

سید عبداللہ نے اس کے بعد نواب محمد ضیاء الدین خاں نیّر و رخشاں کی تقریظ میں لکھی ہوئی تاریخ و تعداد اشعار سے بحث کی ہے اور اس کی تاریخ تحریر و تعداد اشعار کو غیر معتبر بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مخطوطے کا سن متعین کرنا درست نہیں۔

سید عبداللہ نے اس نسخے کا سنِ کتابت متعین کرنے میں شیخ محمد اکرام اور مولانا عرشی سے بھی خط و کتابت کی۔ شیخ محمد اکرام کا کوئی خط اپنے مضمون میں نہیں درج کیا۔ غالباً انھوں نے شیخ اکرام کو خط میں کوائف لکھے تھے جس کے بعد شیخ اکرام نے یہ لکھا ہوگا کہ بغیر نسخہ دیکھے ہوئے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مولانا عرشی نے سید عبداللہ کے تحریر کردہ کوائف کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار بذریعہ خط کیا۔ چنانچہ سید عبداللہ نے مولانا عرشی کا خط اپنے مضمون میں نقل کر دیا۔ زیادہ تر بحث دیباچہ و تقریظ سے متعلق ہے۔ دیباچہ کی تاریخ پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں مگر مولانا عرشی نے یہاں حوالہ نسخہ برلن میں مندرج تاریخ ۱۴ اپریل ۱۸۳۲ء بتائی ہے۔ ۱۸۳۲ء غلط ہے صحیح ۱۸۳۳ء ہے، شاید یہ کتابت کی غلطی ہو۔ معین الرحمٰن نے اول تو مولانا عرشی کے مشمولہ خط پر کوئی بحث نہیں کی۔ یہ عمل تحقیق کے خلاف ہے، انھیں سن کی درستی کرنی تھی۔

مولانا عرشی نے مختلف دواوین کے سن تقریظ و تعداد شمار کے حوالے دے کر اس نسخے کو طباعت دوم ۱۸۴۷ عیسوی کے بعد مرتب ہونے والا نسخہ قرار دیا ہے اور سن ۴۷ اور ۵۴ کے درمیان مرتب ہونے والا نسخہ بتایا ہے۔ سید عبداللہ نے مختلف غزلیات کی موجودگی اور عدم موجودگی سے بحث کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "بہرحال جو صورت بھی ہو ہم اس کو ۱۸۵۱ء سے بعد کا نہیں کہہ سکتے۔ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ یہ نسخہ ۱۸۵۱ء میں مدون ہوا ہوگا۔" سید عبداللہ کا اندازہ غلط ہے، جبکہ اس میں ۱۸۵۲ء کی غزل موجود ہے تو اسے ۱۸۵۲ء کا مکتوبہ ہی ماننا پڑے گا۔

سید عبداللہ کے بعد اس نسخے کو قاضی عبدالودود نے دیکھا اور اس کے فوٹو بھی حاصل کیے۔ انھوں نے رسالہ نقوش میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے ماہ نو والے مضمون کے چار سال بعد اپنا ایک مضمون شائع کرایا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

متفرقات

قاضی عبدالودود

(رسالہ "نقوش" لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء، شمارہ نمبر ۷۰-۶۹، ص ۱۰-۲۰۹)

مخطوطہ دیوانِ غالب: کتب خانہ دانش گاہ پنجاب میں دیوانِ غالب کا ایک خطی نسخہ (=پ) ہے جو (بشمول صفحہ اول سادہ و دیباچہ غالب و تقریظ نیر) ۱۲۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔

دیباچہ (ص ۲ تا ص ۴) وہی ہے جو نسخہ مرتبہ جناب مالک رام (=م) ہے مگر پَ میں تاریخِ تحریر درج نہیں۔ پَ میں (ص ۴ تا ص ۱۰۶) غزلوں کا آغاز و انجام مَ (ص ۴۱ تا ص ۲۸۰) کی طرح ہے اور غزلوں [۱] اور ان کے اشعار کی مجموعی تعداد علی الترتیب ۲۱۶ اور ۱۳۱۲ ہے۔ م میں یہ تعداد علی الترتیب ۲۳۴ اور ۱۳۶۰ ہے۔ غزلہائے ذیل پَ سے غیر حاضر ہیں: درخور...... سا [۲] نہ ہوا، درد...... دوا نہ ہوا، کیوں...... جانِ عزیز، نہیں...... اعتقاد نہیں، دل...... آئے کیوں، بھولا...... کشت کو، قفس...... شیون کو، گئی...... گفتگو تو کیونکر ہو، کسی...... فغاں کیوں ہو، غیر...... جامہ کے، پھر...... بہار آئی، نکتہ...... سنائے نہ بنے، دیا...... بشر ہے کیا کہئے، بازیچہ...... دُنیا مرے آگے، کہوں...... مدعا کہئے، بہت...... کم کیا ہے، روندی...... شہریار کی، ہزاروں...... کم نکلے۔

مشترک غزلوں کے دو شعر پَ میں نہیں ہیں: سبزہ...... افعی نہ ہوا، یاں سر پہ شور...... خواب تھا۔ پَ میں ایک شعر ایسا بھی ہے جو مَ میں نہیں ملتا مگر یہ نسخہ شیرانی میں ہے ؎

ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم!
ہر موج گردِ راہ مرے سر کو دوش ہے

---

[۱] ایک شعر بھی ہے تو غزل قرار دیا گیا ہے۔

[۲] ایک مصرع کے چند لفظ جن سے ردیف و قافیہ کا علم ہو سکے۔

قصائد ۴ ہیں (ص۱۰۶ تا ص۱۱۷) اور یہ وہی ہیں جو مؔ میں موجود ہیں (ص۲۴۴ تا ص۲۵۹)۔ مائیہ و نونیہ قصیدوں کے عنوان کے لیے دیباچہ مؔ ص۱۸ ملاحظہ ہو، قصیدۂ مائیہ کا عنوان یہ ہے: "در مدح شہنشاہ جم جاہ سلیماں بارگاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی۔" چوتھے قصیدے میں "ایضاً" بطور عنوان مرقوم ہے۔ اشعار کی مجموعی تعداد ۱۶۲ ہے۔

قطعات (ص۱۱۷ تا ص۱۲۱) (۱) گئے وہ دن کہ...... الخ (عنوان دیباچہ مؔ ص۱۶ میں دیکھا جائے) (۲) کلکتہ کا جو ذکر...... الخ (عنوان دیباچہ مذکور ص۱۶) (۳) چکنی ڈلی والا قطعہ (عنوان دیباچہ ص۱۶) (۴) بیسنی روٹی والا قطعہ (۵) اے شہنشاہ فلک...... الخ (۶) منظور ہے...... الخ۔ اشعار کی مجموعی تعداد ۵۰۔

رباعیات (ص۱۲۱ تا ص۱۲۳) ۱۲ ہیں۔ یہ وہی ہیں جو مؔ (ص۲۷۷ تا ص۲۷۹) میں ہیں۔ مؔ کی آخری ۴ رباعیاں پؔ میں نہیں۔

پؔ کے کل اشعار ۱۵۴۸ ہیں مگر تقریظ میں "ہزار و پانصد و پنجہ واند" ہے۔

تقریظ نیّر کی لکھی ہوئی ہے۔ (ص۱۲۴ تا ص۱۲۸) اس کا عنوان یہ ہے: "دمیدن سپیدۂ سحری از تیرہ شب سواد اوراق بفر فروغ گستری عبارت تقریظ کہ پیدائی آں اثرے است از آثار خرام دلربا برادر بہ دل نزدیک بہ جان برابر، عالی دودمان والا گوہر نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ۔" کاتب اپنا نام اور زمانہ کتابت بتانے سے قاصر رہا ہے، مگر کب لکھا گیا؟ اس کا ایک حد تک تعین آخری قطعے کے زمانہ تصنیف پر غور کرنے سے ہو سکتا ہے۔

--- O ---

قاضی عبدالودود کا یہ شذرہ نہایت جامع ہے۔ میری نظر میں قاضی صاحب کے اس مختصر تعارف میں تین باتیں کھٹکتی ہیں:

(۱) قاضی صاحب نے دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام سے مقابلہ کیا، حالانکہ انھیں دیوانِ غالب طبع چہارم مطبوعہ مطبع نظامی کانپور سے کرنا تھا، جو غالب کا آخری تصحیح کردہ ہے۔ اس طرح یہ پتا چل جاتا کہ اس نسخہ میں جو غزلیات نہیں ہیں وہ غالب نے نسخۂ نظامی میں اضافہ کی ہیں اور یہ نسخہ مطبوعہ نظامی کانپور سے اقدم ہے۔ معین الرحمٰن نے اس طرف توجہ

نہیں دی۔

(۲) مشترک غزلوں کے جو دو شعر اس میں نہیں ہیں، وہ طبع اول اور طبع دوم والے نسخوں میں موجود تھے یا نہیں؟ یہ دونوں شعر نسخۂ نظامی کانپور میں موجود ہیں۔ اس نسخے میں نہ ہونا سہو کاتب قرار دیا جا سکتا ہے البتہ یہ شعر:

ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم
ہر موج گردِ راہ مرے سر کو دوش ہے

اس نسخے میں ہے، نسخۂ نظامی کانپور میں نہیں۔ بے شک نسخۂ شیرانی میں ہے مگر قاضی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ شعر نسخۂ شیرانی کے متن میں ہے یا حاشیہ کا۔ دراصل یہ شعر نسخۂ شیرانی کے حاشیہ کا شعر نمبر ۳ ہے (ص ۱۷۱ الف) گیتا رضا نے اسے نمبر دو پر غلط رکھا ہے اور غیر مطبوعہ ظاہر کیا ہے۔ (دیوانِ غالب کامل، ص ۲۷۲) معین الرحمٰن نے متن کی نستعلیق میں یہ شعر شامل نہیں کیا بلکہ متداول شعر ؎

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

درج کر دیا ہے۔ یہ متن سے مقابلہ نہ کرنے کی دلیل ہے۔

(۳) زمانہ کتابت کی تعیین کے لیے آخری قطعہ کے زمانہ تصنیف پر غور کرنے پر توجہ دلائی ہے، یہ آخری قطعہ قطعہ معذرت ہے جس کا پہلا شعر ہے:

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

یہ قطعہ معذرت سہرے کے سلسلہ میں ہے جو مارچ ۱۸۵۲ء سے متعلق ہے۔ اس طرح یہ نسخہ ۱۸۵۲ء کا مکتوبہ قرار پاتا ہے۔ اس نسخے میں غزل:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بھی موجود ہے جو اگست ۱۸۵۲ء کی ہے۔ اس طرح یہ نسخہ ۱۸۵۲ء کا ہے۔ ۱۸۵۲ء کے بعد کا کلام اس میں نہیں پایا جاتا۔ قاضی صاحب کے قول کے مطابق مارچ ۱۸۵۲ء کا ہونا درست نہیں، مفصل بحث آئندہ کی جائے گی۔

قاضی صاحب کے اس بیان کے بعد مولانا عرشی کے نسخہ دیوانِ غالب اُردو (نسخہ عرشی) طبع اول سے یہ بیان پیش ہے:

نسخۂ لاہور

از امتیاز علی عرشی

اس کی تقطیع ۸/۱ ۷ ۹×۶ انچ ہے۔ متن کا ناپ ۷/۴ انچ ہے۔ کل مکتوبہ ورق ۶۴ ہیں۔ مسطر ۱۰ سطر کا ہے۔ کاغذ دیسی باریک بادامی ہے۔ عام حالت بہت اچھی ہے۔

ورق الف ب پر سنہری، سفید، آبی، نیلی، سرخ اور زرو رنگ لوح کے نیچے فارسی دیباچہ شروع ہوا ہے۔ اس صفحے اور اگلے صفحے کے حاشیوں میں باریک اور نازک قلم سے مطلا و ملون بیل بنائی گئی ہے۔ نیز ان دونوں صفحوں کا بین السطور مطلا ہے۔ پوری کتاب میں چھ رنگ کی جدول ہے۔ ہر دو نظموں کے درمیان ایک سطر کے بقدر جگہ چھوڑی گئی ہے اور اسے رنگین بیل سے بھرا گیا ہے۔ جہاں کہیں آخری شعر کو دو سطروں میں لکھا ہے وہاں دونوں جانب کی جگھوں کو خوبصورت بیل بوٹوں سے بھر دیا ہے۔

کاتب کا نام اور تاریخِ کتابت درج نہیں ہے تاہم خط بتاتا ہے کہ نواب فخرالدین محمد خاں دہلوی کا لکھا ہوا ہے جو میرزا صاحب کے مشہور کاتب تھے۔ روش خط اصولِ فن پر پوری نہیں اُترتی، لیکن خط کی یکسانی اور پختگی نے بے حد دیدہ زیبی پیدا کر دی ہے۔ پوری کتاب میں لفظ "اک" کو "ایک" بدون نقاط لکھا ہے۔ "ٹ" میں ننھی "ط" کے نیچے دو نقطے بھی لگاتے ہیں۔ "نہ" اور "جگہ" کو "نھ" اور "جگھ" بھی لکھتے ہیں۔ شعر میں ہندسے کو لفظوں میں لکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ایسی جگھوں میں لفظ کے اوپر عدد کی شکل بھی بنائی ہے۔ مجھ سا، تجھ سا اور مجھکو، تجھکو وغیرہ کو بدون ہائے مخلوط اور "منہ" کو عموماً "منھ" اور کبھی "مونہہ" لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب کی ہدایت کے مطابق عموماً اردو، فارسی الفاظ میں ذ کی جگہ ز لکھتے ہیں اور "خرشید" میں واو نہیں لکھتے۔ خوشنمائی اور دفع التباس دونوں کے لیے لفظوں پر اعراب بھی لگاتے ہیں۔

اس نسخے کے مشتملات کی ترتیب سابق نسخوں جیسی ہے۔ چنانچہ ورق ۲ب کی

جو تھی سطر سے دوسری لوح کے نیچے غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ ورق ۵۳ب سے قصیدے، ورق ۵۸ الف سے قطعے اور ورق ۶۰ الف سے رباعیاں شروع ہوتی ہیں۔ آخر میں نیر کی تقریظ ہے، جو ورق ۶۲ب سے شروع ہو کر ورق ۶۳ ب پر ختم ہوئی ہے۔ اس تقریظ میں نسخہ م کی طرح سال ترتیب دیوان ۱۲۵۴ھ (مارچ ۱۸۳۸۔مارچ ۱۸۳۹ء) مندرج ہے۔ لیکن اس میں میرزا صاحب کی مشہور غزل: "سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں" بھی شامل ہے جو دہلی اردو اخبار مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء میں اس تصریح کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتے کے مشاعرے کا کلام ہے، اور ۱۸۵۳ء کی کہی ہوئی کوئی غزل وغیرہ موجود نہیں، اس لیے یہ قیاس کرنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ نسخہ ۱۸۵۲ء کے نصف آخر میں مرتب کیا گیا تھا اور تقریظ کی تاریخ ازراہ سہو تبدیل نہیں کی گئی ہے۔

تقریظ میں اشعار کی تعداد "ہزار و پانصد و پنجہ واند" (۱۵۵۰ سے کچھ اوپر) بتائی ہے۔ میں نے شمار کیا تو ۱۵۴۷ شعر نکلے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اشعار کے گننے میں بھی احتیاط نہیں برتی گئی تھی۔ اشعار کی تفصیل یہ ہے:

غزلیات:۱۳۱۱، قصائد:۱۶۲، قطعات:۵۰، رباعیات:۲۴، کل:۱۵۴۷۔ الف:۲۸۴، ب:۱۲، ت:۱۹، ج:۴، چ:۶، د:۹، ر:۹۹، ز:۲۰، س:۷، ش:۲، ع:۸، ف:۲، ک:۱۵، گ:۲، ل:۹، م:۸، ن:۲۰۹، و:۴۴، ہ:۲، ی:۵۸۰، کل:۱۳۹۱۔

اندرونی شہادت ثابت کرتی ہے کہ اسے اول سے آخر تک میرزا صاحب نے پڑھا ہے اور اکثر جگہ اغلاط کاتب کی اصلاح بھی کی ہے چنانچہ مندرجہ ذیل مقامات پر اُن کے قلم کی واضح اصلاحیں موجود ہیں:

(۱) ورق ۱۰ب: جس دل پہ ناز (تھا) مجھے، وہ دل نہیں رہا
(۲) ورق ۲۰ الف: گرمی بزم (ہے) اک رقص شرر ہوتے تک
(۳) ورق ۲۱ب: رونق ہستی ہے (عشق) خانہ ویراں ساز سے
(۴) ورق ۲۳ الف: آپ بے بہرہ (ہے) جو معتقد میر نہیں
(۵) ورق ۲۵ب: ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا (ہو)
(۶) ورق ۳۷ الف: ساقی گری کی شرم کرو آج (ورنہ) ہم
(۷) ورق ۴۶ الف: ہم رشک کو اپنے (بھی) گوارا نہیں کرتے

ان میں سے ۱، ۲، ۳، ۴ اور ۷ میں جو لفظ بریکٹوں میں لکھے ہوئے ہیں وہ اصل میں خود میرزا صاحب نے اپنے قلم سے بڑھائے ہیں۔ نمبر ۵ میں کاتب نے "ہو" کی جگہ

"ہے" لکھ دیا تھا، میرزا صاحب نے اول کو چھیل کر دوسرا لفظ بنا دیا ہے۔ نمبر ۶ میں کاتب نے "ورنہ آج" لکھ کر "ورنہ" کے اوپر "خ" (جو موخر کا نشان ہے) اور "آج" کے اوپر "م" (جو مقدم کا نشان ہے) بنا دیا تھا۔ میرزا صاحب نے "ورنہ" کو قلمزد کر کے "آج" کے بعد (ورنہ) اپنے قلم سے لکھ دیا ہے۔

تاہم بہت سی خطی غلطیاں اب بھی موجود ہیں مثلاً:

(۱) "کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا خیال" (۴ ب) حالانکہ صحیح الفاظ "حوادث کا یہ حال" ہیں۔

(۲) "جلوہ از بسکہ ـــــ مژگاں ہو گا" (۵ ب) جب کہ صحیح ردیف "ہونا" ہے۔

(۳) ورق ۷ ب پر "سونچ" ۱۰ الف پر "خورشید" ۱۳ الف پر "وحنواں" اور ۱۸ الف پر "تعذیر" ملتا ہے، جو غالب کے املے کے خلاف ہے۔

(۴) "نہ سنو گر بُرا کہے کوئی، نہ کہو گر بُرا کہے کوئی" (۴۸ ب) حالانکہ صحیح ردیف "کرے کوئی" ہے۔

(۵) "رہ گیا خط (میری) چھاتی پر کھلا" (۵۷ ب)، اس میں بریکٹ کے اندر کا لفظ کاتب اور مصحح دونوں سے چھوٹ گیا ہے۔

(۶) "شاہ (کے) آگے دھرا ہے آئنہ" (۵۸ الف) یہاں بھی بریکٹ کا لفظ رہ گیا ہے۔

(دیوانِ غالب اُردو، نسخہ عرشی زادہ، طبع اول ۱۹۵۸ء دہلی، ص ۸۷ــ ۸۴)

--- O ---

معین الرحمٰن نے مولانا عرشی کے بیان سے قبل اپنے تعارف کے ص ۲۵ متن نمبر ۵ میں لکھا ہے:
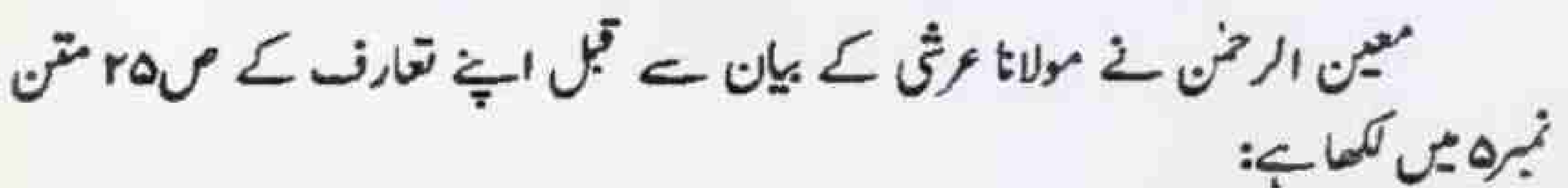
> "نسخہ لاہور کے تحت مولانا امتیاز علی عرشی نے دیوانِ غالب (نسخہ عرشی طبع دوم (۱۹۸۲ء دہلی) کے مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے بعض غیراہم جزوی اختلافات کے ساتھ اپنے مشمولات اور کوائف کی تفصیل کے اعتبار سے زیرِ نظر نسخہ خواجہ کے کم و بیش عین مطابق ہے۔"

مولانا عرشی کو نسخہ لاہور کے فوٹو قاضی عبدالودود نے دیئے تھے۔ جب وہ نسخہ خواجہ کے عین مطابق ہے تو پھر نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور دونوں ایک ہوئے۔ نسخہ عرشی طبع اول

کا اقتباس ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ معین الرحمٰن نے نسخہ عرشی کا تعارف بابت نسخہ لاہور نقل کرنے کے بعد حواشی میں چند غیر اہم اختلافات دیئے ہیں۔ وہ ایسے ہیں کہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ نقاط وغیرہا کا اضافہ ممکن ہے اور "ہوگا" کا "ہوتا" بنانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ "خرشید" اور "خورشید" دونوں املا مولانا عرشی نے بتائے ہیں۔

معین الرحمٰن نے اشعار کے شمار میں مولانا عرشی کی نشاندہی کی ہے اور یہ نہیں بتایا کہ یہ غلطی کہاں ہے۔ حقیقتِ امر یہ ہے کہ نسخہ عرشی طبع اول کے اس تعارف میں ردیف "ہ" کی پہلی غزل کے ایک شعر:

از مہر تا بذرہ دل و دل ہے آئنہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

کو مولانا عرشی شمار کرنا بھول گئے اور یہ ان کا سہو تھا۔ دوسری غزل کے دو شعر شمار کر لیے اور ردیف "ہ" کے سامنے "۲" کا ہندسہ لکھ کر مجموعہ اشعار غزلیات "۲۱۱" صحیح لکھا۔ (نسخہ عرشی، طبع اول، ص۸۶) ردیف دار اشعار کو جمع کیا جائے تو یہی مجموعہ بنتا ہے۔ نسخہ عرشی نقش ثانی میں ردیف "ہ" کی صحیح تعداد "۳" تو لکھ دی مگر مجموعہ میں ایک عدد کا اضافہ پھر بھی سہواً رہ گیا۔ (نسخہ عرشی نقشِ ثانی، ص۱۱۶)

معین الرحمٰن نے جہاں مولانا عرشی کے ایک شعر کی غلطی شمار کرنے میں بتائی ہے، غزلیات کے اسی گوشوارے کی نقل میں خود ایک بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے کہ ردیف "ر" کے اشعار کی تعداد مولانا عرشی نے انہتر (۶۹) درج کی ہے مگر موصوف نے اسے چھیانوے (۹۶) بنا دیا ہے اور مجموعہ ۱۵۴۷ ہی لکھا ہے جو نسخہ عرشی طبع اول میں درج ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندسے عمل تقلیب کا شکار کاتب کی غفلت سے ہو گئے لیکن تصحیح کرتے وقت معین الرحمٰن نے صحت نہیں کی۔ اس طرح ستائیس (۲۷) اشعار کا اضافہ ہوا۔ یہ غلطی معین الرحمٰن کاتب کے سر ڈالنے کی ناکام کوشش کریں گے۔ انہوں نے نسخہ عرشی نقشِ ثانی یا تو دیکھا ہی نہیں، اگر دیکھا ہے تو مقابلہ نہیں کیا ورنہ "ہ" کے "۲" کے بجائے اپنے دیئے ہوئے گوشوارے میں "۳" کہاں سے نقل کیا۔ تحقیق و تدوین کی اتنی بڑی غلطی کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے۔ مولانا عرشی کی ایک عدد کی غلطی تو نظر آ گئی مگر اپنے ۲۷ شعروں کا اضافہ انہیں نظر نہیں آیا۔ یہ اضافہ کیسے ضم کیا جائے گا؟

معین الرحمٰن نے اپنے تعارف کی شق نمبر ۱۰ میں دیوانِ غالب مطبوعہ طبع دوم اور نسخہ خواجہ کا مقابلہ کر کے نسخہ خواجہ میں زاید کلام پر روشنی ڈالی ہے۔ ردیف وار زاید

غزلیات کے اشعار میں قصائد میں شامل دو غزلیات کے اشعار کو بھی شمار کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے ایک نئی روایت قائم کی ہے کہ وہ غزل جو دیگر اصنافِ کلام میں شامل ہو وہ غزلیات ہی کے تحت شمار کی جائے گی، خواہ سیاق و سباق کے مطابق الگ ہی کیوں نہ ہو۔ طرفہ تر بات یہ ہے کہ ان کے اشعار غزلیات کے زمرے میں بھی شمار کیے ہیں اور قصائد میں بھی۔ اب ان کا پیش کردہ گوشوارہ زاید غزلیات ملاحظہ فرمایئے۔

"غالب کی درج ذیل بتیس(۳۲) غزلیات پہلی بار "نسخہ خواجہ" میں شامل ہوئیں، اس لیے ان کا زمانہ نگارش مئی ۱۸۴۷ء (دیوانِ غالب طبع دوم) اور اگست ۱۸۵۲ء (نسخہ خواجہ) کے درمیان خیال کرنا چاہیے:

		نسخہ خواجہ صفحہ	تعداد اشعار
۱-	بزم شہنشاہ......دفتر کھلا	۸-۹	۱۰
۲-	یہ نہ تھی......یار ہوتا	۱۳-۱۴	۱۱
۳-	میں اور بزم سے......ہوا تھا	۱۶	۲
۴-	گھر ہمارا......ویراں ہوتا	۱۷	۳
۵-	نہ تھا کچھ......خدا ہوتا	۱۷	۳
۶-	ہوئی تاخیر......تاخیر بھی تھا	۱۹	۱۱
۷-	ذکر اس پری وش کا......اپنا	۲۲	۸
۸-	جور سے......آئیں کیا	۲۳-۲۴	۷
۹-	گھر جب بنالیا......کہے بغیر	۲۹	۹
۱۰-	ہے بسکہ......نشاں اور	۳۱-۳۲	۱۱
۱۱-	لازم تھا......اور	۳۳	۱۰
۱۲-	حیراں ہوں......جگر کو میں	۴۷	۱۰
۱۳-	دونوں جہاں......خوش رہا	۵۰	۳
۱۴-	دائم پڑا......نہیں ہوں میں	۵۱	۸
۱۵-	سب کہاں......ہوگئیں	۵۲-۵۳	۱۶
۱۶-	تم جانو......راہ ہو	۵۸	۷
۱۷-	اس بزم میں......حیا کیے	۶۸	۹
۱۸-	تسکیں کو......نظر ملے	۷۲	۷

		نسخہ خواجہ صفحہ	تعداد اشعار
۱۹-	کوئی دن گر...... اور ہے	۷۲-۷۳	۶
۲۰-	کوئی اُمید بر نہیں آتی	۷۳	۱۰
۲۱-	دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	۷۳-۷۴	۱۱
۲۲-	کہتے ہو تم...... آئے	۷۴-۷۵	۹
۲۳-	حُسن مہ گرچہ...... اچھا ہے	۸۰-۸۱	۱۰
۲۴-	شکوے کے نام...... ہوتا ہے	۸۲-۸۳	۱۳
۲۵-	ہر ایک بات...... کیا ہے	۸۳-۸۴	۱۰
۲۶-	میں انہیں چھیڑوں...... پڑے ہوتے	۸۴	۴
۲۷-	حضور شاہ...... آزمائش ہے	۹۲-۹۳	۱۰
۲۸-	ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی	۹۶-۹۷	۱۰
۲۹-	منظور تھی یہ شکل...... ظہور کی	۱۰۱-۱۰۲	۹
۳۰-	غم کھانے میں...... بہت ہے	۱۰۲	۹
۳۱-	زہرِ غم...... بدنام ص ۲۸	۱۱۱	۷
۳۲-	کنج میں بیٹھا رہوں...... در کھلا ص ۲۹	۱۱۵	۹

غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد = ۲۷۳

در مدحِ ظفر، غالب کے درج ذیل دو قصائد، نسخہ خواجہ (=اگست ۱۸۵۲ء) ہی میں پہلی بار شامل ہوئے:

		صفحہ	اشعار
۱-	ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام	۱۰۹-۱۱۲	۵۸
۲-	صبح دم دروازۂ خاور کھلا	۱۱۳-۱۱۶	۸۳

قصائد کے اشعار کی مجموعی تعداد = ۱۲۵

غالب کے درج ذیل دو قطعات (تعداد اشعار = اُنتیس ۲۹) اور یہ دو رُباعیاں بھی زیرِ نظر، "نسخہ خواجہ" ہی میں پہلی مرتبہ شامل ہوئیں:

(۱) (قطعہ): اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر (ص ۱۱۸-۱۱۹)

(۲) (قطعہ): منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی (ص ۱۱۹-۱۲۰)

(۳) (رُباعی): حق، شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے (ص ۱۳۲)

(۴) (رُباعی): اِس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا (ص ۱۳۲)

اس طرح بتیس(۳۲) غزلوں، دو(۲) قصیدوں، دو(۲) رُباعیوں اور دو(۲) قطعات کے کوئی چار سو اکتیس(۴۳۱) اشعار کی حد تک، کلام غالب کا زمانی تعین، نسخہ خواجہ ہی کی مدد اور مستند حوالے سے ممکن ہوتا ہے۔ یہ اس نسخے کی ایک بڑی وجہ فضیلت اور اہمیت ہے۔

(مخطوطے کا تعارف، ص ۴۰-۳۸)

معین الرحمٰن نے دیوان کی تیس(۳۰) غزلوں کے بعد قصائد میں شامل دو غزلوں کو آخر میں لکھ کر غزلوں کی مجموعی تعداد بتیس(۳۲) لکھی ہے۔ اگر ان دو غزلوں کو دیوان کی غزلیات میں شامل کر لیتے تو کیا ہی اچھی بات ہوتی۔ پہلے قصیدے کی غزل کو ردیف میم میں اور دوسرے قصیدے کی غزل کو ردیف الف میں درج کرنا تھا مگر دشواری یہ تھی کہ متن میں تو ان کا اندراج اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دیوان کی غزلیات کو نستعلیق کر رہے تھے۔ دیوان کی غزلیات میں یہ تھیں نہیں تو ان کو وہاں کس طرح درج کرتے اور اندراج کی گنجائش کیسے نکالتے؟ البتہ گوشوارہ میں شامل کر سکتے تھے مگر قاری جب دیوان میں ردیف کے اشعار گنتا تو تعداد و شمار زائد پا کر گنتی کو غلط کہتا۔ اس لیے آسانی اسی میں خیال کی کہ ان کے اشعار کی تعداد کو آخر میں لکھ دیا اور تعداد اشعار غزلیات دو سو بہتر(۲۷۲) لکھ دی۔ حالانکہ دیوان میں شامل غزلیات کے اشعار کی تعداد دو سو ستاون (۲۵۷) ہے مگر انھوں نے گوشوارے میں درج غزل نمبر ۳ کے اشعار کی تعداد دو لکھی ہے جبکہ صحیح تعداد تین(۳) ہے۔ اس طرح دو غلطیاں کیں۔ ایک تو غزل کے اشعار کی تعداد غلط لکھی دوسرے غزلیات کے اشعار کی مجموعی تعداد بھی بہ شمول تعداد اشعار غزلیات قصائد غلط لکھی گئی۔

یہاں تک تو غزلیات کی تعداد کی بات ہے۔ اب آیئے قصائد کی طرف تو پہلے قصیدے کے کل اشعار اٹھاون(۵۸) ہیں جن میں سات شعر غزل کے بھی شامل ہیں۔ حالانکہ حاشیے میں لکھا ہے کہ ان کو قصیدے میں شمار نہیں کیا۔ اگر غزل کے اشعار کو شمار نہ کیا جائے تو تعداد اکیاون رہ جاتی ہے۔ مگر شمار کیا گیا تبھی تو گوشوارے میں تعداد اشعار اٹھاون(۵۸) لکھی گئی۔ یہ سہو تو کاتب کا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو مرتب کی غفلت اور غیر حاضر دماغی کی عجوبہ کاری ہے۔

دوسرے قصیدے میں اور بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قصیدے کے کل

اشعار تراسی(۸۳) گوشوارے میں درج کیے ہیں۔ متن میں شمار کیا گیا تو تعداد تینتالیس(۴۳) ہے۔ یہ چالیس(۴۰) شعر کہاں سے آئے اور کہاں غائب ہوگئے، اس کا علم معین الرحمٰن ہی کو ہو سکتا ہے۔ قاری گوشوارہ کا اور متن کا موازنہ کرتا ہے تو چالیس شعروں کے فرق پر حیران رہ جاتا ہے۔ غزل کے نو(۹) شعر گھٹائیں تو چوہتر(۷۴) اشعار رہ جاتے ہیں۔

قصائد کے اشعار کی کل تعداد ایک سو پچیس(۱۲۵) لکھی ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔ گوشوارہ کے مطابق اٹھاون(۵۸) + تراسی (۸۳) کا مجموعہ ایک سو اکتالیس (۱۴۱) ہوتا ہے۔ سولہ (۱۶) کا فرق ہوا شاید بلا اندراج غزلیات قصائد کے اشعار سات(۷) + نو (۹) = سولہ (۱۶) کو ۱۴۱ (ایک سو اکتالیس) میں سے گھٹا کر مجموعہ ۱۲۵ (ایک سو پچیس) بنا لیا گیا ہے۔ یہ اعداد و شمار کی بوالعجبیاں کیسے حل کی جا سکتی ہیں؟ حل معین الرحمٰن ہی بتا سکتے ہیں۔

درحقیقت پہلے قصیدے میں اٹھاون اشعار مع اشعار غزل ہیں اور دوسرے قصیدے میں تینتالیس اشعار مع اشعار غزل ہیں۔ جن کا مجموعہ ایک سو ایک (۱۰۱) بنتا ہے۔ معین الرحمٰن مجموعہ ایک سو پچیس (۱۲۵) لکھتے ہیں۔ یہ چوبیس(۲۴) زائد اشعار کہاں سے آئے اور کہاں گئے؟ اس کا جواب یا جواز معین الرحمٰن کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔

دو قطعات کے اشعار انتیس(۲۹) دو رُباعیوں کے چار شعروں کا مجموعہ تینتیس بنتا ہے۔ غزلیات، قصائد، قطعات اور رُباعیات کے کل اشعار کا مجموعہ بلحاظ متن ۴۲۳ (چار سو تیئیس) بنتا ہے مگر معین الرحمٰن لکھتے ہیں:

> "اس طرح بتیس غزلوں، دو قصیدوں، دو رُباعیوں اور دو قطعات کے کوئی چار سو اکتیس (۴۳۱) اشعار کی حد تک کلام غالبؔ کا زمانی تعین نسخہ خواجہ کی مدد اور مستند حوالے سے ممکن ہوتا ہے"۔
>
> (تعارف ص ۲۰)

معین الرحمٰن نے اشعار کی چار سو اکتیس(۴۳۱) گنتی لکھی ہے۔ وہ بالکل غلط ہے۔ یہ گنتی بلحاظ متن دیوان درست نہیں ہے۔ البتہ ان کے درج کردہ گوشوارہ کے مطابق ہے۔ یہ گوشوارہ ملاحظہ فرمایئے اور معین الرحمٰن کی ذہانت کی داد دیجئے۔

اشعار بلحاظ متن	اشعار بلحاظ گوشوارہ مرتبہ معین الرحمٰن صفحات ۳۸ تا چالیس
کل اشعار غزلیات = ۲۵۷	۲۷۳
کل اشعار قصائد = ۱۰۱	۱۲۵
کل اشعار قطعات = ۲۹	(۲۹) تعداد عبارت میں درج کی مگر قطعات
کل اشعار رباعیات = ۴	(۴) اور رباعیات کے سامنے درج نہیں کی۔
کل میزان = ۳۹۱	۴۳۱

متن اور گوشوارے کا فرق دیکھیے تو آپ کو اشعار کی گنتی میں چالیس اشعار زائد نظر آئیں گے۔ یہ چالیس شعر کہاں سے آئے اور ان کا اندراج متن میں کہاں ہے؟ اس کمپیوٹر کے دور میں جمع کرنے میں اتنی بڑی غلطی واقع ہونا ایک تعجب خیز امر ہے۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز و تعجب خیز معین الرحمٰن کا یہ بیان ہے جس سے ان کی فن ادب اور نظم و نثر کی اقسام سے واقفیت بدرجہ اتم ہویدا ہے۔ اپنے تعارف کے صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں:

"اصلاً متن کے اشعار کی قطعی تعداد ۱۵۴۸ بنتی ہے۔ "قطعات" کے منظوم فارسی عنوانات کو شمار کر لیا جائے تو اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵۰ سے کچھ اوپر ہو جاتی ہے"۔

متن میں تین قطعات کے عنوانات کو کاتب نے دو سطری لکھا ہے۔ یہ دوسطری اندازِ تحریر عموماً شعر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی اندازِ تحریر سے معین الرحمٰن کو التباس ہوا اور وہ ان کو "منظوم فارسی عنوانات" سمجھ بیٹھے اور ان کو شاملِ اشعار کر لیا۔ یہ عنوانات چونکہ دو فارسی کے مقفیٰ جملے ہیں جن میں قافیہ کی رعایت کا لحاظ ہے۔ ان کو اگر منظوم قرار دیا جائے تب بھی ان کا شمار اشعار میں نہیں ہو سکتا۔ اشعار میں شمار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں شعر ہی خیال کیا ہے۔ ورنہ ۱۵۵۰ سے کچھ اوپر تعداد کیسے بنتی ہے؟ پہلے عنوانات ملاحظہ فرمایئے:

"قطعہ در نمائش عنوان دلاویزی گفتار
و آسان کردنِ اندوہ پشیمانی بر دل دلدار"

اس میں "گفتار" اور "دلدار" ہم قافیہ ہیں۔ کوئی وزن نہیں ہے، کیونکہ منظوم میں وزن شرط ہے۔ مقفیٰ جملوں میں صرف قافیہ کی شرط ہے، وزن کی نہیں۔ گفتار کے بعد واو

عطف کو لانا نثر ہونے کی ایک دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف نثرِ مقفّیٰ کے دو مربوط جملوں پر مبنی عنوان ہے جسے کاتب نے ہر جملے کو بلحاظ قافیہ ایک ایک سطر میں اوپر نیچے لکھ دیا ہے۔ یہ اندازِ تحریر ہی وجہ التباس ہے۔

"چمن سرمایہ کردن گفتار بستائش کلکتہ
اگر فردوس نتواں گفت ارم است البتہ"

یہ بھی مثل قطعہ اولیٰ کے ہے۔ "کلکتہ" اور "البتہ" ہم قافیہ ہیں۔ کوئی وزن نہیں ہے، کاتب نے بلحاظ قافیہ دو سطروں میں لکھا ہے۔ اگر وہ نثری انداز میں لکھتا تو شعر کا التباس نہ ہوتا

"با دوست از سپاس عطائے ہدیہ سخن راندن
و متاع گزیدۂ سخن در برابر آں افشاندن"

اس میں بھی "افشاندن" اور "راندن" ہم قافیہ ہیں، کوئی وزن نہیں ہے۔ اس کو بھی کاتب نے دو سطری بانداز شعر لکھ کر ایک قسم کا التباس پیدا کر دیا ہے۔ اسے نثری انداز میں لکھنا تھا۔ اگر لکھاوٹ نثری انداز کی ہوتی تو التباس کا شکار نہ ہوا جاتا۔ معین الرحمٰن اسی لکھاوٹ کے انداز سے التباس کا شکار ہوئے اور لکھ دیا کہ "قطعات کے منظوم فارسی عنوانات کو شمار کر لیا جائے تو اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵۰ سے کچھ اوپر ہو جاتی ہے"۔ حالانکہ تین قطعات کے عنوانات کو شمار کریں تو تعداد ۱۵۵۱ ہوتی ہے۔ "کچھ اوپر" لکھنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان کے ذہن میں قصائد کے عنوانات اور خاتمہ کی عبارت کو بھی اشعار میں شمار کرنا تھا لیکن ان کی سطور کے آخر میں قافیہ نہیں تھا۔ گو کاتب نے ان کو بھی دو سطری انداز میں لکھ کر شعر کا روپ دیا ہے۔ اگر یہ بھی مقفّیٰ ہوتیں تو معین الرحمٰن ان کو بھی شعر شمار کر لیتے اور اس طرح چار اشعار کا مزید اضافہ ہو جاتا اور اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵۵ تک پہنچ جاتی اور تحقیق کا ایک کارنامہ انجام پاتا۔ افسوس کہ غالبؔ نے ان عبارات کو مقفّیٰ نہیں بنایا اور معین الرحمٰن چار اشعار کا اضافہ کرنے سے محروم رہ گئے۔ غالبؔ چاہتا تو ان کو بھی مقفّیٰ بنا سکتا تھا۔

پہلا قصیدہ حضرت علی علیہ السلام کی منقبت میں ہے جس کا عنوان کاتب نے دو سطروں میں لکھا ہے

"افزائش آبروئے سخن گوہر بینش بہ ثنائے
ابوالائمہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ التحیہ والثناء"

کیونکہ ان دونوں سطروں میں قافیہ کا لحاظ نہیں۔ اس لیے شعر نہیں بتایا، مگر معہود ذہنی شعر ہی رہا۔ کیونکہ لکھاوٹ کا انداز شعری انداز ہے۔ اسی طرح بہادر شاہ کے مدحیہ قصیدہ کی عبارت کو بھی کاتب نے دو سطروں میں لکھا ہے:

"در مدح شہنشاہ جم جاہ سلیمان بارگاہ
سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی"

اس دو سطری عنوان کو بھی لکھاوٹ کی وجہ سے شعر قرار دیا جا سکتا تھا۔ غالبؔ چاہتا تو اسے باآسانی مقفیٰ کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس کو مقفیٰ کر دیتا تو لکھاوٹ اور قافیہ کی بنا پر معین الرحمٰن اسے بھی اشعار کے زمرے میں شمار کر لیتے۔ مگر ذہن میں شعر ہی رہا۔ کاتب نے خاتمہ کی چوسطری عبارت کو بھی شعری انداز میں چار سطروں میں لکھا ہے:

"دمیدن سپیدۂ سحری از تیرہ شب سواد اوراق بفر فروغ گستری
عبارت تقریظ کہ پیدائی آں اثریست از آثار خرام خامہ
دلربا برادر بہ دل نزدیک بجاں برابر عالی دودماں والا گہر
نواب ضیاء الدین خاں بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ"

اس چوسطری عبارت کو بانداز شعر لکھا گیا ہے۔ غالب اس عبارت کو مقفیٰ بڑی آسانی سے بنا سکتے تھے مگر لکھاوٹ میں کئی سطریں بن جاتیں۔ کاتب نے بھی اس کو لکھا تو شعری انداز میں مگر رعایت قافیہ ملحوظ نہیں رکھی۔ اس لیے معین الرحمٰن نے اس کو بھی اشعار میں شمار کرتے ہوئے تامل سے کام لیا ورنہ یہ بھی دو شعر بن جاتے۔ اس طرح چار شعروں کا اضافہ لازماً ہو جاتا۔ "۱۵۵۰ سے کچھ اوپر" لکھا جانا ان کے معہود ذہنی کا عکاس ہے۔ ورنہ حتمی تعداد ۱۵۵۱ لکھنے میں کیا قباحت تھی اور کون سا امر مانع تھا؟ کیونکہ یہ تین عبارتیں جن کی لکھاوٹ کا انداز تو شعری تھا، مگر قافیہ کی عدم موجودگی نے مجبور کر دیا۔ اگر قافیہ ہوتا تو معینؔ الرحمٰن ان کو بھی اشعار کے زمرے میں شمار کر لیتے۔ اسی وجہ سے قصائد و خاتمہ کا ذکر نہیں کیا صرف قطعات کا ذکر کر دیا۔

اندراج متن کے بعد اضافات کی پہلی شق "اصناف وار کلام غالب کی توقیت" کے پہلے پیراگراف میں معین الرحمٰن نے بڑی اہم باتیں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"زیرِ نظر نسخے (نسخہ خواجہ) میں شامل غالب کی قدیم ترین نگارش ۱۸۱۲ء کی ہے۔ اس کا زمانی تعین علائی کے نام غالب کے ایک خط (مورخہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء) سے ہوتا ہے۔ دیوانِ غالب (اُردو) کا قدیم ترین

دستیاب خطی نسخہ ۱۸۱۶ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ تمام و کمال غالب کے اپنے خط / قلم سے لکھا ہوا ہے۔ غالب نے یہ نسخہ مولانا امتیاز علی عرشی کے بقول منگل ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ کو تمام کیا، جو ۱۱ جون ۱۸۱۶ء کے مطابق ہے۔ (مقدمہ، نسخہ عرشی، طبع دوم دہلی ۱۹۸۳ء صفحہ ۸۵) اس نسخے کی ساری غزلیں، قصیدے، قطعات و رباعیات وغیرہ گویا حد سے حد ۱۱ جون ۱۸۱۶ء تک کے زائیدہ فکر ہیں۔ اس خطی نسخے (۱۸۱۶ء) کے حاشیوں پر کچھ غزلیں وغیرہ بڑھائی گئی ہیں۔ یہ اضافہ غالب کے قلم سے نہیں ہے۔ ان اشعار کو، اس نسخے کے اتمام و تکمیل (۱۸۱۶ء) کے کچھ بعد کا کلام خیال کرنا چاہیے"۔

معین الرحمٰن نے غالب کے جس خط بنام علائی مورخہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء کی بنا پر جس کلام کو ۱۸۱۲ء کی قدیم ترین نگارش قرار دیا ہے وہ ظنی ہے یقینی نہیں ہے۔ غالب نے علائی کو اپنے طویل خط میں اس غزل کے متعلق یہ لکھا ہے:

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے"۔

(غالب کے خطوط، ۱۹ ۳۸۵)

غالب کی یہ پانچ شعر کی غزل دیوان غالب مطبوعہ مطبع نظامی کانپور میں ہے۔ حمیدیہ، حمید ورق سادہ نمبر۳، ص ۲۸۶ پر، شیرانی کے متن ص ۸۸ الف پر اور نسخہ عرشی ص ۲۴ اور ص ۲۹ پر چھ شعر کی ہے۔ بعد میں ایک شعر:

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے

خارج کر کے پانچ شعر برقرار رکھے۔ غالب نے خارج کردہ شعر کا ذکر اسی لیے نہیں کیا۔ مولانا عرشی نے حاشیہ میں وہ پوری غزل صاحب عالم کے روزنامچے سے نقل کی ہے۔ (نسخہ عرشی ص ۲۹۰) جس میں خارج کردہ شعر بھی شامل ہے۔ اس طرح غالب کا یہ کہنا کہ "مقطع اور ایک شعر میرا" بالکل درست ہے۔

ہمارے محقق اعظم معین الرحمٰن نے غزل کے مطبوعہ مطلع کا یہ مصرعہ "وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے" لکھ کر پوری غزل کو ۱۸۱۲ء کا قرار دیا ہے۔ کیونکہ خط بنام علائی ۱۸۶۲ء میں غالب نے اندازاً پچاس برس کی بات ہے لکھا۔ انہوں نے اس کو حقیقی، حتمی اور یقینی خیال کر کے باسٹھ میں سے پچاس کو گھٹا کر بارہ لکھ دیا۔ حالانکہ ان کے مرشد مولانا عرشی اور ان کے گرو گپتا رضا نے بعد از ۱۸۲۱ء لکھا ہے۔ حمید اور شیرانی میں خارج کردہ شعر کا نمبر ۴ ہے مگر گپتا رضا نے اسے نمبر ۵ پر رکھا ہے۔ نمبر ۵ پر رکھنے کی نشاندہی کسی ماخذ سے نہیں کی۔

نسخہ امروہہ (بیاض غالب، نسخہ عرشی زادہ) کا سن کتابت سب سے پہلے میں نے بدلائل متعین کیا جس میں علم ہیئت کے طریقہ سے سن کتابت کی تعیین ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۱ جون ۱۸۱۶ء سے کی ہے۔ (اُردو نامہ شمارہ نمبر ۷، ۳۰ ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۱) اس کے بعد سب نے یہی تاریخ لکھنی شروع کر دی۔

معین الرحمٰن نے نسخہ امروہہ (بیاض غالب) کا مطالعہ تو ضرور کیا ہوگا۔ اس میں صرف غزلیات و رباعیات ہیں مگر معین الرحمٰن نے اس میں قصائد و قطعات کا ہونا بتا کر اہل فکر و نظر کو اس نسخہ کے دوبارہ بغائرٔ نظر دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ ہم نے دیکھا تو قصائد و قطعات اس میں نہیں ملے۔ معین الرحمٰن کو شاید گم شدہ نسخہ امروہہ مل گیا ہوگا۔ جیسے یہ نسخہ خواجہ کسی پرانی کتابوں کے سوداگر سے ہاتھ آگیا۔ اسی طرح نسخہ امروہہ بھی ان کے ہاتھ آگیا ہوگا جس میں قصائد و قطعات ہوں گے مگر معین الرحمٰن نے ان قصائد و قطعات کی نشاندہی نہیں کی۔ انہوں نے اپنے تحقیق کردہ قصائد و قطعات اہل فکر و نظر سے پوشیدہ رکھے۔ پس ان کا علم صرف معین الرحمٰن کو ہے اور کسی کو نہیں۔ اگر وہ ظاہر کر دیتے تو اُردو ادب میں اضافہ ہوتا اور ان کا احسان۔

مولانا عرشی نے نسخہ عرشی نقشِ ثانی کے مقدمہ ص ۱۳۲ میں طبع دوم کے ایک ناقص نسخہ کا تعارف کراتے ہوئے اس کے آخر میں غالب کے کلام کی بائیس غزلوں اور ایک قطعہ کا قلمی اضافہ ظاہر کیا ہے۔ اور لکھا ہے:

"خوش قسمتی سے اس (طبع دوم) کا ایک نسخہ ۱۹۴۷ء کے بعد ایک پرانی کتابیں بیچنے والے سے بھی مل گیا ہے۔ اس میں صفحات ۵ تا ۴۰ تو نہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے آخری سادہ اوراق پر مرزا صاحب کا وہ کلام نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اس دیوان کی اشاعت کے بعد کہا تھا"۔

مولانا عرشی نے اس کلام کی ترتیب بھی بتائی ہے اور اسے اختلاف نسخ میں جگہ دے کر اس کے وقیع ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ گویا آخر میں مندرج کلام مستند ہے۔ مگر معین الرحمٰن اس کے متعلق اضافات پہلی شق "اصناف وار کلام غالب کی توقیت" ص ۲۹۹ میں یوں رقم طراز ہیں:

"دیوان غالب کے دوسرے اڈیشن (۱۸۴۷ء) کا ایک مطبوعہ نسخہ ۱۹۴۸ء میں مولانا امتیاز علی عرشی کو ایک پرانی کتابیں بیچنے والے سے ملا۔ یہ ناقص ہے۔ اس میں صفحات ۵ تا ۴۰ سرے سے موجود ہی نہیں۔ عرشی صاحب کے بقول اس کے آخری سادہ اوراق پر غالب کا وہ کلام نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اس دیوان کی اشاعت (۱۸۴۷ء) کے بعد کہا تھا۔ ناقل مجہول الاسم ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اندراج کب کیا گیا۔ اب یہ اڈیشن کہیں محفوظ بھی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا۔ اس لیے اس اندراج پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا"۔

معین الرحمٰن نے مولانا عرشی کے بیان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ نسخہ خواجہ کی اہمیت جتانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اپنے بیان کے آخر میں اس کا اظہار ان الفاظ میں خود ہی کر دیا ہے "یہ سارا کلام زیر نظر نسخے، نسخہ خواجہ کا اضافہ و امتیاز ہے"۔ مولانا عرشی کے بیان کو غیر وقیع قرار دے کر نسخہ خواجہ کو اہم بتانا اس لیے زیب نہیں دیتا کہ طبع دوم والے نسخہ میں اضافہ جس نے بھی کیا اسے جس ترتیب سے کلام ملتا گیا وہ لکھتا رہا۔ ورنہ اگر وہ کہیں سے نقل کرتا تو ترتیب بدلی ہوئی ہوتی۔ مثلاً قطعہ "اے شہنشاہ.... عدیل الخ) بالکل آخر میں ہوتا اور غزلیات "یاں ہوتا؟ خدا ہوتا" ردیف الف میں ہوتیں۔ مولانا عرشی کی شہادت استناد کے باوجود اس پر بھروسہ نہ کرنا معین الرحمٰن کی حیرت انگیز جرأت ہے۔

مولانا عرشی نے ۱۹۴۷ء کے بعد اس کا ملنا لکھا ہے۔ معین الرحمٰن نے اسے ۱۹۴۸ء بنا دیا۔ مولانا عرشی نے کوئی حتمی سن نہیں لکھا۔ ان کو صرف اتنا یاد رہا کہ یہ نسخہ ۱۹۴۷ء

کے بعد ملا۔ بعد کو ملنے سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۴۸ء میں ملا۔ ممکن ہے کہ یہ مدت نسخہ عرشی طبع اول ۱۹۵۸ء کی درمیانی مدت کے کسی سن میں ملا ہو۔ مولانا کو ۱۹۴۷ء کے بعد ملنا یاد رہا صحیح سن ان کے ذہن میں محفوظ نہیں رہا۔ معین الرحمٰن نے ۱۹۴۸ء کو حتمی سن کس بنا پر قرار دیا' یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید یہ حتمی سن اس لیے قرار دیا ہو کہ مولانا عرشی کو یہ نسخہ پرانی کتابیں بیچنے والے سے ملا تھا اور معین الرحمٰن کو بھی نسخہ خواجہ (نسخہ لاہور) ایک پرانی کتابیں بیچنے والے ہی سے ملا تھا اور اس کا سن یافت ۱۹۸۱ء کے پس و پیش بتاتے ہیں۔ حتمی سن کیوں نہیں؟ حالانکہ آج کل کتاب کی خریداری یا ویسے ملنے والی کتاب تاریخ درج کر کے اپنے دستخط کرنے کا عام رواج ہے۔ اس نسخہ خواجہ پر معین الرحمٰن کے نہ دستخط ہیں اور نہ تاریخ خریداری وغیرہ۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہو گی۔

قاضی عبدالودود پنجاب یونیورسٹی سے اس نسخے کے فوٹو ۱۹۵۷ء میں لے گئے اور مولانا عرشی کو دے دیے۔ ۱۹۶۹ء میں جب معین الرحمٰن اشاریہ غالب مرتب کر رہے تھے تو انہیں یہ نسخہ نہیں ملا اور لائبریری والوں نے بتایا کہ سید عبداللہ کے نام پر جاری ہے اور ان کے پاس ہے۔

معین الرحمٰن اشاریہ مرتب کرتے وقت ڈاکٹر سید عبداللہ کی طرف رجوع کر کے اشاریہ میں اس نسخے کے کوائف درج کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ تو لاہور میں موجود تھے۔ معین الرحمٰن تو لاہور سے باہر کے حضرات سے غالب پر لکھنے والوں سے ان کے مضامین کی فہرستیں منگا منگا کر اپنے اشاریہ میں درج کر رہے تھے۔ اس نسخہ کے کوائف ان سے مل کر درج نہ کرنا' ایک کوتاہی ہے۔

معین الرحمٰن نے اپنے ایک مکتوب میں رشید حسن خاں کو لکھا ہے کہ "میرا احساس ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اُردو دیوان غالب کے دو خطی نسخے رہے ہیں"۔ اگر فی الحقیقت دو نسخے تھے تو ایک تو سید عبداللہ کے پاس تھا' دوسرا تو لائبریری میں ہوتا۔ اس کے کوائف بھی اشاریہ میں کیوں درج نہیں کیے؟ اگر ہوتا تو یقیناً اشاریہ میں درج کرتے۔ درج نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک ہی نسخہ تھا' جو ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام جاری ہوا تھا۔ ان کے احساس کی اساس کس داخلی ثبوت پر مبنی ہے؟ یہ بیان نہیں کیا۔

معین الرحمٰن کا یہ کہنا "ایک وہ (نسخہ) ہے جسے قاضی عبدالودود نے دیکھا اور جسے عرشی صاحب نے "نسخہ لاہور" بتایا ہے۔۔۔۔ اس سے مختلف دوسرا نسخہ وہ تھا جسے ڈاکٹر

سید عبداللہ نے متعارف کرایا ہے"۔ معین الرحمٰن کے اس بیان کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ غالب کے اُردو دیوان قلمی کے دو تو مذکورہ نسخے ہوئے اور تیسرا ان کا مرتب کردہ نسخہ خواجہ ہوا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"نسخہ خواجہ نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا توأم ضرور ہے۔ لیکن یہ سید عبداللہ کے نسخے سے مماثل مگر اس سے مختلف ہے"۔

ایک نسخہ کو دوسرے کا توام بتانا اور دوسرے کا مماثل مگر مختلف قرار دینا بڑی عجیب بات ہے۔ یہ تو تثلیث کو وحدانیت کا درجہ دینے والی بات ہوئی۔ تاوقتیکہ ان کے الگ الگ ہونے کا کوئی قطعی و حتمی ثبوت سامنے نہ آئے اس وقت تک ان کی مماثلت ایک ہی ثابت کرتی ہے۔ اہل نظر کی اکثریت تینوں کو ایک ہی بتاتی ہے۔ معین الرحمٰن نے رشید حسن کے نام اپنے خط میں لکھا ہے کہ:

"نسخہ خواجہ کے بارے میں میرا پختہ یقین ہے کہ یہ غالب کی نظر سے گزرا ہے اور اگر یہ آپ کے ابتدائی اندازے کے مطابق عین مین نسخہ لاہور ہی معلوم ہوتا ہے تو پھر اس کے بارے میں عرشی صاحب کا مشاہدہ یہ ہے کہ اندرونی شہادت یہ ثابت کرتی ہے کہ اسے اول سے آخر تک میرزا صاحب نے پڑھا ہے اور اکثر جگہ اغلاط کتابت کی اصلاح بھی کی ہے۔

مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم نے جن سات مقامات پر غالب کے قلم کی گواہی دی ہے، وہ ساتوں صورتیں "نسخہ خواجہ" میں بھی من و عن موجود ہیں"۔

معین الرحمٰن کے اس اعتراف کے بعد نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور کے ایک ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ مولانا عرشی جسے نسخہ لاہور کہہ رہے ہیں، اس کے عکس قاضی عبدالودود پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری سے لے کر گئے اور مولانا عرشی تک پہنچائے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ان تین مزعومہ نسخوں کو غالب نے ایک ہی سن میں کس لیے لکھوایا؟ اگر یہ غالب نے لکھوائے تو انہیں کسے کسے اور کہاں کہاں بھیجا؟ اس کا جواب معین الرحمٰن کے پاس کچھ نہیں اور اس کا اپنے تعارف میں کہیں بھول کر بھی ذکر نہیں کیا۔ اس پہلو پر ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی نے بھی توجہ نہیں کی اور نہ یہ جستجو کی کہ غالب نے اپنا اُردو دیوان کسے کسے بھیجا؟ غالب کے فارسی اور اُردو خطوط میں دواوین بھیجنے کا ذکر موجود ہے۔ معین الرحمٰن کو تو اس پہلو پر توجہ دینی چاہیے

تھی۔ یہ تحقیق کی کوتاہی ہے کہ انہوں نے اس پہلو کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اگر یہ سب حضرات غالب کے خطوط میں اس امر کی جستجو کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ غالب نے اپنے قلمی و مطبوعہ دواوین کسے کسے بھیجے تھے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

گلِ رعنا مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر مرتب کی تو انہیں ضرور دی ہوگی۔ گلِ رعنا سے پہلے کے دو قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ایک نسخہ حمیدیہ دوسرا نسخہ شیرانی۔ ان دونوں کا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا۔

غالب کا اُردو دیوان پہلی مرتبہ دہلی میں مطبع سید المطابع میں ۱۸۴۱ء میں چھپا دوسری مرتبہ ۱۸۴۷ء میں مطبع دارالسلام دہلی میں اور تیسری مرتبہ مطبع احمدی دہلی میں ۱۸۶۱ء میں چھپا۔ انہی تین طباعتوں کے نسخے متعدد حضرات کو بھیجے گئے جن کا ذکر فارسی خطوط میں ہے۔ قوسین میں صفحہ نمبر کلیات نثر غالب مطبع نو لکشور کانپور ۱۸۸۸ء طبع چہارم کے درج کردیئے گئے ہیں۔

(۱) میجر جان جاکوب(۱۷۴) (۲) شہزادہ سلطان محمد خاں میسوری(۲۴۹) (۳) امین الدولہ آغا علی خان(۱۸۲) (۴) شیخ امام بخش ناسخ(۱۰۷) (۵) مولوی سراج الدین احمد خاں(۱۲۰) (۶) نواب علی بہادر خاں(۲۳۳) (۷) سلطان زادہ بشیر الدین میسوری(۲۴۳) (۸) نواب مختار الملک نائب والئی حیدر آباد(۲۴۶)

قلمی نسخے صرف دو حضرات کو لکھوا کر بھیجے گئے (۱) مہاراجہ جے پور (۲) نواب یوسف علی خان والئی رامپور۔

غالب نے نسخہ رامپور کے متعلق منشی شیونرائن کو بالتفصیل لکھا۔

(غالب کے خطوط، ۳: ۱۰۸۱)

> "اب تم سنو! دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خان بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کردی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بہ سبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا"۔

یہی نقل منشی شیونرائن کو بھیجی جسے انہوں نے ۱۸۶۳ء میں اپنے مطبع واقع آگرہ میں چھاپا۔ یہ دیوان کی طباعت پنجم ہے۔ یہ دیوان مرتبہ ضیاء الدین خان پر مبنی ہے۔ گویا

اس میں ۱۸۵۷ء تک کا کلام شامل ہے۔ اس کی ترتیب اصنافِ سخن دوسرے مطبوعہ نسخوں سے مختلف ہے۔ اس لیے یہ نسخہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ نسخہ لاہور میں ۱۸۵۲ء تک کا کلام ہے اس کے بعد کا نہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ۱۸۵۲ء تک کے کلام پر مبنی کون سا نسخہ ہے؟ جملہ محققین کی متفقہ رائے ہے کہ نسخہ لاہور میں ۱۸۵۲ء تک کا کلام ہے، بعد کا نہیں۔ معین الرحمٰن بھی اپنے مرتبہ دیوان غالب موسوم بہ نسخہ خواجہ میں اسی سن تک کا کلام بتاتے ہیں تو نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور ایک ہی قرار پاتے ہیں۔ ہم اس کو نسخہ جے پور کے نام سے متعارف کراتے ہیں کیونکہ اس نسخے کے علاوہ اور کوئی قلمی نسخہ کسی اور کو نہیں بھیجا گیا۔ اس نسخے کے متعلق جملہ کارروائی خطوط میں ملاحظہ فرمائیے۔

غالب اس زمانے میں بڑی مالی مشکلات میں مبتلا تھے۔ بے حد مقروض تھے۔ ان کی مالی مشکلات دور کرنے میں ان کے ہمدرد احباب، شاگرد، اعزا و اقربا سبھی کوشاں رہتے۔ حسب موقع خود بھی امداد کرتے اور امداد کے دیگر ذرائع بھی تلاش کرتے رہتے۔ غالب خود بھی امداد طلب کر لینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کے ایک شاگرد بابو جانی بانکے لال نے کئی مرتبہ مالی مدد کی ہے۔ چنانچہ خطوط بنام منشی ہرگوپال تفتہ میں ان کی امداد کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں ان سے ایک مخلص دوست نے جے پور سے لکھا کہ اخبار سلطانی میں تمہارا جو کلام چھپتا ہے، راجہ اسے پڑھتا اور پسند کرتا ہے۔ اگر تم اپنا دیوان راجہ کی نذر کرو تو دو چار ہزار بطور صلہ مل جائیں گے۔ اس دوست کی تحریر کا غالب نے اس خط بنام ہرگوپال تفتہ میں ذکر کیا ہے:

> "یکے از دوستان یک رنگے از جے پور بہ من نوشت کہ راجہ جواں دولت جواں سال گفتار ترا ہرچہ از روئے اخبار سلطانی بوے رسیدہ است عزیز میدارد و ترای خواہد۔ بدل گفتم از من کہ دریں باب از دوستاں و بیگانگاں مضائقہ نمی کنم، باوالی جے پور چرا دریغ رود۔ نخست بہ بابو صاحب نگاشتم، کہ میخواہم دیوان ریختہ بایک عرضداشت شوقیہ ارمغان راجہ سلطان نشان کردن...... اگر وکیل ریاست جے پور را بر آں می توانید آورد کہ ارمغان مرا بہ پیش گاہ مہاراجہ رساند من آں جز دے چند باورق کہ نامہ نام دارد، بشما فرستم۔ چوں بابو صاحب پذیرفتند آں نسخہ را بلوح و جدول و جلد چنانکہ بہ پیشکش ارزد آراستم"۔

(باغ دودر، ۲۴۳)

غالب. کا کلام سراج الاخبار وغیرہ میں چھپتا تھا۔ اخبار سلطانی سے یہی اخبار مراد ہے۔ اس کے علاوہ اردو اخبار دہلی میں چھپا کرتا تھا۔ چنانچہ غالب کی یہ غزل "نمایاں ہوگئیں پنہاں ہوگئیں" اردو اخبار اشاعت ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء میں چھپی تھی اور یہی اخبار سلطانی میں بھی۔ یہ غزل پڑھ کر راجہ خوش ہوا ہوگا اور غالب کی تعریف کی ہوگی۔ مخلص دوست نے راجہ کی پسندیدگی اور دلچسپی دیکھ کر لکھا ہوگا کہ راجہ کی خدمت میں اپنا اردو دیوان بھیجو۔ اس تحریک و ترغیب پر انہوں نے ستمبر کے آخر میں اپنا دیوان بطور تحفہ و نذرانہ پیش کرنے کے لیے کاتب کو دیا ہوگا۔ اس نے آخر نومبر میں دیوانِ غالب کی حسبِ منشا لکھ کر دیا ہوگا۔ کیونکہ خط مذکورہ کے بعد تفتہ کو ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو لکھا ہے:

"صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا۔ آج کل آ جائے گا۔ پھر اس کے جزودان کی تیاری کر کے روانہ کروں گا"۔

(غالب کے خطوط، ۱: ۲۴۷)

غالب نے دیوان عمدہ کاتب سے لکھوایا جس کی لوح منقش اور جدولیں رنگین بنوائیں۔ صحاف نے عمدہ جلد بنا کر دیوان، غالب کو دیا۔ غالب نے اس کے لیے عمدہ جزودان تیار کرایا۔ جب دیوان پیشکش کے لائق ہوگیا تو اسے ۱۷ دسمبر ۱۸۵۲ء کو بابو جانی بانکے لال کے پاس بھرت پور بذریعہ پارسل بھیج دیا کہ اسے کسی معتمد کے توسل سے راجہ کی خدمت میں پیش کرا دیں۔ چنانچہ تفتہ کو ۱۹ دسمبر ۱۸۵۲ء کو ترسیل دیوان کے متعلق لکھا:

"پریروز کہ روز آدینہ ہفدہم دسمبر بود، دیوان ریختہ با عرضداشت موسومہ راجہ سلطان نشان در اجمیر بخدمت بابو صاحب رواں داشتہ شد، تا کے رسد و پس از رسیدن چہ روئے دہد، در آرائش آں اوراق تنگ دلی نکردہ ام، مشت زرے بصرف آوردہ۔ ہم کتاب زرنگار و ہم جزودان نظر فریب"۔

(باغ دودر: ۱۶۵)

غالب دیوان کا پارسل پہنچنے کی اطلاع ملنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ آخر کار ۴ جنوری ۱۸۵۳ء کو دیوان کا پارسل پہنچ جانے کی اطلاع ملی تو تفتہ کو لکھا:

"نہاں نماناد کہ امروز سہ شنبہ چہارم جنوری آغاز سال عیسوی است۔ ساعتے بر نیم روز گزشتہ باشد کہ سرہنگ ڈاک آمد و نامہ شما و نامہ بابو صاحب

آورد- بند غم گسست و آرائش صورت بست- ہمیں قدری خواستم کہ رسیدن پارسل بدانم"۔

(باغ دودر: ۱۹۵)

منشی نبی بخش حقیر کو بھی دیوان کا پارسل پہنچنے کی اطلاع ۸ جنوری ۱۸۵۳ء کو دیتے ہوئے لکھا:

"ہاں صاحب! اجمیر سے خط آگیا- پارسل پہنچ گیا، تردد رفع ہوا- اب جو کچھ ہوتا ہے، وہ ہو رہے گا- محل تشویش و تردد نہیں"۔

(نادرات: ۳)

غالب کے لیے جے پور کا معاملہ ایسا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ جلد طے ہو جائے- وہاں سے کچھ مل جائے تو قرض سے سبکدوش ہو جائیں- دیوان ابھی راجہ کی خدمت میں پیش نہیں ہوا تھا- جانی جی نے راول شیو سنگھ کے ذریعہ راجہ کی خدمت میں دیوان پیش کرایا- اس کا حال تفتہ کو لکھا ہے:

"ڈاک کا ہرکارہ آیا- جانی جی کا خط لایا- اس کو پڑھا، اب مجھ کو ضرور ہوا کہ خلاصہ اس کا تم کو لکھوں- یہ رقعہ لکھا- خلاصہ بطریق ایجاز یہ ہے کہ عرضی گزری، دیوان گزرا، راول جی کے نام کا خط گزرا- راجہ صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے- جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا سعد اللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے، وہ مختصر جواب کا ہے"۔

(خطوط غالب از مہر: ۱۲۹)

غالب اس معاملے کے طے ہونے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے- مگر بیچ میں ایسے واقعات درپیش آئے کہ صلہ ملنے میں رکاوٹیں پڑتی رہیں اور وہاں سے صلہ کی رقم جو ملنے والی تھی، اس کے متعلق متردد تھے- منشی نبی بخش حقیر کے خط میں تفتہ کو لکھا:

"ہاں بھائی صاحب! اب میں جدا خط کیا لکھوں- ضرور یاد کر کر منشی ہرگوپال صاحب کو میری دعا کہو- اور یہ کہو کہ بھائی وہ تو میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں کہ اہالی راج جے پور نے ہردیو سنگھ سے بعد ہولی رخصت کرنے کا وعدہ کیا ہے...... نہیں معلوم کہ رخصت عمل میں آئی یا نہ آئی- اگر آئی تو جانی جی شاید اجمیر میں نہیں بھرتپور گئے ہوئے ہیں"۔

(نادرات: ۳۳)

ریاست کے انتظام میں فتور آ چکا تھا۔ تاخیر کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ حضرات جو غالب کے ہمدرد اور متوسل تھے، صاحب اقتدار نہ رہے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو ان حضرات کے الگ ہو جانے کے متعلق لکھنے کے بعد خط میں لکھا:

"اور یہ جو آپ لکھتے ہیں کہ راجہ تیرے دیوان کو پڑھا کرتا ہے اور پیش نظر رکھتا ہے یہ بھی تو آپ از روئے تحریر منشی ہَردیو سنگھ کہتے ہیں۔ ان کا بیان کیونکر دلنشیں ہو۔ وہ بھی جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپے نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے۔ ہولی ہوئی اور میں لے کر چلا۔ پھاگن، چیت، بیساکھ، نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے، آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی"۔

(خطوط غالب از مہر: ۱۳۲)

غالب جے پور سے ملنے والی رقم کی ہنڈوی ملنے کے لیے مضطرب و بے چین اور معاملہ میں تاخیر پر تاخیر ہو رہی۔ جانی جی نے تاخیر ہو جانے پر اپنی شرمندگی کا اظہار تفتہ کو ایک خط لکھ کر کیا۔ تفتہ نے وہ خط غالب کو بھیج دیا۔ غالب نے جواب میں لکھا:

"بابو صاحب کا خط تمہارے نام کا پہنچا۔ عجب تماشا ہے۔ وہ دیر کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں اور میں ان کے عذر چاہنے سے مرا جاتا ہوں۔۔۔ جے پور کے آئے ہوئے روپے کی ہنڈوی اس وقت تک نہیں آئی۔ شاید آج شام تک یا کل تک آ جائے۔ خدا کرے کہ وہ آبو پہاڑ سے ہنڈوی روانہ کر دیں۔ ورنہ پھر خدا جانے کہاں کہاں جائیں گے اور روپیہ بھیجنے میں کتنی دیر ہو جائے گی"۔ (خطوط غالب از مہر: ۱۳۳)

غالب جے پور سے ملنے والی رقم سے قرض چکانا چاہتے تھے اور قرض داروں سے وعدے پر وعدہ کرتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے سخت تقاضہ کر رکھا تھا۔ غالب پریشان ہو رہے تھے کہ کیا کریں؟ تفتہ کو خط میں لکھا:

"عجب تماشا ہے، بابو صاحب لکھتے ہیں کہ ہردیو سنگھ آ گیا اور پانسو روپے کی ہنڈوی لایا مگر اس کے مصارف کی بابت انتیس روپے کئی آنے اس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے۔ سو میں اپنے پاس سے ملا کر پورے پانسو کی ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں...... سو بھائی آج تک ہنڈوی نہیں آئی"۔

(خطوط غالب از مہر: ص ۱۳۳)

غالب ہنڈوی آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اسی عالم میں چار دن بعد تفتہ کو خط لکھا اور ہنڈوی کے متعلق یہ لکھا:

"یقین ہے کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنڈوی آ جاوے گا"۔

(خطوط غالب از مہر: ۳۴۳)

آخرکار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ غالب نے یہ خط تفتہ کو ۹ جون ۱۸۵۳ء کو لکھا تھا۔ اس کے بعد ۱۴ جون ۱۸۵۳ء کے خط میں ہنڈوی ملنے کی خبر دی جس سے معلوم ہوا کہ ہنڈوی ۱۲ جون کو انہیں مل گئی تھی۔ ہنڈوی سے روپیہ وصول پانے اور ان کے خرچ ہونے کی تفصیل تفتہ کو لکھی ہے:

ی "جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہردیو سنگھ کی مرضی اور پچیس کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے! بابو صاحب نے پچیس ہردیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرانہ لیے۔ بہرحال ہنڈوی بارہ دن کی میعادی تھی، چھ دن گزر گئے تھے، چھ دن باقی تھے مجھ کو صبر کہاں؟ متی کاٹ کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا، بہت سبکدوش ہوگیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں"۔

(خطوط غالب از مہر: ۳۴۵)

آپ نے اس نسخہ جے پور کی روداد ملاحظہ فرمائی۔ سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی نے ان خطوط کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ حیرت ہے کہ اس دیوان کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی طویل داستان سترہ خطوط میں مندرج ہے۔ خطوں کی یہ تعداد معمولی نہیں کہ ایک آدھ میں ذکر ہو اور ذہن میں نہ رہے۔ ان تینوں حضرات نے نسخہ کا معمولی تعارف کرایا۔ گہرائی میں نہیں گئے جیسا کہ خود سید عبداللہ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ ہم نے بھی ان سترہ خطوط میں سے کچھ کے ضروری اقتباسات درج کیے ہیں ورنہ پورے خطوط دیئے جاتے تو مضمون بہت طویل ہو جاتا۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم نے ایسا ہی مناسب سمجھا۔ آپ زیادہ تفصیل ان خطوط میں ملاحظہ فرمایئے جو باغ دودر، نادراتِ غالب، خطوط غالب از مہر اور غالب کے خطوط از خلیق انجم میں موجود ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ اتنے خطوط و ماخذات کی موجودگی میں معین الرحمٰن نے اس نسخہ کی تدوین کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ یہ نسخہ کون سا ہو سکتا ہے؟ اس کی وجہ

صرف یہ ہے کہ بجز مولانا مہر اور کسی نے جے پور سے پانسو روپے ملنے کا ذکر نہیں کیا اور وہ بھی سرسری طور پر۔ پانسو کی رقم بطور صلہ دیوان نہیں بلکہ بطور امداد ملنی بتائی ہے۔ (غالب از مہر: ۲۲۸) اس وجہ سے کسی محترم محقق کا خیال ان خطوط کی طرف مبذول نہیں ہوا کیونکہ اس طرف اشارہ نہیں کہ یہ رقم بطور صلہ دیوان مذکور ملی تھی۔ اس لیے معین الرحمٰن کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ حق تدوین جب ادا ہوتا کہ از خود نسخہ کی حقیقت معلوم کرتے۔ نسخہ کے متعلق ان کے تمام تر بیانات سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی کے بیانات کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ ان کے بیان کے خلاف عمل ملتا ہے۔ مثلاً قاضی عبدالودود نے ایک شعر کی نشاندہی کی ہے کہ یہ مخلوطے میں ہے متداول میں نہیں۔ نستعلیق کرتے وقت مخلوطے میں موجود شعر کو چھوڑ دیا اور متداول کا شعر نقل کر دیا۔ ایسا صرف اس وجہ سے ہوا کہ نسخہ عرشی یا کسی اور دیوان سے وہ شعر نقل کر دیا جو متداول میں تو ہے مگر مذکورہ نسخے میں نہیں ہے۔ العجب العجب۔ اسے کہتے ہیں کورانہ تقلید۔ یہی حال لوح، جدول اور منقش ہونے کا ہے۔ نہ لوح کی کوئی صراحت ہے اور نہ نقوش کی وضاحت اور نہ گل، بوٹے اور بیلوں کی حالت و کیفیت بیان کی ہے۔

میں نے نسخہ شیرانی کی منقش و رنگین لوح اور عود ہندی کے سادہ نقشین سرورق کے بیل بوٹوں وغیرہا پر تفصیلا روشنی ڈالی ہے۔ معین الرحمٰن ان دونوں سے رہنمائی حاصل کر سکتے تھے اور مذکورہ نسخہ کی کیفیات تزئین بیان کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اول تو انہوں نے ان تین بزرگوں نے جو کچھ لکھا اس کو نقل کر دیا اور اپنی دید و دانست سے کچھ نہیں لکھا۔ دوسرے یہ کہ وہ خطاطی و تزئین و آرائش کے فن سے عملاً اور علماً بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ وہ روش قلم اور تزئینی گلکاریوں کے انداز کو نہیں جانتے۔ ان کے فرق و اختلاف کو نہیں پہچانتے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس نسخہ کی بابت کوئی تفصیلی بات لوح کی کیفیت اور اس کے نقوش کی حالت کے متعلق نہیں لکھی۔

ہمارے پیش نظر اصل مخلوطہ نہیں اس کے عکس مبہم ملے ہیں۔ تاہم لوح کے متعلق ایک واضح بات بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں اور یہی بات اس کو نسخہ جے پور ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ متعدد مخلوطات کی الواح دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان کے لیے لکھا گیا ہے اگر تو اس کی ابتداء میں مسلمانوں میں متبرک کلمات لکھے جاتے، خواہ وہ لوحیں منقش ہوں یا سادہ ہوں، نسخہ شیرانی کی لوح منقش ہے۔ اس

کے تعویذ میں یا چھوٹی محراب میں "یا فتاح" لکھا ہوا ہے۔ اس سے نیچے دو سطر کے برابر منقش پٹی ہے۔ اس کے بعد ایک چوڑی پٹی میں "رب یسر" سرخ روشنائی سے اس کے بعد سیاہ روشنائی سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا ہے اور اس کے بعد "و تمم بالخیر" بھی سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ پٹی کی زمین سفید اور خالی جگہ میں زریں قوس نما بیل اور شاخیں ہیں۔ اس کے بعد ایک منقش پٹی ہے جس کی زمین سنہری ہے، جس پر بیل بنائی گئی ہے۔ پھول سرخ ہیں۔ اس کے بعد غزلیات شروع ہوئی ہیں۔ نسخہ امروہہ ثم بیاض غالب مطبوعہ نقوش لاہور غالب نمبر حصہ دوم اکتوبر ۱۹۶۹ء میں نسخہ کی ابتدا بھی "یا علی المرتضیٰ علیہ وعلیٰ اولادہ الصلوۃ والسلام" پہلی سطر اور دوسری سطر "یا حسن، بسم اللہ الرحمٰن، یا حسین" اور تیسری سطر "ابوالمعانی میرزا عبدالقادر بیدل رضی اللہ عنہ" سے خود بقلم غالب لکھی ہوئی ہے۔ مولانا عرشی نے نسخہ عرشی نقشِ ثانی میں یہی ابتدائیہ دیا ہے۔ مگر انہوں نے "ابوالمعالی" لکھا ہے۔ صحیح لفظ "ابوالمعانی" ہے، ابوالمعالی مہمل ہے۔ غالب نے گو اس میں ن کا نقطہ نہیں لگایا مگر ل کی کشیدہ شکل بھی نہیں۔ بلحاظ فن شعر "ابوالمعانی" ہی صحیح ہے۔ نثار احمد فاروقی نے نقوش کے اسی شمارے میں "بیاض غالب" کے زیر عنوان مضمون لکھا تو اس میں "ابوالمعانی" لکھا ہے، مگر جب نسخہ نستعلیق کیا گیا تو اس میں "ابوالمعالی" ہی لکھا ہے۔ (ص ۵۱) یہ نستعلیق کرنے والے کی غلطی ہے۔

ان دو مخطوطات کی طرح دیگر مخطوطوں میں بھی یہی عمل ہوا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ نسخہ جے پور، نسخہ لاہور اور نسخہ خواجہ کی منقش لوح کے تعویذ یا چھوٹی محراب اور اس کی تحتی پٹی میں کوئی متبرک کلمہ نہیں اور دونوں کو نقش و نگار سے کیوں مزین کیا گیا ہے۔ اگر غالب نے معین الرحمٰن کے احساس کے مطابق کئی نسخے لکھوائے تھے تو وہ کسے نذر کیے۔ معلومہ حد تک تو صرف ایک نسخہ لکھوانے کا ذکر خطوط میں اور وہ صرف مہاراجہ جے پور کی نذر کرنے کی خاطر نہایت اہتمام سے منقش و مزین مع عمدہ جزدان پیش کرنے کا تذکرہ خطوط میں پایا جاتا ہے اور اس کی تیاری میں معقول رقم صرف کی گئی۔ یہ کئی والی بات صرف اپنے مقبوضہ و مدونہ نسخہ کی اہمیت جتانے کی خاطر ہے۔ ورنہ معین الرحمٰن کئی ہونے کا ثبوت داخلی و خارجی ذرائع سے پیش کریں۔ صرف احساس و قیاس سے یہاں کام نہیں چلے گا۔ خارجی ذرائع یعنی غالب کے فارسی و اردو خطوط صرف ایک نسخہ کے لکھوانے کی شہادت مہیا کرتے ہیں اور وہ مہاراجہ جے پور کو نذر کیا جانے والا نسخہ ہے۔ داخلی شہادت نسخہ کی لوح میں کسی متبرک لفظ یا جملہ کا نہ لکھا جانا ہے جس

کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے کسی متبرک لفظ یا جملے کا لکھوانا اس لیے مناسب خیال نہیں کیا کہ وہ یہ نسخہ ایک غیر مسلم کو بطور نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ متبرک لفظ یا کلمہ پڑھ کر راجہ کی طبیعت پر ناگوار اثر پڑ گیا تو صلہ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ اس لیے انہوں نے اسی میں بہتری خیال کی کہ صرف منقش ہی رکھا جائے۔ اگر کسی مسلم کی پیشکش کا معاملہ ہوتا تو وہ متبرک الفاظ ضرور لکھتے۔ اگر یہ نسخہ کسی مسلمان کے لیے لکھوایا ہوتا تو تب بھی لوح میں متبرک کلمات ضرور لکھے جاتے۔ کلمات خیر و برکت کی عدم موجودگی سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسی غیر مسلم کے لیے لکھوایا گیا۔ ایسا معاملہ صرف مہاراجہ جے پور کے ساتھ پیش آیا۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ جے پور ہے۔

سید عبداللہ نے اپنے مضمون مطبوعہ ۱۹۵۴ء میں لکھا ہے کہ حال ہی میں یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں داخل ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند عمل پذیر ہوئی۔ اس کے بعد بھارتی حکومت نے ریاستوں، جاگیروں اور زمینداریوں کو ختم کیا۔ اسی کی زد میں ریاست جے پور بھی آئی۔ وہاں انتظامی تبدیلیاں ہوئیں اور بہت سے ملازمین کو برطرف یا تبدیل کیا گیا۔ اس کی بدولت وہاں افراتفری مچی۔ کوئی ضابطہ نہ رہا۔ ریاست کی بیشتر اشیاء جو جس کے ہاتھ لگیں، لے اڑا۔ اسی افراتفری کے زمانہ میں یہ نسخہ دیوان غالب جو بیش قیمت جزدان میں تھا، کسی کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے جزدان اور منقش جلد اور اس کے ساتھ سادہ اوراق کو دور کیا۔ نہ معلوم ان اوراق پر کیا کیا لکھا ہوگا۔ الغرض اس نسخہ کو لے کر وہ پاکستان آ گیا اور پنجاب یونیورسٹی میں فروخت کے لیے پیش کر دیا۔ اس پر کسی شخص کا نام نہیں تھا اس لیے اس لنڈ منڈ منقش نسخہ کو پنجاب یونیورسٹی نے خرید کر لائبریری میں داخل کر دیا۔ سید عبداللہ نے اس کا تعارف مضمون لکھ کر کرایا۔ قاضی عبدالودود نے اس نسخہ کے عکس ۱۹۵۷ء میں لاہور میں حاصل کیے۔ یہ عکس یقیناً سید عبداللہ کی نشاندہی اور تعاون سے حاصل کیے گئے ہوں گے۔ بھارت پہنچ کر یہ عکس مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو بھیج دیے۔ انہوں نے "نسخہ لاہور" کے نام سے اس کا تعارف اپنے مدونہ دیوانِ غالب (نسخہ عرشی) کے مقدمہ میں کر دیا۔ قاضی عبدالودود نے ۱۹۵۸ء میں ایک مضمون لکھا۔ مولانا عرشی نے بھی اسی سن میں مقدمہ دیوان میں تعارف لکھا اور قاضی عبدالودود کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے نسخہ شیرانی اور اس نسخہ کے عکس دیے۔ اس طرح اس نسخہ لاہور کے تین گواہوں کی گواہیاں موجود ہیں۔ لوح اور صفحہ ۲ الف کا عکس سید

عبداللہ نے شائع کرایا تھا۔ اس کو جب مزعومہ نسخہ خواجہ کے عکس سے ملایا تو بالکل مطابق پایا۔ ہمیں سر مو تفاوت نظر نہیں آیا۔ عین مین دونوں ایک ہیں۔ معین الرحمٰن جو جزوی اختلافات متن و شمار اشعار کے بتاتے ہیں تو سید عبداللہ سے گنتی میں غلطی ہوئی۔ مگر خود معین الرحمٰن نے متن اور شمار اشعار میں کتنی غلطیاں کی ہیں؟ یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ متنی اختلافات تو باآسانی پیدا کیے جا سکتے ہیں مگر لوح کی کیفیت نقوش و دیگر منقش سطور میں کوئی تبدیلی نہیں اور اگر یہ نسخہ لاہور سے الگ کوئی نسخہ تھا تو کچھ تو فرق ہوتا۔ فرق کا نہ ہونا دونوں کو ایک ثابت کرتا ہے جو فی الحقیقت نسخہ جے پور ہے۔ وہاں سے کوئی اڑا لایا۔ گویا پہلی مرتبہ یہ چرایا گیا اور لاہور بیچا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے سید عبداللہ نے اسے اپنے نام جاری کرایا، تعارفی مضمون لکھا۔ ۱۹۶۹ء میں معین الرحمٰن نے اشاریہ غالب لکھا تو انہیں بتایا گیا کہ یہ نسخہ سید عبداللہ کے پاس ہے۔ غالباً سید عبداللہ اسے مرتب کر کے چھاپنا چاہتے ہوں گے اور کسی وجہ سے وہ ایسا نہ کر پائے۔ اس کے بعد یعنی ۱۹۶۹ء کے بعد اس کا پتہ نہیں کہ کہاں گیا اور کیا ہوا؟ بہرحال لائبریری میں موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ سید عبداللہ کے پاس سے یا لائبریری سے اسے کسی نے اُڑا لیا، گویا یہ دوسری مرتبہ چرایا گیا۔

مزعومہ نسخہ خواجہ کے آخری صفحہ پر نیر کی تقریظ کے خاتمہ کے بعد منقش حصہ پر بیچوں بیچ کسی نامعلوم شخص "فتے دین، فتح دین" کے نام کی چیپی لگی ہوئی ہے۔ بظاہر یہ اظہار ملکیت کے لیے ہے۔ ملکیت کا اظہار عموماً ابتدا میں کیا جاتا ہے۔ اس کا اظہار آخر میں چیپی لگا کر کرنا کچھ عجیب سی بات ہے۔ صفحہ ا الف جو سادہ ہے اس پر یہ لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہ چیپی ظاہر کرتی ہے کہ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" معین الرحمٰن کی تحقیق کی پہلی منزل اس چیپی کو ہٹا کر اصل حقیقت معلوم کرنی چاہیے تھی جو انہوں نے نہیں کی۔ یہ اس امر کی غمازی کر سکتی ہے کہ معین الرحمٰن کو اس چیپی کی حقیقت کا علم تھا اور اس کے پیچھے جو راز پوشیدہ تھا، وہ اسے بھی جانتے تھے۔ چپکی ہوئی چیپی کا چھڑانا کوئی مشکل کام تو نہیں تھا جبکہ آج کل ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے والے طلبہ تک لفافوں سے ٹکٹ آبی عمل یا عمل تبخیر کے ذریعہ باآسانی اچھی حالت میں اتار لیتے ہیں تو پھر معین الرحمٰن جیسے "زیرک محقق" کے لیے یہ کون سا دشوار کام تھا؟ انہوں نے صرف اس وجہ سے اس چیپی کو الگ نہیں کیا کہ اس کے ہٹ جانے سے وہ پوشیدہ امر ظاہر ہو جاتا جسے وہ راز رکھنا چاہتے تھے اور جسے کسی "فتے دین، فتح دین" کے نام کے سہارے چھپایا گیا تھا۔

اس نسخہ پر کئی افتادیں پڑیں۔ پہلی افتاد اس کی پیشکش کے سلسلہ میں واقع ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ خطوط غالب (فارسی و اُردو) میں موجود ہے۔ دوسری افتاد جے پور میں تقسیمِ ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ ریاست جے پور سے کوئی اُڑا لایا اور پنجاب یونیورسٹی کو بیچ دیا۔ تیسری افتاد: لائبریری سے کسی نے کسی طرح اُڑا لیا جو شدہ شدہ معین الرحمٰن کے ہاتھ آیا۔ یہ مسروقہ نسخہ اب نسخہ مقبوضہ معین الرحمٰن ہے، جسے انہوں نے "نسخہ خواجہ" کے نام سے چھاپ کر اس کی بازیافت کی۔ طباعت اور پیشکش اچھی ہے۔ مقدمہ و تعارف اور متنی نستعلیق میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مختلف اہل الرائے نے اسے اور مولانا عرشی کے بتائے ہوئے نسخہ لاہور کو من و عن ایک قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ نسخہ جے پور ہے جس کا ثبوت غالب کے سترہ فارسی و اُردو خطوط میں موجود ہے۔

الحاصل یہ نسخہ جے پور ثم نسخہ لاہور، ثم نسخہ خواجہ ایک ہی مخلوطہ کے مختلف نام ہیں جو مسروقہ ہوتے ہوئے اب مقبوضہ ہوگیا۔ معین الرحمٰن نے اسے اپنے قبضہ میں لے کر اس کی بازیافت کی اور نسخہ خواجہ کے نام سے چھاپ دیا۔ بہرحال یہ مقبوضہ ہونے کے باوجود مسروقہ ہی رہے گا۔

خواجہ منظور حسین مرحوم مشہور انگریزی کے عالم کے نام سے منسوب کرکے "نسخہ خواجہ" کہنا اس لیے زیب نہیں دیتا کہ خواجہ منظور حسین نہ اس کے مالک تھے کہ بوجہ ملکیت اس کے نام سے منسوب ہوں جیسے حافظ محمود شیرانی کی ملکیت ہونے کی وجہ سے "نسخہ شیرانی" مشہور ہے اور نہ یہ مرحوم کا مدونہ ہے جیسے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مدونہ دیوانِ غالب "نسخہ عرشی" کہلاتا ہے۔ ، عقیدت کا اظہار بذریعہ انتساب کیا جاتا ہے، مرحوم کے نام سے موسوم کرنا تو مرحوم کی مدح بالذم ہے۔ وہ ان کے نام معنون کر سکتے تھے، جس کا اظہار انہوں نے "میرے کرم فرما" کے زیرِ عنوان منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ کیا ہے۔ کیا معین الرحمٰن "منسوب" اور "موسوم" کے فرق کو نہیں جانتے؟ کتنی عجیب بات ہے جس کے نام سے موسوم کیا جائے، اسی کے نام سے منسوب بھی کیا جائے۔ یہ خواجہ صاحب سے اظہارِ عقیدت کا کوئی اچھا طریقہ نہیں، بالخصوص اس حالت میں کہ نہ وہ مالک تھے اور نہ مرتب۔ مرحوم کے علمی مرتبہ کو اس سے ٹھیس پہنچتی ہے اور معین الرحمٰن اس عجیب و غریب حرکت کے مرتکب ہوئے، یہ مرحوم کی توہین و تذلیل کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ---- اصل حقائق

از ڈاکٹر تحسین فراقی

اور ____________

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ---- صحیح صورت حال

از ڈاکٹر معین الرحمٰن

ایک تقابلی جائزہ

ڈاکٹر عارف ثاقب

دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ - اصل حقائق از ڈاکٹر تحسین فراقی

------ اور ------

دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ - صحیح صورتِ حال از ڈاکٹر معین الرحمٰن

---- ایک تقابلی جائزہ ----

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا مرتب کردہ دیوانِ غالبؔ "نسخۂ خواجہ" (اصلاً نسخۂ لاہور) چھپ کر منظرِ عام پر آیا تو حلقۂ علم و ادب میں ایک شور برپا ہوا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس کی شدت کو بہت سے سچے محققین نے محسوس کیا۔ مسئلہ ایک دیوانِ غالبؔ کے "نسخۂ مسروقہ" کا تھا جو در حقیقت پنجاب یونیورسٹی لاہور لائبریری کی ملکیت تھا مگر وہ وہاں سے کسی دستِ گستاخ نے غائب کر دیا تھا۔ اگر یہ نسخہ غائب ہی رہتا تو اس "کسی دستِ گستاخ" کا سراغ نہ ملتا۔ مگر جب ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اُسے "نسخۂ خواجہ" کے نام سے شائع کر دیا تو گویا اُس مالِ مسروقہ کی بازیافت ہو گئی جو در حقیقت پنجاب یونیورسٹی، لاہور لائبریری کی ملکیت تھا اور جو در حقیقت "نسخۂ لاہور" تھا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس "درِ بے بہا" کو خود چوری کیا یا شیخ اکرام صاحب کی نجی لائبریری سے اُڑایا، یا یہ نسخہ لائبریری سے کسی طالب علم کے ذریعے ایشو کروایا گیا یا بقول اُن کے پُرانی کتابوں کے کسی بیوپاری سے حاصل کیا یہ معمہ اب معمہ نہیں رہا۔ کیونکہ معین الرحمٰن صاحب یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ پُرانی کتابوں کا وہ بیوپاری کون تھا؟ اب اوّل الذکر تین باتوں میں سے کوئی ایک بات دُرست ہے۔ وہ بات کون سی ہے؟ اِس کا بھید صرف معین الرحمٰن صاحب جانتے ہیں، لیکن ایک بات طے ہے کہ یہ دیوانِ غالبؔ کا نسخۂ خواجہ نہیں، نسخۂ لاہور ہے۔ رشید حسن خاں کا یہ جملہ بہت معنی خیز ہے کہ "ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا"۔ کسی شے کو خود چوری کرنا، یا چوری شدہ مال کو خریدنا، یا کہیں سے اُسے اُڑا لینا جرم ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معین الرحمٰن اِس جُرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

مَیں نے ابھی عرض کیا کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مرتب کردہ دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ (اصلاً نسخۂ

لاہور) کی اشاعت کے بعد حلقۂ علم و ادب میں ایک شور برپا ہوا۔ گزشتہ چھ سات ماہ سے لاہور، اسلام آباد، کراچی سے شائع ہونے والا کوئی ادبی اخبار، ادبی رسالہ اور دُوسرے قومی اخبار ایسے نہیں ہیں کہ جن میں تواتر کے ساتھ اِس موضوع پر نہ لکھا جا رہا ہو۔ اِس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اَدبی سطح پر بہرحال یہ ایک معمولی موضوع نہیں بلکہ غیر معمولی موضوع ہے۔ بعض دانشوروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نسخۂ خواجہ کو اتنی اہمیت نہ دی جائے اور اِس پر گفتگو بند کر دی جائے ورنہ قاطع برھان جیسی صورتحال پیدا ہو جائے گی۔ مگر کیا ایسا کہنے سے ہم ادبی دیانت کا ثبوت دے رہے ہیں؟ کیا حقیقتاً یہ موضوع اتنا ہی معمولی ہے کہ اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے؟ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے یہ بات ذہن میں ضرور رکھیئے کہ یہ دیوانِ غالبؔ کے ایک ایسے مسروقہ نسخے کا معاملہ ہے جِسے بددیانتی اور جعلسازی سے کسی دُوسرے نام سے شائع کر دیا گیا ہے جبکہ اُس کی حقیقت کچھ اور ہے۔ کیا اِس بات کا فیصلہ کرنا غیر ضروری ہے کہ یہ نسخۂ خواجہ ہے یا نسخۂ لاہور؟ کیا ڈاکٹر سید عبداللہ، امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود جیسے محققین کی اِس حوالے سے تحریریں بے معنی ہیں؟ اور اُنھیں محض ردّی کا ڈھیر سمجھنا چاہیئے؟ ہاں مصلحت کے تقاضے اور ہیں۔ مگر ادبی دیانت کے تقاضے بھی ذرا مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اُن تقاضوں سے صرفِ نظر کرنا ادب کی تاریخ کو مسخ کرنا ہوگا۔ چنانچہ بعض جرأت مند ادیبوں اور محققین نے اِس اہم ترین مسئلے پر تاریخی کاوشیں کی ہیں اور نسخۂ خواجہ کے مرتب کے لیئے بہت سے سوالات اُٹھا دیئے ہیں جن کے جواب فراہم کرنا اُن کی اخلاقی اور تحقیقی ذمہ داری بنتی ہے۔

اِس تاریخی تحقیقی کاوش کے ضمن میں ایک اہم نام ڈاکٹر تحسین فراقی کا ہے، جنھوں نے "دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ" کے حوالے سے ساٹھ (۶۰) صفحات پر مشتمل ایک مختصر کتاب تحریر کی اور آخری بارہ (۱۲) صفحات میں اِس نسخے کے حوالے سے بعض اہم عکس شائع کیئے۔ اِس مختصر کتاب کا نام "دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ۔ اصل حقائق" ہے۔ جِسے بک وائز لاہور نے شائع کیا۔ اِس سے قبل کہ ہم اِس مختصر کتاب میں اُٹھائے گئے سوالات کو اجمالاً پیش کر کے ان کا تقابل ڈاکٹر معین الرحمٰن کے دیئے گئے جوابات سے کریں، ایک اہم بات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ آپ ایمانداری اور دیانت داری سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی مختصر کتاب کا مطالعہ کریں آپ کو شروع سے آخر تک بحث کا ایک علمی انداز نظر آئے گا۔ کہیں بھی کوئی ذاتی نوعیت کا عناد دکھائی نہیں دیتا۔ مگر افسوس اِس بات کا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اِس مختصر کتاب کے جواب میں جو کتابچہ تحریر کیا اُس کا انداز کہیں بھی علمی نہیں رہا۔ فراقی صاحب نے اپنی مختصر کتاب میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا یا تو پُورا نام لکھا یا معین صاحب لکھا۔ مگر آپ اُن کے لکھے ہوئے کتابچے کا انداز دیکھ لیجیئے آپ کو معین صاحب کی جھنجھلاہٹ، غُصہ اور ہرزہ سرائی جگہ جگہ دکھائی دے گی۔ کیا یہ بات اُن کی اُس وضع داری کے خلاف نہیں جس کا تذکرہ بعض احباب کرتے ہیں؟ جو شخص علمی و ادبی سوالات کا جواب دینے کے بجائے گالیوں اور بددعاؤں پر اُتر آئے اُس کے کمزور پہلوؤں کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ خالی اور جعلی شخص گالیوں اور بددعاؤں کے سوا اور روئے بھی کیا سکتا ہے۔ بہرحال یہاں مجھے اس سے بحث

نہیں۔ میرا مقصود "دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ" کے ردِ عمل پر لکھی گئی ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کی مختصر کتاب "دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ اصل حقائق" اور اِس کے جواب میں ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کی تحریر کردہ مختصر کتاب "دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ ۔ صحیح صورتِ حال" کا تقابلی مطالعہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اُن تمام سوالات کے جوابات دیئے جو ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے اُٹھائے تھے؟ اور اگر دیئے تو کیا دیئے؟ اور جن کے جواب نہیں دیئے تو اُن سے چشم پوشی کی کیا وجوہات ہیں؟

تو آیئے پہلے ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کی مختصر کتاب میں اُٹھائے گئے مختلف سوالات کا مطالعہ کریں۔ مَیں اِنہیں ترتیب اور اِختصار سے پیش کر رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اِن کا تفصیلی مطالعہ اِس مختصر کتاب میں کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے بنیادی سوالات یہ تھے:

۱۔ یہ نسخہ (یعنی نسخۂ خواجہ) ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود کے متعارفہ "نسخۂ لاہور" (مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور) سے الگ کوئی نسخہ نہیں، عین مین وہی نسخہ ہے۔ اِس ضمن میں "دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ" کی نسخۂ لاہور سے غیر معمولی مماثلت کی طرف خود ڈاکٹر معین الرحمٰن تواتر سے اشارہ کر چکے ہیں۔

۲۔ نسخۂ لاہور کے ۶۴ اوراق یا ۱۲۸ صفحات ہیں۔ معین الرحمٰن صاحب نسخے کے صفحات ایک سو ستائیس ۱۲۷ بتاتے ہیں کیونکہ وہ قلمی نسخے کے پہلے خالی صفحے کو شمار میں نہیں لاتے۔

۳۔ اِس قلمی نسخے کے تعارف کی تمام جزئیات مشمولہ تحریراتِ سید عبداللہ، مولانا عرشی و معین الرحمٰن میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

۴۔ اِس قلمی نسخے کا سائز اور مسطر کی سطریں (۱۵) سید عبداللہ، مولانا عرشی اور معین الرحمٰن صاحب کے یہاں ایک ہی ہیں۔

۵۔ نسخۂ خواجہ کے نسخۂ لاہور ہونے کی ایک ناقابلِ تردید دلیل یہ ہے کہ اِس پر لکھنے والے چاروں حضرات نے نیّر کی تقریظ کے اختتامی پیرے کے جو الفاظ نقل کیئے ہیں وہ ایک جیسے ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ سے اشعار شماری میں غلطی ہوئی ہے۔

۷۔ قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور خود معین الرحمٰن صاحب کے متعارفہ نسخوں میں اشعار کی تعداد تقریظ کے آخری پیرے میں ایک ہی بیان ہوئی ہے تو یہ نسخے الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ اسی قلمی نسخے پر سید عبداللہ کے تعارف نامے کے چار برس بعد قاضی عبدالودود نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اسی نسخے پر شذرہ لکھا۔

۸۔ برعظیم کے ممتاز محقق رشید حسن خاں نے سید عبداللہ کے تعارف کو ناقص بتایا ہے اور معین الرحمٰن کے متعارفہ نسخۂ خواجہ کو "عین مین نسخۂ لاہور" سے تعبیر کیا ہے۔ معین الرحمٰن اور رشید حسن خاں کی مراسلت سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں ایک لمحے کے لیئے بھی اس بات کے

قائل نظر نہیں آتے کہ نسخہ خواجہ نسخہ لاہور سے الگ کوئی نسخہ ہے۔

۹۔ رشید حسن خاں کے اِس جملے کے کیا معنی ہیں کہ "ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا"۔

۱۰۔ نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور کے اختلافات نُمایاں کرنے کے اضطراب میں معین صاحب، عرشی صاحب کا نسخۂ لاہور پر لکھا ہوا مختصر تعارف نامہ بھی غور سے نہیں پڑھ سکے۔

۱۱۔ معین صاحب کو یہ قلمی نسخہ کہاں سے ملا؟

۱۲۔ نسخۂ خواجہ کے صفحہ نمبر ۲۲ کا زیریں حصہ کھرچا گیا ہے۔ اس جگہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کا ایکسیشن نمبر تھا۔ صفحہ نمبر ۲۲ کا زیریں حصہ کیوں کھرچا ہوا ہے؟

۱۳۔ معین صاحب نے یہ کہا ہے کہ "نسخۂ خواجہ، نسخۂ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا توآم ضرور ہے اس کا مطلب سوائے اِس کے کچھ نہیں کہ یہ نسخۂ لاہور ہے۔

۱۴۔ اِس مشکوک (یا مسروقہ) مال کی خرید پرُانی کتابوں کے کس کاروباری سے کس اصول کے تحت کی گئی اور اِن حالات میں کیا اِس کا موجودہ مالک قانون کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔

اِن بنیادی نکات کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی نے معین الرحمن کی تحقیقی و تدوینی لغزشوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان لغزشوں کا جواب بھی معین الرحمٰن صاحب کو دینا تھا کیونکہ شاید وہ اپنی پہچان ایک محقق کے طور پر بھی کرتے ہیں۔ یہ لغزشیں کیا ہیں، ایک نظر انہیں بھی دیکھ لیں۔

۱۵۔ معین الرحمن نہ تو قلمی نسخے کا متن زیادہ توجہ سے دیکھ پائے اور نہ اس کی اطمینان بخش بازنوشت (Transcription) ہی کرسکے۔

۱۶۔ معین الرحمٰن صاحب موزوں طبع نہیں ہیں۔ ایسا شخص جو مصرع وزن میں نہیں پڑھ سکتا وہ اشعار کے متن کی تدوین کیونکر کرسکتا ہے۔ اس ضمن میں فراقی صاحب نے متعدد اشعار اور مصرعے نسخۂ خواجہ سے نقل کیے ہیں جو ناموزوں ہیں۔ نسخہ خواجہ کے علاوہ بھی فراقی صاحب نے معین صاحب کی دیگر مرتبہ کتب میں سے اُن کے ناموزوں طبع ہونے کی مثالیں فراہم کی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے (حاشیہ صفحہ ۳۹۔۴۰)

۱۷۔ نسخہ خواجہ میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ تراکیب کا غلط اندراج اور رموزِ اوقاف سے عدم واقفیت کی بے شمار مثالیں نسخہ خواجہ میں موجود ہیں۔ فراقی صاحب نے اس کا بھی مکمل گوشوارہ دیا ہے۔

۱۸۔ مرتب یعنی معین الرحمن غالب کے تصوراتِ لغت و املا سے زیادہ واقف معلوم نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایسے الفاظ اور اشعار کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

تدوین متن شعر میں اغلاط کی نشاندہی کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی مختصر کتاب میں نسخۂ خواجہ کے دیباچے کے کچھ اور پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مثلاً:

۱۹۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے نسخہ خواجہ کے علاوہ پرُانی کتابوں کے ایک کاروباری سے جو دو اور قلمی نسخے

حاصل کیئے ان میں سے ایک فارسی مخطوطے "معارج النبوۃ" کے کوائف حتیٰ کہ مصنف کا نام تک غلط لکھا ہے۔

۲۰۔ معین صاحب نے اشعار کی تعداد ۱۵۴۸ بتائی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ قطعات کے منظوم فارسی عنوانات کو شامل کر لیا جائے تو اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵۰ سے کچھ اُوپر بن جاتی ہے۔ فراقی صاحب کے نزدیک معین الرحمٰن نثر کی مقفّی عبارت کو منظوم عبارات سمجھ بیٹھے ہیں۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ کسی شعری مخطوطے کی تدوین وہ شخص کر رہا ہے جو نثر اور شعر میں امتیاز کرنے سے قاصر ہے۔

۲۔ فارسی زبان سے ناواقفیت کے سبب مرتب نے غالب کے مختصر فارسی دیباچے اور نیتر رخشاں کی تقریظ کی بازنوشت میں بھی کئی مقامات پر ٹھوکریں کھائی ہیں (فراقی صاحب نے اس کی مثالیں صراحت کے ساتھ دی ہیں)

۲۲۔ غالب کے فارسی دیباچے اور نیتر کی فارسی تقریظ کے اردو تراجم معین صاحب کے اپنے قلم سے نہیں ہیں — یہ تراجم پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ معین صاحب نے مختصر فارسی دیباچے کا جو ترجمہ تشکیل دیا اس کا زیادہ تر حصہ ڈاکٹر ظہور الدین احمد کے ترجمے کا چربہ ہے۔ (فراقی صاحب نے دلائل سے اسے ثابت کیا ہے)۔

۲۳۔ دیوان غالب نسخہ خواجہ کے آخر میں مزید مآخذ کے زیرِ عنوان آٹھ کتابوں کے نام درج ہیں جن میں سے تین کا اندراج بے محل ہے۔ کیا مرتب پر مآخذ کے معنی روشن نہیں۔ جن کتب کے حوالے ہی موجود نہ ہوں کیا انہیں مآخذ کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے؟

میری دانست میں دیوانِ غالب نسخہ خواجہ (اصلاً نسخہ لاہور) کے حوالے سے یہ وہ بنیادی نکات اور سوالات تھے کہ جن کے جوابات معین صاحب پر قرض تھے۔ کیا ڈاکٹر معین الرحمٰن اپنی مختصر کتاب میں (کہ جو فراقی صاحب کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی) ان سوالات کے جوابات دے سکے؟ اس کا جائزہ لینے سے پہلے دو تین اور سوالات کو پیش کرنا ضروری ہے جن کا تعلق نسخہ خواجہ سے تو نہیں مگر معین الرحمن صاحب کے نام نہاد تحقیقی کارناموں سے ضرور ہے۔ چونکہ یہ بھی فراقی صاحب کی اس کتاب میں موجود ہیں لہٰذا ان کا جواب دینا بھی معین صاحب کا فرض تھا۔ وہ سوالات یہ ہیں۔

معین صاحب نسخے کے صفحہ نمبر ۲۲ کو کہ جہاں پنجاب یونیورسٹی کا ایکسیشن نمبر تھا کھرچ سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے

۲۴۔ رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر بنائی۔

۲۵۔ پرتھوی چندر کی کتاب جاگیر غالب کو اپنے نام سے شائع کیا۔

۲۶۔ بشریٰ باسط کے ایم اے اردو کے مقالے بعنوان ادا جعفری شخصیت اور شاعری کا بڑا حصہ نقوش لاہور میں اپنے نام سے شائع کیا۔

ان کے علاوہ معین صاحب سے سرزد ہونے والے ایسے ہی دیگر افسوسناک کاموں کو فراقی

صاحب نے آئندہ پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ اُن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن درج بالا چند سوال بھی فراقی صاحب نے اپنی کتاب میں اٹھائے تھے اس لیئے ان کے جواب دینا بھی معین صاحب کا اخلاقی فرض تھا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی اس مختصر کتاب کے شائع ہونے کے بعد علمی و ادبی حلقے متحرک ہوئے۔ ادبی رسائل و جرائد نے اس معاملے کو سنجیدگی سے لیا۔ اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ معین صاحب اپنی روایتی خاموشی سے کام لیتے اور کسی بھی سوال کا جواب نہ دیتے۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ مگر اب کی بار لوگوں کا دباؤ اُن پر بڑھتا رہا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اُن کے لیئے جواب لکھنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ انہوں نے جواب لکھا۔ اُن کا جواب بھی ایک مختصر کتاب کی صورت میں "دیوانِ غالبؔ نسخہ خواجہ۔ صحیح صورتِ حال" کے عنوان کے تحت ان کے اپنے ہی اشاعتی ادارے الوقار پبلی کیشنز لاہور سے مئی ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ یہ مختصر کتاب ۶۴ صفحات پر مشتمل تھی۔ لوگ معین الرحمن صاحب سے جواب کی توقع کر رہے تھے مگر ایک مرتبہ پھر معین صاحب نے دوسروں کے اقتباسات ہی درج کرنے پر اکتفا کیا اور اصل معاملے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بظاہر اُن کا یہ جواب ایک اور سوال کو جنم دیتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا یہ جواب ہے؟ (یہ پر زور دے کر پڑھیئے کئی اور مفہوم نکلیں گے)

آیئے دیکھتے ہیں کہ معین صاحب نے فراقی صاحب کے کس سوال کا جواب دیا اور کن کن سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ معین صاحب کا کہنا ہے کہ:

۱۔ اس میں (یعنی نسخہ خواجہ کی تدوین متن میں) کتابت اور اعراب کے ضبط کی معمولی لغزشوں کو نکال دیں تو قابلِ قبول باتیں دو چار سے زیادہ نہیں رہ جاتیں۔"

فراقی صاحب نے حقیقتاً تدوینِ متن کی بیسیوں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ میں نے گزشتہ اوراق میں سوالات کا جو خلاصہ پیش کیا ہے۔ ان میں سوال نمبر ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ دو چار غلطیاں نہیں بے شمار غلطیاں ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ معین صاحب ہر ایک بات کا جواب دیتے۔ جبکہ ان پانچ سوالات کا جواب محض درج بالا ایک جملے میں ہے۔ آپ یہ تمام سوالات پڑھیئے پھر ان کی تفصیل فراقی صاحب کی مختصر کتاب میں دیکھیئے اور اندازہ لگایئے کہ کیا یہی جواب دیا جانا مناسب تھا۔ البتہ معین صاحب نے معمولی لغزشوں کا اعتراف ضرور کیا ہے اور دو چار باتوں کو قابلِ قبول کہا ہے۔ اگر وہ مزید غور فرمائیں تو انہیں نسخہ خواجہ کی تدوین متن اور مفہوم کی نارسائیوں اور تسامحات کی تعداد بیسیوں ہی نظر آئے گی۔ نمبر ۱ کے تحت معین صاحب کا درج بالا جملہ محض ایک بات ہے، فراقی صاحب کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ غور سے مطالعہ کرنے اور اغلاط کی نشاندہی کرنے کو معین صاحب خردہ گیری کہتے ہیں تو اس کا فیصلہ اُن کی علمی استعداد پر چھوڑیئے۔

۲۔ معین صاحب نے فراقی صاحب کے ہماری ترتیب کے مطابق سوال نمبر۱۵ کے جواب میں یہ کہا ہے کہ کتابت کی خفی فروگزاشتوں اور اعراب کے اہتمام پر میں فراقی صاحب کے بیشتر اعتراضات سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی مثال میں انھوں نے استفہامیہ انداز کے تین مصرعوں کی مثال دی ہے اور پھر اپنا فیصلہ دیا ہے کہ "ان کے آخر پر استفہامیہ نشان لگنا چاہئے تھا یا نہیں یہ میں قاری کے ذوق پر چھوڑتا ہوں۔" قطع نظر اس کے کہ رموزِ اوقاف کا دُرست استعمال بھی قواعد کے اصولوں میں سے ایک ہے، غالبؔ کے استفہامیہ انداز کو متعین کرکے مفاہیم کی جو جہتیں اُجاگر ہو سکتی ہیں اُن کے بارے میں معین صاحب کیا کہتے ہیں؟ اگر تمام کچھ قاری کے ذوق ہی پر منحصر ہے تو پھر ناقدین اور محققین تو فارغ ہوئے!

۳۔ فراقی صاحب نے اپنی مختصر کتاب کے صفحہ ۳۷ (معین صاحب نے صفحہ ۳۶ لکھا ہے) پر متن کی بازنوشت کرتے وقت رہ جانے والے الفاظ کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ انھیں قلابین میں لکھا جانا چاہئے۔ معین صاحب نے کہا ہے کہ نسخۂ خواجہ کے تعارف میں صفحہ ۲۲، ۲۳، ۲۴اور ۲۴پر یہ موجود ہیں۔ فراقی صاحب نے مثالیں تدوین متن میں سے صفحہ ۳۴، ۳۸، ۶۳، ۶۶، ۱۰۶، ۱۱۵اور ۱۱۶سے دی ہیں۔ اگر معین صاحب نے تعارف میں یہ اہتمام کیا ہے تو پھر تدوین متن میں کیا اس کا استعمال غیر ضروری تھا؟ کیا یہ تدوین متن کا اہم ترین اصول نہیں؟ دیکھئے سوال کچھ ہو رہا ہے جواب کچھ دیا جا رہا ہے۔ یہ ہماری ترتیب کے سوال نمبر ۱۷کا جواب تھا۔ کیا یہ جواب بنتا ہے؟

۴۔ فراقی صاحب نے کہا تھا کہ معین الرحمٰن موزوں طبع نہیں لہٰذا انھوں نے بعض مصرعے اور اشعار بے وزن کر دیئے ہیں۔ (دیکھئے ہماری ترتیب میں سوال نمبر۱۶) معین صاحب جواب یہ دیتے ہیں کہ "اصل حقائق کے صفحہ ۱۴۱ پر کم از کم سات مصرعے ایسے ہیں جنھیں (فراقی صاحب) نے ناموزوں یا غلط ٹھہرایا ہے" پہلی بات تو یہ کہ فراقی صاحب نے اس اعتراض کو صفحہ ۱۴۱ سے نہیں ۴۰ سے شروع کیا ہے۔ یہ صفحہ ۴۲ تک جاتے ہیں۔ اور ان میں سات مصرعے نہیں بلکہ ۱۸ سے زائد مصرعے اور اشعار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ معین صاحب نے سات کس بنیاد پر کہا ہے؟ معین صاحب کا یہ کہنا ہے کہ نسخۂ خواجہ کے متن میں یہ بالکل درست ضبط ہوئے ہیں، تو پھر متن کے بعد یہ ناموزوں کیوں ضبط ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اصل متن اُن کے سامنے نہیں تھا۔ فراقی صاحب نے نسخۂ خواجہ کا صفحہ نمبر دے کر اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ معین صاحب بھی ایک ایک مثال کا جواب دیتے۔ فراقی صاحب مثالیں دے کر دعویٰ کر رہے ہیں۔ معین صاحب بغیر دلیل کے بات کرکے پھر اُلجھاؤ پیدا کر رہے ہیں۔ دو سطریں اس بہت بڑے اعتراض پر لکھ کر معین صاحب ایک جملہ یہ لکھ رہے ہیں "کم تر یہی صورت (فراقی صاحب) کے دوسرے ادعات اور اظہارات میں دکھائی دیتی ہے" کون کون سے ادعات اور اظہارات؟ فراقی صاحب نے کھل کر اظہار کیا ہے، مثالوں اور دلیلوں سے کیا ہے۔ معین صاحب بین السطور کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ یہ جواب نہیں گول

سول اعتراف جرم ہے۔ (قارئین ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ میں بریکٹ میں جہاں (فراق صاحب) لکھ رہا ہوں یہاں معین صاحب نے کچھ اور لکھا ہے۔ میں وہ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ ایسا لکھنا صرف معین صاحب ہی کو زیب دیتا ہے۔)

۵۔ فراق صاحب (ہماری ترتیب میں سوال نمبر۲۲) کے جواب میں معین صاحب نے بجائے جواب دینے کے دو تین لوگوں کے اس بارے میں تحسین آمیز جملے درج کر دیئے ہیں۔ فراق صاحب نے معین صاحب کے مختصر فارسی دیباچے کا زیادہ تر حصہ ڈاکٹر ظہور الدین احمد کا چربہ بتایا ہے۔ جواب تو اس بات کا دینا تھا لوگوں کے تحسین آمیز اقتباسات تو درج نہیں کرنے تھے۔ جس کے نتیجے میں یہ سوال اب بھی ایک سوال ہے۔ اپنی مختصر کتاب کے صفحہ ۱۹ اور ۲۰ پر معین صاحب نے جو جواب اور اقتباسات درج کیئے ہیں اُنہیں آپ خود پڑھ لیں۔ میں یہاں اُنہیں نقل در نقل کے مرحلے سے نہیں گزارنا چاہتا۔ ہاں اُن کا ایک جملہ اُن کے لیئے بھی مفید ہے جو بقول کسے اُنہیں یاد آیا کہ "خلیفہ" بن کر کام کرنے کی تلقین کرتے رہنا ممکن ہے، اہم بات ہو مگر خود کچھ کرکے دکھانا اور کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اہم تر بات ہے۔" یہاں بھی معین صاحب سے ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی ہے جسے یقیناً وہ سہو کاتب کہیں گے۔ درج بالا جملے میں "ممکن ہے" کے بعد قومہ لگایا گیا ہے اگر یہ قومہ "اہم بات ہو" کے بعد لگتا تو بامعنی ہوتا۔ یہ بھی شاید رموز او قاف کا مسئلہ ہے۔ بہرحال ترجے کو "تشکیل" دینا اور خود کچھ کرکے دکھانا دو مختلف باتیں ہیں۔ معین صاحب نے ترجے کو تشکیل دیا ہے خود کچھ نہیں کیا۔ اس لیئے یہ بھی ان کا اعتراف ہی ہے۔

۶۔ معین صاحب نے سوال نمبر۱۹ کا جواب صفحہ ۲۰ پر دیا ہے اور یہ کہا ہے "اس ضمن میں اُن کی یعنی فراق صاحب کی اطلاعات محدود اور مستعار ہیں اس لیئے اگر ناقص، ناتمام ہیں تو قابلِ معافی ہیں۔" فراق صاحب نے اس عہد کے ایک سچے، ممتاز اور گوشہ نشیں محقق خلیل الرحمٰن داؤدی کے حوالے سے یہ معلومات درج کی ہیں۔ یہ داؤدی صاحب وہی ہیں جن کے چرنوں میں خود معین صاحب بھی بیٹھتے رہے ہیں۔ چلئے مان لیا کہ "معارج النبوۃ" کے حوالے سے فراق صاحب کی معلومات مستعار ہیں اور فراق صاحب کا شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے دیا گیا حوالہ بھی درست نہیں تو پھر معین صاحب ثبوت کے ساتھ اسے ثابت تو کرتے۔ وہ اپنے حق میں کوئی مستعار دلیل ہی دے دیتے۔ مگر شاید اس حوالے سے کسی کا اقتباس اُن کی دسترس میں نہ تھا۔ ورنہ کیا وہ اُسے درج کرنے میں دیر لگاتے؟ ایک یہی تو کام ہے جو وہ تیزی سے کر سکتے ہیں۔

۷۔ فراق صاحب نے نسخہ خواجہ میں کتابت کی بے شمار غلطیوں کی طرف اشارہ کیا تھا (دیکھئے سوال نمبر۱۷ اور ۲۰) نسخہ خواجہ میں "قطعات کے منظوم فارسی عنوانات" لکھا گیا ہے۔ یہاں معین صاحب نے جواب دیا ہے کہ "نیم منظوم فارسی عنوانات" بقول اُن کے "نیم" کا لفظ کتابت سے رہ گیا۔ چلیں تھوڑی دیر کے لیئے مان لیا کہ اتنا اہم لفظ اُن کی نظر میں نہیں آیا۔ مگر وہ یہ تو بتائیں کہ "نیم منظوم

فارسی عنوانات" کیا ہوتے ہیں؟ یعنی "نیم منظوم" کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ اوزان کی کوئی نئی صورت ہے؟ اُن کا یہ بتانا اس لیئے بھی ضروری ہے کہ آج کا جدید شاعر تو پہلے ہی اوزان کی پابندیوں سے گھبراتا ہے۔ شاید انھی کے لیئے معین صاحب نے "نیم منظوم" کی آسانی فراہم کی ہے۔ ورنہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ منظوم یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ جو نثر وزن میں ہو وہ منظوم جو نہ ہو وہ نثر۔ اب یہ بیچ والی صورت یعنی "نیم منظوم" کی صراحت معین صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ فراقی صاحب نے اپنی مختصر کتاب کے صفحہ ۳۹ پر تین مثالیں درج کی ہیں۔ ان تینوں نثر کے ٹکڑوں کو (جنھیں کاتب نے اُوپر نیچے لکھ کر معین صاحب کے لیئے بھٹکنے کا سامان پیدا کر دیا ہے) معین صاحب "نیم منظوم" کہتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں معین صاحب سے اشعار شماری میں غلطی ہوئی ہے۔ ہماری دانست میں دانستہ طور پر معین صاحب نے ایسا کیا ہے۔ یعنی اس کے باوجود کہ وہ منظوم اور نیم منظوم کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ ایسا کرنے کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ نسخہ خواجہ کو ایک جدا نسخہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ صفحہ ۳۹ اور ۴۰ کے حاشیئے پر فراقی صاحب نے معین صاحب کے درج کیئے ہوئے غالب کے کچھ اور مصرعے بھی درج کیئے ہیں جو ناموزوں ہیں۔ فراقی صاحب نے درست مصرعے بھی لکھے ہیں اور معین صاحب نے جہاں جہاں یہ ناموزوں مصرعے درج کئے ہیں فراقی صاحب نے ان کا حوالہ بھی دیا ہے۔ معین صاحب نے اس کا جواب کیوں نہیں دیا؟ معین صاحب کی مختصر کتاب کے صفحہ ۲۱ پر اس ضمن میں جو اُلجھاؤ ہے اُسے ایک عام قاری بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ ادب کے سنجیدہ قاری کی تو بات ہی اور ہے "نیم" کا لفظ کتابت سے رہ جانے کے حوالے سے مجھے ایک کتاب "نذر نظیر" یاد آ گئی۔ اس کتاب کے صفحہ ۷۲ پر معین صاحب نے لکھا ہے کہ "مجھے لاہور، علی گڑھ، لکھنؤ اور الہ آباد کی جامعات میں اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا"۔ سُنا ہے اب وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ "جامعات میں" کے بجائے "جامعات کے" تھا۔ کاتب نے غلط لکھ دیا۔ ملاحظہ فرمائیں "میں" سے کیا معنی بنتے ہیں اور "کے" سے کیا؟ لیکن یہ اس وقت کہا جب اعتراض اٹھا۔ میں حیران ہوں کہ معین صاحب سے ایسی غلطیاں پروف ریڈنگ میں کیونکر رہ جاتی ہیں؟ جن سے علم رکھنے والا چکرا جاتا ہے اور علم نہ رکھنے والا متاثر ہوتا ہے۔

فراقی صاحب نے معین صاحب کی فارسی سے عدم واقفیت کی جو بات کی تھی تو اس کا جواب معین صاحب نے یہ دیا ہے کہ اُن کے زمانہ طالب علمی میں ایم اے میں یونیورسٹی کے نصاب میں فارسی اور عربی کا ایک پورا لازمی پرچہ ہوتا تھا۔ وہ صفحہ ۲۱، ۲۲ پر لکھتے ہیں "اس کے باوجود کبھی اور کہیں میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں فارسی کا منتہی ہوں یا مجھے فارسی آتی ہے۔ مجھے تو اردو دانی کا بھی کوئی دعویٰ نہیں۔"

پہلی بات تو یہ کہ ایم اے میں فارسی کا پرچہ لازمی ہونا یہ کب ثابت کرتا ہے کہ معین صاحب کو فارسی پر دسترس ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ دستنبو کا ترجمہ خود کرتے۔ آج کل تو وہ ایم اے کی کلاسوں کو تحقیق و

تدوین کے اصول بھی پڑھاتے ہیں۔ تو اس کے معنی یہ کب ہوئے کہ وہ تحقیق و تدوین کے اصولوں سے واقف ہیں۔ کیونکہ اگر وہ واقف ہوتے تو اسے اپنی تحریروں میں ثابت بھی کرتے۔ جبکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کے بنیادی اصولوں کے عملی انطباق کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

۸۔ فراقی صاحب نے سوال نمبر ۱۱ اور ۱۴ کی رو سے نسخہ خواجہ کو مسروقہ نسخہ ٹھہرایا ہے۔ جس کو جدا ثابت کرنے کے لیئے معین صاحب نے ترمیم کی۔ جس کی وضاحت فراقی صاحب نے صفحہ ۱۹ اور ۲۰ پر کی ہے۔ معین صاحب نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے۔ "میں اس کا حساب خدائے لایزال پر چھوڑتا ہوں۔ انہوں نے بڑی گرد اڑائی ہے اور فضا بنائی ہے۔ تصحیف، تحریف، تصریف، جعل، بدگمانی، کم علمی کے سارے جالے اور شاخسانے اُنہیں مبارک"۔ لاحول ولا قوۃ سیدھے سیدھے سوال کرتا ہوں۔ اُلٹے اُلٹے جواب آتے ہیں۔ معین صاحب کو یہ بتانا تھا کہ یہ نسخہ انہوں نے پرانی کتابوں کے کس کاروباری سے کس اصول کے تحت خریدا؟ کیونکہ یہی تو وہ سوال ہے جو نسخہ خواجہ کو جعلی ثابت کرتا ہے اور اس میں تصحیف، تحریف، تصریف، بدگمانی اور کم علمی کے شاخسانے پیدا کرتا ہے۔ محض اتنا کہہ دینا کہ انار کلی کے فٹ پاتھ سے یہ نسخہ اُنہیں ملا، کافی تو نہیں ہے۔ اتنا کہہ دینے سے تحقیق کے تقاضے تو پورے نہیں ہوتے۔ یہ فتح دین "فتے دین کے نام کی چیپی کے نیچے کیا تھا؟ کیا معین صاحب کے لیئے یہ جاننا ضروری نہیں تھا؟ صفحہ نمبر ۲۲ کی اختتامی سطور کیوں چھیلی ہوئی ہیں؟ کیا اس کی وضاحت تحقیقی اعتبار سے ضروری نہیں تھی؟ معین صاحب کہتے ہیں "اس پر کسی معروف یا معلوم مالک کا نام درج نہیں تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ فتح دین / فتے دین کی چیپی کے نیچے اصل مالک کا نام یعنی پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی مہر چھپی ہوئی ہے۔ فراقی صاحب نے اس کا عکس اپنی کتاب کے صفحہ ۷۰ پر دیا ہے۔ کیا اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیئے اور جعل سازی کا پردہ چاک کرنے کے لیئے معین صاحب خود اس صفحے کا کاربن ٹیسٹ کروائیں گے؟ یا لینز کی مدد سے اُس کے نیچے چھپی ہوئی حقیقت کو دیکھنے کا اہتمام کریں گے؟ اس کے لیئے تو لیمینیشن کو اُکھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ معین صاحب نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر کو نسخہ پیش کرنے سے قبل اُسے لمینیٹ کروا دیا ہے۔ یہ محض اس لیئے کہ کوئی اس چیپی کے نیچے چھپی تحریر نہ پڑھ سکے۔ مگر شاید انہیں علم نہیں کہ آج کے زمانے میں یہ کام اب مشکل نہیں رہا۔ کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں معین صاحب؟ معین صاحب نے صفحہ ۴۰ پر فراقی صاحب کی کتاب کے آخر میں دیئے گئے مختلف صفحات کے عکس کو ایک اچھی پیش رفت کہا ہے۔ یہ پیش رفت نہیں ثبوت ہیں نسخہ خواجہ کے نسخہ لاہور ہونے کے!!

یہاں تک معین صاحب کی مختصر کتاب کا صفحہ نمبر ۳۰ تمام ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۰ کے آدھے حصے کے بعد نسخہ خواجہ کے سلسلے میں تحسین آمیز اقتباسات درج ہیں جو صفحہ ۳۴ تک جاتے ہیں۔ یہ وہی اقتباسات ہیں (اور ان کے علاوہ بھی جو اس مختصر کتاب میں دوسری جگہوں پر بار دگر درج ہیں) جو اُن کے حق میں

مرتبہ کتاب "دیوانِ غالبؔ نسخہ خواجہ - تجزیہ و تحسین" میں شامل ہیں۔ کیاان اقتباسات کو ایک مرتبہ پھر درج کرنا ضروری تھا؟ یہ تو پہلے بھی کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ اس مختصر کتاب کو لکھنے کا جواز تو محض فراقی صاحب کے سوالات کا جواب دینا تھا۔ مگر اس کا کیا ہو کہ معین صاحب در مدح خود بھی لکھتے ہیں اور دوسروں کے اقتباسات بھی درج کرتے رہتے ہیں۔ چاہے اُس کا موقع ہو یا نہ ہو۔

۹۔ معین صاحب نے صفحہ ۳۴ کے آخر پر فراقی صاحب کے سوال نمبر ۷ کا ایک سطری جواب دیا ہے۔ سوال یہ تھا کہ اس قلمی نسخے پر سید عبداللہ کے تعارف نامے کے چار برس بعد قاضی عبدالودود نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اسی نسخے پر شذرہ لکھا۔ معین صاحب اس کا جواب یہ دے رہے ہیں۔ (فراقی صاحب) کا اصرار کہ قاضی صاحب کا شذرہ "اسی نسخے پر لکھا گیا بے دلیل اور نادرست ہے"۔ بس اتنا جواب۔ فراقی صاحب نے تو دلیل دی ہے لیکن معین صاحب کے پاس اس کے جواب کے لیئے کوئی دلیل نہیں۔ بس اُنھوں نے کہہ دیا کہ یہ نادرست ہے تو یہ نادرست ہو گیا۔ اسی ضمن میں وہ فراقی صاحب کے (ہماری ترتیب میں سوال نمبر ۸) کا جواب بھی دیتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور پاک و ہند کے کئی اہل علم کی رائے یہ ہے کہ نسخہ خواجہ نسخہ لاہور سے الگ کوئی نسخہ نہیں۔ عین مین وہی نسخہ ہے، معین صاحب صفحہ ۳۵ پر جواب یہ دیتے ہیں کہ "کئی اہل علم کی رائے سر آنکھوں پر لیکن تقابلی مطالعے سے اگر ان نسخوں میں فرق دکھائی دیتا ہے تو ان کا عین مین ایک ہی نسخہ ہونا کیونکر باور کیا جا سکتا ہے۔" خیر اس سوال کا ایک جواب تو خود معین صاحب نے نسخہ خواجہ کے تعارف میں دے دیا ہے۔ یعنی یہ کہ نسخہ خواجہ نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا تو آم ضرور ہے۔

رشید حسن خاں جیسے محقق نے اسے عین مین نسخہ لاہور کہا ہے۔ معین صاحب فرق اشعار کی تعداد اور غزلوں کی کمی بیشی کا بتاتے ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ سے اشعار شماری میں غلطی ہوئی (اور اب تو خیر سید قدرت نقوی صاحب نے اپنی تازہ کتاب "دیوان غالب نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ ایک جائزہ" میں یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ معین صاحب نسخہ خواجہ کے اشعار کی جو تعداد بتاتے ہیں وہ بھی درست نہیں ہے۔ اور اصل متن اور ان کے شمار کردہ اشعار میں چالیس شعروں کا گھپلا ہے) خود معین صاحب سے اپنے ہی مرتبہ دیوانِ غالبؔ کی اشعار شماری میں متعدد غلطیاں ہوئیں۔ اس نئی تحقیق کی روشنی میں نسخہ خواجہ کے حق میں (چاہے وہ اشعار شماری کے ضمن میں ہوں یا غزلوں کی کمی بیشی کی صورت میں) ان کا یہ موقف بھی بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

معین صاحب کی مختصر کتاب کے صفحہ ۴۱ سے پھر تحسین آمیز اقتباسات شروع ہوتے ہیں جو صفحہ ۴۴ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ صفحہ ۴۵ پر اُنھوں نے نسخہ خواجہ کے اصل نسخے کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کو دینے کے سلسلے میں اپنی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ نسخہ واپس اپنی اصل جگہ پر پہنچ چکا ہے۔ جہاں سے یہ غائب ہوا تھا۔ معین صاحب نے ۷/ اگست ۱۹۹۹ء کو یہ پیش کش کی تھی۔ اور شرائط لگائی تھیں کہ

یونیورسٹی اس کی حفاظت کا مناسب بندوبست کرے۔ اب اگست ۲۰۰۰ء کے اواخر میں انہوں نے یہ نسخہ وائس چانسلر کو پیش کیا تو محض ادیبوں اور دانشوروں کے دباؤ کے بعد۔ کیا اب یونیورسٹی حکام نے انہیں مناسب بندوبست کی تحریری ضمانت دے دی تھی؟ اگر نہیں تو اتنے وقفے کے بعد اب یہ نسخہ وہاں کیوں دیا گیا؟

۱۰۔ اب آیئے معین صاحب کی کتاب کے صفحہ ۳۹ پر۔ یہ وضاحتی ضمیمہ ہے۔ جس میں فراقی صاحب کے نسخہ خواجہ سے ہٹ کر تین سوالوں (ہماری ترتیب میں سوال نمبر ۲۴، ۲۵، ۲۶) کا جواب ہے۔ فراقی صاحب نے یہ کہا کہ رشید احمد صدیقی کے ساتھ معین صاحب نے اپنی تصویر جوڑ کر بنائی (یہی بات بہت پہلے لطیف الزماں خاں صاحب نے بھی کہی تھی) معین صاحب نے اب یہ تسلیم کر لیا ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تصویر کو "تشکیل" دیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں نے رشید صاحب کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی تیار کی۔ سوال یہ ہے کہ معین صاحب یہ وضاحت اب کیوں کر رہے ہیں؟ یہ وضاحت اس پہلے ایڈیشن میں کیوں نہیں جس کے پس ورق پر یہ شائع ہوئی۔ کیا اس وقت یہ مناسب اور ضروری نہیں تھا کہ معین صاحب ایک جملے میں وضاحت کر دیتے کہ یہ تصویر میں نے خود تیار کی ہے۔ وہاں سے تو یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ وہ تصویر رشید احمد صدیقی کے ساتھ کھنچوائی گئی ہے۔ اور غالباً یہی تاثر دینا مقصود بھی تھا۔ لوگوں کے اس معاملے کو اُٹھانے پر معین صاحب اب یہ وضاحت کر رہے ہیں۔ فرض کیجئے اگر کوئی نہ بولتا تو سو سال بعد آنے والی نسل تو یہی سمجھتی کہ یہ تصویر اکٹھے ہی کھنچوائی گئی ہے۔ مگر اس کا کیا ہو کہ رشید احمد صدیقی سے عقیدت رکھنے والے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ اس "کارخیر" پر معین صاحب کو "قریب اور دُور کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی داد ملی۔" یہ قریب اور دُور کے خوش ذوق دوست اور بزرگ کون ہیں؟ ان کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض لفظوں کا ہیر پھیر اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا ایک نام نہاد جواز ہے۔ میں یہ جملہ لکھتے ہوئے معافی چاہتا ہوں کہ فراقی صاحب کے لکھے ہوئے کا حساب تو وہ خدا پر چھوڑتے ہیں۔ کیا انہیں اپنی عاقبت عزیز نہیں؟ کیا وہ خدا کے سامنے جوابدہ نہیں؟

۱۱۔ فراقی صاحب نے (ہماری ترتیب میں سوال نمبر ۲۶) اپنی مختصر کتاب میں کہا کہ معین صاحب نے ایم اے اردو کی طالبہ بشریٰ باسط کا مقالہ "ادا جعفری شخصیت اور شاعری" کا ایک بڑا حصہ نقوش میں اپنے نام سے شائع کیا۔ معین صاحب نے اس کے جواب میں ایک کہانی سُنائی ہے۔ اور وہ کہانی مختصراً یہ ہے کہ طالبہ بشریٰ باسط کی والدہ شدید علیل ہو گئیں۔ طالبہ کا فوری امریکہ جانا ناگزیر تھا۔ جہاں اس کی والدہ تھیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر مقالے کے نگران تھے۔ انہوں نے کام کی رفتار اور اس کے معیار کی جانب سے بے اطمینانی ظاہر کی۔ مجبوراً مجھے (یعنی معین صاحب) کو کام کی نگرانی کی ذمہ داری اپنے سر لینا پڑی۔ قارئین! ذرا ایک لمحے کے لیئے یہیں ٹھہر جایئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نگران مقالہ تھے۔ وہ کام کی رفتار اور معیار سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ ذمہ داری معین صاحب نے لے لی۔ ڈاکٹر سلیم

اختر کی ادبی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ نجانے اب تک وہ کتنے ہی ایم اے، ایم فل کے مقالوں کی نگرانی کا فریضہ انجام دے چکے ہیں۔ معین صاحب یہاں اُن پر بھی عدم اعتماد کر رہے ہیں۔ کیونکہ مقالے کا جو نگران ہوتا ہے وہی ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔ کیا کام کی نگرانی کی ذمہ داری جب معین صاحب نے اپنے سر لے لی تو ڈاکٹر سلیم اختر صاحب مطمئن ہو گئے تھے؟ اس کا جواب شاید وہی دے سکتے ہیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں خود گورنمنٹ کالج، لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے ایسا کوئی تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔

اب آگے بڑھیئے ---- معین صاحب کہتے ہیں کہ طالبہ نے "ادا جعفری سے متعلق میری غیر مطبوعہ تحریروں سے بھرپور استفادہ کیا اور اپنے پیش لفظ میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ چلیں مان لیا کہ معین صاحب نے ادا جعفری سے متعلق کچھ لکھا تھا اور وہ غیر مطبوعہ تھا۔ اور بشریٰ باسط نے اُس سے استفادہ کیا۔ تو اب اُس کے استعمال کی دو صورتیں تحقیقی اعتبار سے جائز تھیں:

۱۔ طالبہ غیر مطبوعہ مواد کو من و عن لکھتے ہوئے واوین کا استعمال کرتیں اور غیر مطبوعہ تحریر کا حوالہ دیتیں۔

۲۔ طالبہ واوین کے بغیر اپنے الفاظ میں لکھتیں تو پھر بھی حاشیئے میں اس کا حوالہ دیتیں۔

طالبہ نے یہ دونوں اہتمام نہیں کئے۔ پھر اس بات کو کیسے مان لیا جائے کہ وہ تحریر خود معین صاحب کی تھی۔ کیا معین صاحب تحقیق کے اس اصول سے بھی واقف نہیں کہ بغیر حوالے اور بغیر واوین کے استعمال کے تحریر اُسی کی ہوتی ہے جو لکھ رہا ہو۔ مگر شاید وہ اس اصول سے واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ اُن کی دیگر کتب بھی ایسی ہی لغزشوں سے بھری ہوئی ہیں۔ جب وہ خود دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے شائع کر سکتے ہیں تو وہ تحقیق کے ان اصولوں کو کیا سمجھ سکیں گے۔

معین صاحب کا کہنا ہے کہ طالبہ نے پیش لفظ میں بڑے سلیقے سے اعتراف اور اظہار کیا ہے کہ تھیسز کے اول و آخر کے ابواب "عطیہ رحمٰن" (معین الرحمٰن کی تحریروں پر مبنی اور ان کی محنت کا حاصل) ہیں۔ عطیہ رحمٰن کے بعد یہ بریکٹ معین صاحب نے خود لگائی ہے۔ اصل مقالے میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

ان باتوں سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ معین صاحب نے طالبہ کو مقالے کے وہ حصے تحریر کر کے دیئے جو انہوں نے نقوش لاہور میں اپنے نام سے شائع کئے۔ بشریٰ باسط ایک طالبہ تھی۔ اپنے اچھے، بُرے یا نقصان کی وہ خود ذمہ دار تھی۔ یونیورسٹی کیلنڈر میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ اگر طالب علم مشکل میں ہو تو اساتذہ اُنھیں مقالہ لکھ کر دے سکتے ہیں اور بعد میں اپنے نام سے شائع کروا سکتے ہیں۔ بشریٰ باسط کو اسی مقالے کی تکمیل پر ایم اے اردو کی ڈگری ملی۔ یہ پہلے یونیورسٹی میں جمع ہوا۔ معین صاحب نے ان تحریروں کو پورے (۹ مہینے) کے بعد نقوش لاہور میں شائع کروایا۔ وہ طالبہ کے بھی مجرم ہیں اور یونیورسٹی کے بھی۔ امتحانی قوانین کی خلاف ورزی کے بھی۔ تحقیقی بداخلاقی کے بھی وہ مرتکب ہوئے۔ اُن کا یہ

موقف کہ وہ تحریریں اُن کی تھیں جسے مقالے میں جگہ دی گئی سراسر غلط ہے کیونکہ طالبہ نے حواشی اور کتابیات میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ مقالہ لکھ کر دینا جرم---- مقالہ جمع ہونے کے بعد اسے اپنے نام سے شائع کرنا جرم---- معین صاحب کی یہ کہانی من گھڑت اور اُن کا ہر جواز بے معنی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ یونیورسٹی حکام نے ابھی تک کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے سُنا ہے کہ کچھ اساتذہ ایم اے کے اُن مقالوں کو اپنے نام سے شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں جو انہوں نے اپنے طالب علموں کو لکھ کر دیئے۔ اگر ایسا ہوا تو کیا معین صاحب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ کیا یونیورسٹی کے قوانین مجروح تو نہیں ہوں گے؟

۱۲۔ معین صاحب نے فراقی صاحب کے سوال (ترتیب میں نمبر ۲۵) کے جواب میں پرتھوی چندر کی کتاب جاگیر غالب کا ذکر کیا جسے معین صاحب نے اپنے نام سے مرتب کرکے شائع کر دیا۔ سورج کے غالب نمبر میں اس مسئلے کا تفصیل سے ذکر ہوا ہے اور اصل جاگیر غالب بھی شائع ہوئی ہے۔ معین صاحب کہتے ہیں کہ اس کا جواب میں تفصیل سے سورج کے مدیر کے سپرد کر چکا ہوں۔ کیا ابھی تک کسی نے وہ جواب پڑھا؟ وہ جواب کیا تھا یہ تو تسلیم تصور صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ مگر یہاں معین صاحب کیا کہتے ہیں یہ دیکھیئے۔ معین صاحب کہتے ہیں کہ پرتھوی چندر کی یہ علمی کاوش نادر و معدوم تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کاوش پرتھوی چندر کی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو انہوں نے جاگیر غالب کے سرورق پر مرتب کے طور پر صرف اپنا نام کیوں لکھا؟ پرتھوی چندر نے جو متن کی ترتیب قائم کی تھی اس میں اُلٹ پھیر کیوں کی؟ اور جب یہ کتاب بعض احباب کے پاس موجود تھی جیسا کہ سورج کے غالب نمبر میں یہ اصل حالت میں شائع بھی ہوئی تو پھر "ترتیب نو" کے کیا معنی ہیں؟ کیا پرتھوی چندر کی قائم کی ہوئی ترتیب کو تبدیل کرنا تحقیقی اعتبار سے درست تھا؟ اس کا کوئی جواب دیئے بغیر معین صاحب نے جاگیر غالب کے حوالے سے صفحہ ۵۷ سے ۶۰ تک پھر دوسروں کے ستائشی اقتباسات درج کر دیئے ہیں۔

مَیں نے اس تحریر کی ابتداء میں یہ لکھا تھا کہ ہم یہ دیکھیں گے کہ فراقی صاحب کے اُٹھائے گئے سوالات کیا تھے اور معین صاحب کے جوابات کیا ہیں۔ انہوں نے کس سوال کا کیا جواب دیا۔ اب آیئے یہ شمار کریں کہ معین صاحب نے فراقی صاحب کے کس سوال کا جواب دیا۔ معین صاحب نے فراقی صاحب کے ۱۴ سوالوں کا جواب دیا۔ یعنی ہماری ترتیب میں فراقی صاحب کے سوال نمبر ۷، ۸، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷-۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۴، ۲۵ اور ۲۶ کا جواب معین صاحب نے فراہم کیا۔ ان تمام سوالوں کے معین صاحب نے جو جواب دیئے وہ بجائے خود سوالات کو جنم دیتے ہیں اور اس کا تذکرہ میں ہر سوال کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ کر چکا ہوں۔

اب معین صاحب نے فراقی صاحب کے جن سوالوں کا جواب نہیں دیا (ہماری ترتیب میں ان

کے نمبر یہ ہیں۔ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۲۱ اور ۲۳ یہ تمام سوال (جن کی کل تعداد ۱۲ بنتی ہے) بھی بہت بنیادی نوعیت کے تھے ان کے جواب معین صاحب نے فراہم کیوں نہیں کیے؟ اور ان سے چشم پوشی کیوں کی؟ اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اگر معین صاحب ان کا جواب پوری سچائی سے دے دیتے تو "نسخہ خواجہ" "نسخۂ لاہور" ثابت ہو جاتا۔

مَیں نے ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کی مختصر کتاب دیوان غالب نسخہ خواجہ، اصل حقائق اور اس کے جواب میں ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کی مختصر کتاب دیوانِ غالب نسخہ خواجہ۔ صحیح صورت حال کا ایک تقابلی جائزہ پیش کر دیا ہے۔ اور یہ اس لیئے کیا ہے کہ کہیں معین صاحب جواب لکھ کر خود کو سرخرو ہونا نہ سمجھ بیٹھیں۔ وہ فراقی صاحب کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے۔ ہنوز جواب اُن پر قرض ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اُن پر قرض بڑھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ حال ہی میں یعنی اگست ۲۰۰۰ء میں ایک نامور غالب شناس محترم سید قدرت نقوی صاحب کی نسخہ خواجہ کے حوالے سے ایک مختصر کتاب چھپ کر منظرعام پر آگئی ہے۔ اس کتاب کا نام "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ۔ ایک جائزہ" ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ تخلیق ادب کراچی نے شائع کیا ہے۔ (۴۷) صفحات پر مشتمل اس مختصر کتاب نے کچھ نئے اور اہم سوال معین صاحب کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ جن کی تفصیل میں جانا اس وقت بے محل ہو گا کہ میرا مقصد دو مختصر کتابوں کا تقابل ہے۔ مگر اس نئی کتاب میں اُٹھائے گئے سوالات بھی معین صاحب پر قرض ہیں۔ دیکھیں وہ ان کا جواب بھی دے پاتے ہیں یا نہیں!

نسخۂ خواجہ (اصلاً نسخۂ لاہور) کے ضمن میں جو شور برپا ہوا تھا۔ محققین غالب نے اُس ضمن میں اپنا بھرپور کردار ادا کر دیا۔ ایک تاریخ رقم ہو گئی۔ کیا آنے والا محقق اس سے صرفِ نظر کر سکے گا؟ میرا یہ سوال اُن دانشوروں سے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نسخۂ خواجہ (اصلاً نسخۂ لاہور) کو کوئی اہمیت نہ دی جائے اور اس پر گفتگو بند کر دی جائے۔ آج اگر گفتگو بند ہو بھی گئی تو تاریخ کے در وا ہوں گے۔ انسان مصلحت کے لبادے اوڑھ کر خاموش رہ سکتا ہے مگر تاریخ ضرور بولتی ہے۔ معین صاحب یہ یاد رکھیں!!

لاہور

۳۰ ستمبر ۲۰۰۰ء

عارف ثاقب

ڈاکٹر عارف ثاقب

حصہ دوم : مضامین اور تبصرے

دیوان غالب نسخہ خواجہ یا نسخہ لاہور!

ڈاکٹر گیان چند جین

پاکستان کے مشہور ماہر غالبیات ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے پاس دیوان غالب کا مخطوطہ ۱۸۵۲ء تھا جسے انھوں نے مرتب کر کے ۱۹۹۸ء میں ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ اس پر ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے کہ کیا یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا وہ گم شدہ ''دیوانِ غالب، نسخہ لاہور'' ہے جسے ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا عرشی اور قاضی عبدالودود نے متعارف کرایا تھا اور جسے عرشی صاحب نے ''نسخہ لاہور'' کہا تھا۔ اس سلسلے میں چند کتابیں سامنے آئی ہیں:

۱۔ ڈاکٹر سید معراج نیر و اصغر نسیم سید (مرتبین) : دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ تجزیہ و تحسین۔ لاہور ۲۰۰۰ء۔ صفحات ۳۲۸۔ یہ مجموعۂ مضامین ہے جو ڈاکٹر معین الرحمٰن کو ان کی ۵۷ ویں سالگرہ ۵ نومبر ۱۹۹۹ء کو پیش کیا گیا۔

۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق۔ لاہور، سنہ ندارد۔ غالباً اپریل ۲۰۰۰ء۔

۳۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ صحیح صورت حال۔ لاہور، مئی ۲۰۰۰ء۔

۴۔ سید قدرت نقوی : نسخہ مسروقہ۔ یہ میری نظر سے نہیں گزری۔ ظاہراً جون ۲۰۰۰ء کے لگ بھگ آئی ہوگی۔ (۱)

آخرالذکر کو چھوڑ کر میں نے بقیہ سب کتابوں اور کتابچوں کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔ میں کئی ماہ سے اس موضوع پر لکھنا چاہتا تھا لیکن میرے ایک بہی خواہ کا مشورہ تھا آپ کیوں اس جھمیلے میں پڑتے ہیں، لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ خالص علمی تقاضے سے مجھے لکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن[۹] میرے پرانے کرم فرما ہیں، ڈاکٹر تحسین فراقی میرے

لیے تقریباً اجنبی ہیں۔(۲) خیال پڑتا ہے کہ میں اکتوبر ۱۹۷ء میں جب لاہور گیا تھا تو اورینٹل کالج میں ان سے رسمی تعارف ہوا تھا، لیکن کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ آج تک ان سے مراسلت نہیں ہوئی لیکن میں دونوں حضرات کے لیے خلوص کے جذبات رکھتا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ وہ بھی میری معروضی تحریر کو اسی جذبے سے دیکھیں گے۔

تحسین فراقی کا کتابچہ 'اصل حقائق' دقیق اور عالمانہ تحقیق کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے، لیکن انھوں نے اس میں ذاتیات کو گھول کر بڑی غلطی کی۔(۳) اس ناگفتنی کے بغیر وہ ایسا ہی وقیع تحقیقی مقالہ ہوتا جیسے رشید حسن خاں کا ''دیوان غالب'' مرتبہ مالک رام یا ''علی گڑھ تاریخ ادب'' پر تبصرہ۔ ذاتی اتہامات نے مقالے کی علمی سطح کو آلودہ کر کے مناظرانہ رنگ دے دیا ہے۔ اگر وہ ان معاملات کے انکشاف کی تڑپ کو دبا نہیں سکتے تھے تو انھیں چاہیے تھا کہ ان امور پر مشتمل ایک دوسرا مختصر مقالہ لکھ دیتے اور تحقیقی مقالے کی حرمت کو محفوظ رکھنے کے لیے ان مطالب سے مبرّا رکھتے، لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔

میں اختصار کی خاطر دونوں حضرات کے ناموں کو ایک لفظ میں محدود کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ تحسین نے کتابچے کے آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے نسخے، عرشی صاحب اور قاضی عبدالودود کے نسخے اور ''نسخہ خواجہ'' کے بعض صفحات کے جو عکس دیے ہیں ان کی وحدت و یکسانی کو بھانپنے کے لیے کسی ماہر تحریر کی نظر کی ضرورت نہیں، ایک عطائی بھی بہ یک نظر پہچان سکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسخے کے عکس ہیں۔ معین کا یہ کہنا ہے کہ وہ ''نسخہ خواجہ'' کو ڈاکٹر عبداللہ کے متعارفہ نسخے کا مماثل مانتے ہیں لیکن ان میں فرق اور اختلاف بھی بہت نمایاں ہے۔ عرشی و قاضی کا متعارفہ نسخہ نسبتاً زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ خیال ہے کہ ان دونوں کی اصل کوئی ایک ہی مسودہ رہا ہو جس سے ایک ہی کاتب نے، ایک ساتھ دو نقلیں تیار کی ہوں۔ (''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ تجزیہ و تحسین۔'' ص ۴۲)

نسخوں کے فوٹو پکار پکار کر اعلان کر رہے ہیں کہ ہم ایک ہی نسخے کے عکس ہیں۔ ان کے تعارف دینے میں ڈاکٹر عبداللہ، عرشی صاحب اور قاضی صاحب، تینوں نے بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔ معین کے بعض مبینہ اختلافات کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے رضا لائبریری رام پور کے ڈائریکٹر کو لکھ کر درخواست کی کہ وہ روٹوگراف میں دیکھ کر صحیح صورت حال سے مطلع کریں اور چاہیں تو رام پور کے ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کو بلا کر

یہ کام ان کے سپرد کر دیں۔ میرے پاس ڈاکٹر ظہیر کا جواب آ گیا ہے۔ معین الرحمٰن نے اپنے کتابچے میں لکھا ہے:

''نسخہ لاہور'' میں عرشی صاحب کی شہادت کے مطابق مصرعے کی صورت یہ ہے:
.و ہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہو گا۔ جب کہ صحیح ردیف ''ہونا'' ہے، 'ہو گا' نہیں۔'' رام پور میں موجود عکسی نقل کے اس مقام کو دیکھ لیا جائے کہ یہاں صورت، عرشی صاحب کے مشاہدے کے مطابق ہے یا ان سے چوک ہوئی؟۔ اگر عکس کی شہادت عرشی صاحب کے مشاہدے کی تائید نہ کرے تو پھر گویا پھر ''نسخہ خواجہ'' کے عین عین ''نسخہ' لاہور'' ہونے کے بارے میں بظاہر کوئی اشتباہ نہیں رہ جائے گا۔

روٹو گراف دیکھ کر ڈاکٹر ظہیر نے میرے استفسارات کا جو جواب دیا ہے، میں اس میں ''نسخہ خواجہ'' کا صفحہ نمبر شامل کر کے لکھتا ہوں:

۱۔ ''نسخہ خواجہ'' کے ص ۱۱ کی غزل کے تیسرے سطر میں 'مژگاں' کے بعد ردیف 'ہونا' ہی ہے 'ہو گا' نہیں۔ (معلوم نہیں عرشی صاحب نے اس روٹو گراف میں ''ہو گا'' کہاں سے پڑھ لیا)

۲۔ ''نسخہ خواجہ'' کے ص ۲۲ کی تلی میں روٹوگراف میں مہر ہے جس پر Accession No. 6812 تحریر ہے۔

۳۔ ''نسخہ خواجہ'' ص ۳۳ کی غزل. ''لازم تھا کے دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور'' موجود ہے۔

۴۔ ورق ۲۴ پر (''نسخہ خواجہ'' ص ۵۰) تین شعروں کی یہ غزل موجود ہے ''دونوں جہان... تکرار کیا کریں''

۵۔ روٹو گراف میں ''نسخہ خواجہ'' ص ۱۳۳ کی طرح تقریظ کے اوپر جلی قلم سے عنوان 'خاتمہ' لکھا ہے۔ تقریظ کی پہلی سطریں ''بفرِ فروغ گستری'' ہے۔ دوسری سطر کے آخر اور تیسری کے شروع میں ''خرام خامۂ دلربا'' ہے۔ (قاضی صاحب نے پہلی سطر میں ''بفروغ گستری'' اور دوسری میں ''خرام دل رُبا'' غلط نقل کر کے معین الرحمٰن کو دونوں نسخوں کو مختلف کہنے کا موقع دیا۔)

۶۔ نسخے کے اختتام پر مہر میں تحریر ہے۔

''نواب یونیورسٹی لائبریری، عربک سیکشن ۶۸۱۲''

جسے ڈاکٹر ظہیر نے 'نواب' پڑھا وہ 'پنجاب' ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں یہ نسخہ عربک سیکشن میں کیوں داخل کیا گیا۔ لائبریری میں اس داخلہ نمبر کی کتاب کی تفتیش کی جائے تو معاملے پر مزید روشنی پڑ سکتی ہے۔

دونوں مہروں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ''نسخہ خواجہ'' لائبریری کا گم شدہ ''نسخہ لاہور'' ہی ہے۔ قاضی صاحب نے روٹو گراف ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں حاصل کیا۔ اس کے بعد کسی نے مخطوطے کو لائبریری سے اڑا لیا، دونوں مہروں کی جگہ کھرچی، آخری مہر کی جگہ ''فتح دین'' کی چپی لگائی۔ میری رائے میں ''فتح دین'' وجودِ خارجی سے محروم ہے۔ اب سوال آتا ہے نسخہ ڈاکٹر عبداللہ کا۔ اشعار کے شمار میں غلطی ممکن ہے۔ آپ کسی دیوان کے اشعار ایک بار گن جائیے۔ اس کے بعد دوبارہ گنیے۔ زیادہ تر امکان ہے کہ دونوں بار تعداد مختلف نکلے گی۔ ہاں ہر صفحے کی میزان الگ کاغذ پر لکھ کر جوڑی جائے یا گنتے وقت ہر سیکڑہ پورا ہونے پر پنسل سے متعلقہ شعر کے برابر لکھ لیا جائے تو دو دفعہ کے شمار سے صحیح تعداد معلوم ہو سکے گی۔ ڈاکٹر عبداللہ کے نسخے کا معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ اس میں دو غزلیں ع: تکرار کیا کریں، اور ع: رستہ کوئی دن اور، کیوں نہ مل سکیں، میں ان کی توجیہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ڈاکٹر عبداللہ کا اصل مضمون نہیں دیکھا۔ تحسین کے کتابچے میں ص ۶۱ اور ۶۴ پر ڈاکٹر عبداللہ کے نسخے کے جن دو صفحوں کا عکس ہے، وہ تو یہی کہتا ہے کہ یہ ''نسخہ لاہور'' سے جدا نہیں۔ غالب کی زندگی کے دیوان کے مرصع نسخے سڑکوں میں بکھرے ہوئے نہیں کہ لائبریری میں دو دو نسخے ہوں اور لائبریری کے کاغذات میں صرف ایک چڑھایا گیا ہو۔ ایسا کوئی شخص نہیں جس نے وہاں دو نسخے دیکھے ہوں۔ لائبریری کے accession رجسٹر میں دیوان کے جتنے نسخے چڑھے ہوں گے، اتنے ہی وہاں رہے ہوں گے۔ اگر صرف ایک نسخہ چڑھا ہے تو دو کے ہونے کا امکان نہیں۔

دیوان میں ھ کی ردیف میں تین اشعار ہیں۔ عرشی صاحب نے ''نسخہ لاہور'' میں غزلوں کے اشعار کی جو تعداد دی ہے، وہ نسخہ عرشی طبع اول میں ھ کے آگے سہواً دو لکھی ہے اور اسی لیے میزان ۱۵۴۷ دی ہے جو صحیح ہے۔ نسخہ عرشی طبع دوم میں ھ کے اشعار کی تعداد صحیح کر کے تین لکھی ہے لیکن جملہ اشعار کی میزان اب بھی ۱۵۴۷ دی ہے جو کہ ۱۵۴۸ ہونی

چاہیے۔

اب مختصراً تحسین فراقی کے نسخے کی کچھ اور باتیں۔ اس میں ص ۲۰ تا ۲۲ پر جو ذاتیاتی عنصر ہے، اسے پڑھ کر افسوس ہوتا ہے۔(۴) انھوں نے ص ۲۷ اور اس کے آگے ''نسخہ خواجہ'' مطبوعہ کی جن اغلاط کی فہرست دی ہے، اس میں انھوں نے بہت محنت کی ہے، لیکن زیادہ تر ایسی ہیں جو اعراب و علامات سے متعلق ہیں اور سہو کتابت ہو سکتی ہیں۔ ص ۳۳ سے ۳۶ تک انھوں نے اوقاف کے بارے میں جو لکھا ہے، اس کے بیشتر حصے سے اتفاق کرنا ہوگا۔ انھوں نے مرتب کے ناموزوں طبع ہونے کے بارے میں ص ۳۹، ۴۰ کے فٹ نوٹ میں جو دو مثالیں دی ہیں، ان میں اگر سہو کتابت کا دخل نہیں تو معترض کا دعویٰ ثابت کرتی ہیں۔ ص ۴۰ سے ص ۴۲ تک دیوان میں ناموزوں مصرعوں کی جو فہرست دی ہے، ان میں سے بیشتر کا تعلق اوقاف یا ہمزہ یا آخری نون کے نقطے سے ہے جو کتابت وطباعت کی غلطی ہو سکتی ہے، لیکن ذیل کے مصرعے یقیناً غیر موزوں ہیں.

محرم نہیں تو ہی نوا ہائے راز کا — ص ۳۰۶

کہتے ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے — ص ۳۰۹

ہاں مہ تو ہم سنیں اس کا نام — ص ۳۱۰

بچوں کا بھی نہ دیکھا تماشا کوئی دن اور — ص ۳۱۶

تحسین نے ص ۲۸ کے حاشیے میں ذیل کے شعر کے متن کی طرف توجہ دلائی۔

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجکو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

(مخطوطہ۔ص ۷۹)

مخطوطے میں ''تیری'' ہے لیکن مرتب نے اپنی نستعلیق کتابت میں نسخہ عرشی کی تقلید میں ''تری'' لکھا ہے جس سے مصرع وزن سے خارج ہو گیا ہے۔ یہ مشاہدہ غیر معمولی عروض داں ہی کر سکتا تھا۔ اس غزل کا وزن ہے:

منسرح مثمن مطوی منحور یا مجدوع
مفتعلن فاعلات مفتعلن فع یا فاع

اس وزن میں فاعلات کے بعد وقفہ رکھا جائے تبھی مصرع موزوں سنائی دے گا۔

مثلاً انشا ع کوئی نہیں آس پاس، خوف نہیں کچھ۔ غالب نے فاعلات کی ت کو متحرک مان کر اگلے رکن کے شروع میں ملا دیا، جس سے وزن مسخ ہو گیا۔ اس قباحت کے باوجود یہ شناخت کرنا کہ مصرع، تیری، سے موزوں اور 'ت ر ی' سے غیر موزوں ہو جاتا ہے، تحسین کی مہارت عروض پر تحسین کا طالب ہے۔

مرتب نے دائیں صفحے پر مخطوطے کا عکس اور بائیں صفحے پر نستعلیق قرأت دی ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے جابجا اسے تصحیح کر کے دی ہے جو نسخہ متن کے ساتھ وفاداری نہیں۔ تحسین نے ص ۳۷ پر ایسی کچھ مثالیں دی ہیں۔ ان کا یہ مشاہدہ بھی صحیح ہے کہ مرتب نے دیوان کے آخری حصے میں نثرِ مقفّع کے تین عنوانات کو شعر سمجھا ہے۔ معین الرحمٰن نے اپنے جوابی کتابچے میں توجیہ پیش کی ہے کہ وہ نیم منظوم لکھنا چاہتے تھے لیکن اس میں "نیم" چھوٹ گیا (ص ۴۱-۴۰)۔ قاضی عبدالودود نے ایک اصول قائم کیا ہے: "کبھی کسی بات کی، خواہ اپنی ہو یا دوسرے کی، غلط تاویل نہ کی جائے۔ اپنی غلطی کی خواہ مخواہ تخفیف کی کوشش فائدہ مند نہیں۔" (مضمون "غالب --- زباں پہلوان" رسالہ "اردو" کراچی۔ جنوری تا مارچ ۱۹۷۰ء۔ باز طباعت مجموعہ "کچھ غالب کے بارے میں" حصہ دوم۔ پٹنہ، ۱۹۹۵ء۔ ص ۴۰۴)

مرتب نے غالب کے دیباچے اور نیرؔ کی فارسی تقریظ کا جو اردو ترجمہ پیش کیا ہے، وہ بجا طور پر قابلِ فخر ہے۔ تحسین فراقی نے فارسی متن کی قرأت اور اردو ترجمے میں جو تصحیحات تجویز کی ہیں، وہ بھی اسی طرح مایۂ فخر ہیں۔ اس سے مجھے یہ تذبذب ہو گیا ہے کہ تحسین شعبۂ اردو کے استاد ہیں یا شعبۂ فارسی کے؟ انھوں نے "نسخہ خواجہ" سے پیشتر ان نثروں کے ترجموں کی جو تفصیلی نشاں دہی کی ہے، وہ کم از کم میری معلومات میں اضافہ ہے۔

اب "نسخہ خواجہ، تجزیہ و تحسین" کے مضامین کے بعض قابلِ ذکر بیانات پر میرے مشاہدات:

ڈاکٹر حنیف نقوی نے ص ۳۸ پر کہا ہے کہ ان کے نزدیک مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبداللہ کا "نسخہ لاہور" اور یہ نسخہ مختلف نہیں۔ ص ۳۹ پر انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ وہ نسخہ ہو سکتا ہے جو غالب نے مہاراجا جے پور کے لیے پیش کش

کے لائق جلد اور نظر فریب جزودان میں بھیجا تھا۔ معین نے دونوں باتوں کی تردید کی۔ چونکہ یہ نسخہ نہ مجلد ہے، نہ کسی جزو دان میں ہے اس لیے یہ جے پور والا نسخہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے معین الرحمٰن کی پہلی تردید سے اتفاق نہیں، آخرالذکر سے ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے کہا کہ ''فسانہ عجائب'' کا ۱۲۵۹ھ والا پہلا ایڈیشن ان کے کتب خانے میں موجود ہے۔ (ص ۵۱) رشید حسن خان کی رائے میں یہ نسخہ عین مین نسخہ لاہور معلوم ہوتا ہے۔ (ص ۵۵) ڈاکٹر معین نے ص ۵۶ کے فٹ نوٹ میں اپنے مرتبہ ایڈیشن کی چھپے اغلاط کی تصحیح کی۔ تصحیح کے لیے یہ مقام غیر مناسب ہے۔ غلط نامہ مرتبہ دیوان ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ معین ایک بار پھر کہتے ہیں کہ ان کو احساس ہے کہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں اردو دیوان غالب کے دو خطی نسخے رہے ہیں۔ ایک وہ جسے عرشی و قاضی صاحب نے دیکھا، دوسرا وہ جسے ڈاکٹر عبداللہ نے دیکھا۔ (ص ۵۶)

رشید حسن خاں نے ایک اہم بات یہ کہی کہ اسے ''نسخہ خواجہ'' کہنے کا جواز نہیں۔ (ص ۵۹)۔ میری پختہ رائے یہ ہے کہ نہ صرف اس کا جواز نہیں بلکہ یہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ اس نسخے کا خواجہ منظور حسین سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے اسے شاید دیکھا بھی نہیں۔ وہ ماہر غالبیات نہیں تھے۔ معین صاحب کی ان سے عقیدت سر آنکھوں پر لیکن وہ اپنے کام کو دوسرے کے نام کیونکر کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دولت خانے کا نام ''خواجہ منظور حسین منزل'' رکھ دیں تو اس سے اُن کا مکان تلاش کرنے والوں کو مغالطے میں ڈالنے کے سوا اور کیا ہو گا۔ اگر اپنی تدوین کو کسی غیر متعلق شخص کا نسخہ قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ضرورت مند اپنی تدوین کو کسی صدر شعبہ، وائس چانسلر، وزیر یا کسی اور صاحب اقتدار کا نسخہ کہہ سکتا ہے، اس توقع پر کہ اس سعادت نمائی سے اس کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کوئی لالچی صدر شعبہ اپنے خردوں اور شاگردوں کے تدوینی کاموں کو اس کے نام سے وابستہ کرنے اور اس کا مناسب صلہ پانے کا اشارہ کر سکتا ہے۔ مرکزی یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں میرے ایک شاگرد نے میری نگرانی میں ریحان لکھنوی کی مثنوی ''باغ بہار'' (گل بکاولی) مرتب کی۔ دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی نگرانی میں دتاسی کی فرنچ ''تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی'' کا اردو ترجمہ کیا۔ حضرات عقیدت سے مغلوب ہو کر اپنے کاموں کو نسخہ گیان چند یا ''نسخہ خواجہ'' احمد فاروقی

کہنے کو مصر ہوتے تو کیا اس کی تہ میں کوئی اور مقصد نہ ہوتا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر معین الرحمٰن کا اِقدام بے لوث تھا، لیکن یہ ایک غلط مثال قائم کرتا ہے۔

معین صاحب نے کالی داس گپتا رضا کے نام کے خط میں لکھا ہے کہ ایک خوش ذوق شخص انھیں ۱۹۸۵ء میں اس نسخے کے لیے اسی ہزار روپے کی پیش کش کر رہے تھے۔ اس زمانے میں معین کو اپنے گھر کی تعمیر کے لیے روپے کی ضرورت بھی تھی لیکن پھر بات رہ گئی۔ (ص ۶۴، مکتوب مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۶ء)۔ اس کے بعد انھوں نے اس نسخے کو پنجاب یونیورسٹی کو ہدیتہً پیش کر دیا۔ ۸۵ء کے ۸۰ ہزار روپے آج کے تین چار لاکھ کے برابر ہوں گے۔ میں معین صاحب کے اس غیر معمولی ایثار کی قدر کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ معترضین بھی کم سے کم اس علم دوستی کی داد دیں گے۔(۵) اگلے صفحے پر معین صاحب کہتے ہیں کہ شاید ہی غالب کی زندگی کے کسی مخطوطے کی ایسی جمیل و شکیل اشاعت ہوئی ہو گی (ص ۶۵)۔ میرا خیال ہے کہ نسخہ عرشی زادہ بھی بہت دیدہ زیب ہے۔ نقوش کی بیاض غالب بھی اچھی خاصی ہے۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے اپنے مفصل مقالے میں بجا کہا ہے کہ مرتب نے متن میں کسی لفظ کے اضافے کو واضح لکیروں کے بیچ نہیں لکھا (ص ۱۵۱)۔ خود انھوں نے اس صفحے پر اشعار کے حوالے میں کہیں مخطوطے کے صفحے کا، کہیں مطبوعہ ایڈیشن کے صفحے کا حوالہ دیا ہے۔ اول الذکر عددِ شمار صفحے کے اوپری حصے میں اور آخر الذکر صفحے کے نیچے کے حصے میں درج ہے۔

انتظار حسین نے لکھا ہے ''پہلا مخطوطہ جو اب نسخہ حمیدیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ (ص ۱۷۵)۔ وہ انجانے میں ایک غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ نسخہ حمیدیہ مفتی انوار الحق کے اس مطبوعہ ایڈیشن کا نام ہے جس میں غالب کا منسوخ اور متداول دونوں طرح کا پورا کلام شامل ہے۔ مخطوطۂ بھوپال میں صرف ۱۸۲۱ء تک کا کلام تھا۔ ص ۲۴۹ پر سیف اللہ خالد نے لکھا ہے کہ سرسید نے نیر کی تقریظ کو اردو کا لباس پہنایا۔ معین الرحمٰن حاشیہ لگاتے ہیں کہ، کام سرسید نے نہیں کیا تھا، فیاض محمود اور اقبال حسین کی سعی ہے۔ تحسین فراقی کی رائے میں یہ وزیر الحسن عابدی کا کام ہے (اصل حقائق ص ۴۹، ۵۰)۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے لکھا ہے کہ نئے دریافت شدہ نسخے کو پہلے نسخہ امروہہ اور پھر نسخہ عرشی زادہ کا نام دیا گیا (ص ۲۹۲)۔ انھوں نے ترتیب الٹ دی ہے۔ نسخہ عرشی زادہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں شائع

ہوا، نقوش کا ایڈیشن کئی ماہ بعد۔ پھر ''نسخہ عرشی زادہ'' مطبوعہ ایڈیشن کا نام تھا، مخطوطے کا نہیں۔

معین الرحمٰن کا کتابچہ ''صحیح صورت حال'' ان کے ولی کرب اور صدمے کا آئینہ دار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ فریقین کو ذاتیاتی امور میں الجھنا پڑا۔ (۶) معین صاحب نے اپنے کتابچے میں مشفق خواجہ کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ ایک صاحب ہیں جن کا کام ہی ہے کہ دوستوں میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں (ص ۱۲)۔ شخص مذکور کا نام نہیں دیا۔ اس سے مجھے گمان ہوا کہ شخصیت مرموز تحسین فراقی ہیں۔ میں نے مشفق خواجہ سے وضاحت چاہی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ تحسین نہیں، کوئی اور ہے۔ کتابچے میں معین صاحب نے معترض کے اعتراضات کے جو جواب دیے ہیں وہ کہیں قائل کرتے ہیں۔ (۷) تو بعض اوقات عذرِ لنگ معلوم ہوتے ہیں۔

انھوں نے ص ۲۸ پر آخری پیراگراف میں ''نسخہ خواجہ'' مخطوطے کے لیے بھی استعمال کیا ہے اور مطبوعہ کے لیے بھی۔ وہ اپنے مطبوعہ ایڈیشن کو کوئی بھی نام دیں لیکن مخطوطے کو صرف ''نسخہ لاہور'' یا ''نسخہ ۱۸۵۲ء'' کہہ کر ہی اس کی شناخت کی جا سکتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں: ''ممکن ہے یہ مخطوطہ کبھی کسی فتح دین ۔ نی شخص کی ملکیت رہا ہو۔'' (ص ۲۹) اس قیاس کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب قاضی عبدالودود نے ۵۸۔۱۹۵۷ء میں نسخے کا روٹو گراف لیا تب تک آخری صفحے پر لائبریری کے نمبر داخلہ کی مہر سلامت تھی۔ فتح دین کی چپی اس کے بعد ہی چپکائی گئی ہے، اس لیے میری رائے میں یہ فرضی نام ہے۔

کتابچے کے آخر میں تین وضاحتی ضمیمے ہیں۔ ان کی ضرورت پڑی، یہ موجب افسوس ہے۔ دراصل دونوں کتابچوں کو پڑھنے کے بعد دکھ اور اداسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔(۸)

اب میں معین الرحمٰن کی تدوین کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔ دراصل اس موضوع پر سب سے پہلے لکھنا چاہیے تھا لیکن میں نے دوسری کتابوں کو اس لیے پہلے لیا تاکہ نسخے کے کئی پہلو زیرِ بحث آ جائیں تو تدوین کے سلسلے میں تکرار نہ کرنی پڑے۔

مطبوعہ ایڈیشن کے ''حرفے چند'' میں لکھتے ہیں کہ ان کے پاس ''فسانہ عجائب'' طبع اول ہے جو فسانہ عجائب پر کام کرنے والوں کو بھی نہ مل سکا (حاشیہ ص ۵)۔ حقیقت یہ ہے

کہ میں نے ۱۹۶۲ء یا ۶۳ء میں رضا لائبریری رام پور میں یہ ایڈیشن دیکھا تھا۔ ''نثری داستانیں'' طبعِ دوم کے ص ۳۴۰ پر اطلاع دی ہے کہ یہ ڈاکٹر محمود الٰہی کو بھی مل گیا۔ نیز مسعود کے ذاتی کتب خانے میں اس کے ہونے کا ذکر پیچھے آ چکا ہے اور رشید حسن خاں کے بارے میں مرتب خود ہی لکھ چکے ہیں کہ ان کے پاس ہے۔ یہ چار نسخے ہوئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نایاب نہیں۔ ''حرفے چند'' کے آخر میں کوئی تاریخ درج نہیں لیکن یہی تحریر ''تجزیہ و تحسین'' میں بھی شامل ہے جہاں اس پر ۲۳ مارچ ۱۹۹۷ء درج ہے۔ (دیکھیے اس کا ص ۱۹۰)

ابتدا میں انھوں نے مخطوطے کے چار صفحوں کا جو رنگین فوٹو دیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دیوان غالب کے جتنے نسخے ابھی تک افشا کیے گئے تھے، ان میں سے کوئی بھی اتنا مرصع و مذہب نہیں۔ اس کے شروع میں مخطوطے کے تعارف میں، جو دراصل مقدمہ ہے، مرتب نے تمام ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔(۹) لیکن وہ جو بار بار مخطوطے کو ''نسخہ خواجہ'' کہتے ہیں اس سے مجھے دھچکا لگتا ہے (ص ۱۵، ۲۰، ۳۱۶، ۳۳۲ وغیرہ) مثلاً لکھتے ہیں. ''نسخہ خواجہ'' میں غالب کے اپنے قلم سے جو ترمیم یا تنسیخ ہوئی ہے'' (ص ۲۰)۔ غالب نے خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا کہ وہ جس نہیں نسخے میں تصحیح کر رہے ہیں، وہ نسخہ غالب نہیں، ''نسخہ خواجہ'' ہے۔ کون سا خواجہ، خواجہ نظام الدین اولیا یا خواجہ میر درد؟

مقدمے کے مختلف اجزا کے، مثلاً غالب کے قلم کی اصلاحوں کی تفصیل، بچی ہوئی اغلاط کا مفصل بیان، لکھنے ہیں فاضل مرتب نے بہت محنت کی ہے۔(۱۰) انھوں نے عرشی، قاضی اور ڈاکٹر عبداللہ کے بیانات کو نقل کر کے قاری کے لیے بہت سہولت بہم پہنچا دی ہے۔ اس کے لیے وہ ہر تنکے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ آخری فصل میں انھوں نے دکھایا ہے کہ مئی ۱۸۴۷ء (دیوان غالب طبع دوم) اور اگست ۱۸۵۲ء (موجودہ نسخہ) کے درمیان غالب کی کون کون سی غزلیں اور دوسرے اشعار وجود میں آئے۔ اس طرح جہاں تک میرا سوال ہے، مقدمہ تحقیقی اعتبار سے تشفی بخش ہے۔(۱۱)

آگے متن دیا ہے جس میں دائیں صفحے پر مخطوطے کا عکس اور بائیں صفحے پر نستعلیق قرأت ہے۔ اس میں انھوں نے ایک بڑی بھول یہ کی ہے کہ قرأت مخطوطے کی عکاس

نہیں، وہ معین صاحب کے تصحیح شدہ متن کو پیش کرتی ہے۔ مثلاً دیوان کے ص ٦ کے آخری شعر میں ''باغ نسیاں کا'' ہے جب کہ نستعلیق شکل میں ''طاقِ نسیاں کا'' دیا ہے۔ قرأت کے بارے میں مزید کچھ تحسین فراقی اور سلطانہ بخش لکھ چکے ہیں۔ تدوین کی دوسری اس سے بھی بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں اختلاف نسخ نہیں دیے۔ کم سے کم زیرِ بحث نسخے سے فوراً ماقبل اور مابعد کے خطی و مطبوعہ متون اور اس نسخے کے اختلافات دینے ضروری تھے۔ اپنی قرأت میں جہاں جہاں انھوں نے متن مخطوطہ سے اختلاف کیا ہے، وہ بھی اختلاف متن میں ظاہر کر دیا جاتا۔ تیسری کمی یہ دکھائی دیتی ہے کہ غزلوں اور دوسری اصناف کی نظموں کو تلاش کرنے کا کوئی طریقہ نہیں اپنایا، خواہ شروع میں مصرعوں کی فہرست دیتے یا آخر میں عرشی صاحب کی طرح مختلف اشاریہ بناتے۔ فی الوقت کسی غزل یا مخصوص شعر کو نسخے میں تلاش کرنا بہت وقت طلب ہے۔

کالی داس گپتا رضا کے کام کے بعد کلام کی توقیت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ صنف وار توقیت دینا، توقیت کے مقصد کے خلاف ہے۔ مثلاً ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۲ء کے بیچ کی غزلوں کے بعد ۱۸۲۱ء تک کے قصیدے یا ۱۸۱٦ء تک کی رباعیاں درج کی گئیں تو یہ تاریخی ترتیب کہاں رہی؟ اس کے بعد توضیحات و تعلیقات کے عنوان کے تحت ص ۳۱۳ سے ۳۳۸ تک جو کچھ دیا ہے یہ دراصل وہی ہے جسے تحقیق کی اصطلاح میں حواشی کہا جاتا ہے۔ انھیں حواشی کی طرح ملا کر لکھتے تو اور بہتر ہوتا۔ یہ فصل معلومات کا گنجینہ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں چند مشاہدات پیش کرنے ہیں:

۱۔ اِن حواشی میں بہتوں میں کسی غزل یا شعر کا زمانہ طے کیا ہے لیکن اس دریافت کو توقیت میں نہیں سمویا گیا۔ ویسا کر دیتے تو توقیت میں اور جزیاتی صحت آ جاتی۔

۲۔ ص ۳۲۱ ''سہ نثر ظہوری (دیباچۂ گلزارِ ابراہیم)۔'' یہ ص ۴۹ کے شعر کے تحت لکھا ہے۔ مرتب کا بڑا سہو ہے۔ ''سہ نثر ظہوری'' کی ایک نثر ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب ''نورس'' مصنفہ ۱۰۰٦ھ / ۹۸-۱۵۹۷ء کا دیباچہ تھی۔ تذکرہ ''گلزارِ ابراہیم'' ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء کی تصنیف ہے۔

۳۔ ص ۳۲۴۔ ص ۵۸ پر مصرع لکھا ہے: ع واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو۔ رشید حسن خاں نے اپنی کتاب ''تدوین۔ تحقیق روایت'' میں لکھا ہے کہ ''پئے

ہم'' کوئی لفظ نہیں۔ یہ پیہم کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ وزن کے رکن فعلاتن پر تسکین اوسط کا زحاف لگا کر فعولن بنا لیا ہے۔ (دہلی ۱۹۹۹ء، حاشیہ ص ۱۳۶)۔
میں خاں صاحب کے قول سے متفق ہوں لیکن یہ کہوں گا کہ تسکین اوسط کے زحاف نے مصرع کو کمر شکستہ، غیر مترنم اور بدنما بنا دیا ہے۔

۴۔ ص ۳۲۹۔ غزل ''جاں کے لیے، آسمان کے لیے'' پر حاشیہ دیتے ہیں کہ یہ غزل نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔ ایسا ہی آزاد نے ''آب حیات'' میں لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود کی تحقیق ہے کہ آزاد سے حافظے نے دھوکا دیا۔ یہ مشاعرہ مومن کے ایک اور شاگرد اصغر علی خاں اصغر رام پوری کا ہو گا کیونکہ دیباچہ ''دیوانِ نسیم'' مرتبہ تسلیم شاگردِ نسیم میں صراحتاً لکھا ہے کہ نسیم ۱۲۴۴ھ میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ نسیم کا مشاعرہ ۱۲۴۴ھ (۲۹۔۱۸۲۸ء) کے بعد نہیں ہو سکتا تھا (اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں۔ پٹنہ ۱۹۹۵ء۔ ص ۴۳)۔
گیتا رضا نے بھی مجھے لکھ کر اپنے مرتبہ دیوان کے ص ۳۸۸ پر تصحیح کر دی۔ معین صاحب نے اس حاشیے میں تجمل حسین خاں کے بارے میں اچھی تحقیق کر کے مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

۵۔ ص ۳۳۱۔ ''یہ قصیدہ نسخہ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) کے متن میں شامل ہے''۔ بھائی میرے! ''نسخہ حمیدیہ'' ۱۸۲۱ء میں نہیں، ۱۹۲۱ء میں آیا۔ اس مطبوعہ ایڈیشن میں محض ۱۸۲۱ء تک کا کلام نہیں، غالب کا تقریباً تمام کلام شامل ہے۔ ۱۸۲۱ء کے خطی دیوان کو ''نسخہ حمیدیہ'' نہیں کہہ سکتے جس طرح ۱۸۵۲ء کے دیوان کو ''نسخہ خواجہ'' کہنا غلط ہے۔

۶۔ ص ۳۳۲۔ یہاں بھی ص ۱۱۶ کے دو مقفیٰ نثری عنوانات کو شعر کی طرح لکھا ہے۔
حواشی کے بعد فارسی دیباچے اور خاتمے کا اردو ترجمہ ہے جس کی داد ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر نیر مسعود جیسے علمائے فارسی دے چکے ہیں۔ اس کے بعد میرے مزید کہنے کی گنجائش ہی نہیں۔ پروفیسر نذیر احمد تو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مہارت فارسی سے اتنے متاثر ہوئے کہ لکھتے ہیں۔ (۱۲)

آپ نے ''دستنبو'' پر کام کیا ہے، اس مناسبت سے اگر آپ ''دساتیر'' پر کچھ توجہ

کریں تو بہت ... مناسب ہوگا ... یہاں (ہندوستان میں) تو مجھے کوئی نظر نہیں آتا جو اس کام کے لیے آمادہ ہو۔" (تجزیہ و تحسین۔ ص ۲۹)

دساتیر کی زبان جعلی فارسی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد اس پر کام کرنے کی فرمائش کر کے ڈاکٹر معین کے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ ڈال رہے ہیں۔

کتابیات پر مجھے کئی اعتراضات ہیں۔ مخطوطاتِ کلامِ غالب میں انھیں "دیوانِ غالب" بخط غالب اور دیوان غالب نسخہ فوجدار از محمد خاں کے شمول کا کوئی حق نہ تھا، کیونکہ انھوں نے ان مخطوطات کو نہیں دیکھا۔ آخر الذکر کو معروف بہ "نسخہ حمیدیہ" کہنا غلط ہے۔ انھوں نے "دیوانِ غالب، نسخہ رام پور قدیم" بھی نہیں دیکھا۔ نمبر ۶ تا ۸ تک کے مخطوطے کو اگر دیکھا ہو تو ٹھیک ہے، اگر ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا تو اس کا اندراج نہیں کرنا تھا۔ حیرت ہے کہ مطبوعات غالب میں شامل کم از کم ۹ کتابوں کو دوبارہ متفرق مآخذ و مصادر کے تحت شامل کیا ہے۔ اتنے پرانے استاد کو کتابیات میں تعداد بڑھانے کا اتنا شوق نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اخبارات و رسائل کے تحت نمبر ۱۲ کے مقالہ نگار کا نام ڈاکٹر عبدالودود لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود لکھنا چاہیے تھا کیونکہ وہ ڈاکٹر نہیں تھے، مریض لمبے عرصے تک ضرور رہے۔ اسی طرح "نسخہ خواجہ، تجزیہ و تحسین" میں ص ۸ کے آخر میں ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری لکھا ہے، وہ بھی ڈاکٹر نہیں، لیکن اس اندراج کے ذمے دار مرتبین ہیں۔ زیر بحث نسخے میں کتابیات کے مزید مآخذ کے تحت امیر کبیر نواب شمس الامرا کی دو تکنیکی کتابوں اور ملا معین الدین واعظ الکاشفی کے مخطوطہ "معارج النبوت" کے شمول کو دیکھ کر تبسم کرنا پڑتا ہے جیسا کہ تحسین فراقی نے اپنے کتابچے میں ص ۵۸ پر لکھا ہے۔ ان سے اور "فسانہ عجائب" طبع اول سے کوئی حوالہ اور اقتباس نہیں دیا۔ میں ان میں "فسانہ عجائب" کے تین اور ایڈیشنوں نیز اپنی کتاب "نثری داستانیں" کو بھی شامل کروں گا، یعنی مزید مآخذ کے آٹھ اندرجات میں سوائے نمبر سات کے بقیہ سب حشو ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن حیاتِ غالب کے اس مخطوطے کو محفوظ رکھ سکے اور دوسرے مخطوطات دیوان کی طرح اسے گم نہ ہونے دیا، اردو دنیا پر یہ ان کا بڑا احسان ہے۔ (۱۳) حرف آخر کے طور پر میں یہ کہوں گا کہ میرے بعض مشاہدات اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے جملہ اعتراضات کے باوجود میں معین الرحمٰن کے اس کام کو اچھی تدوین کہوں گا۔ (۱۴) اسے

مولانا عرشی کے نسخہ عرشی کے معیار سے نہ پرکھیے۔ (۱۵)

(ہفتہ وار "ہماری زبان"، نئی دہلی۔ ۲۰۰۱ء)

پس نوشت:

"نسخہ خواجہ" پر مضمون ناشر کو بھیجنے کے چند روز بعد مجھے بزرگ ماہر غالبیات سید قدرت نقوی کا ۴۷ صفحوں کا کتابچہ "دیوان غالب "نسخہ خواجہ" یا نسخہ مسروقہ، ایک جائزہ" ملا۔ یہ کراچی سے اگست ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں مجلد کتاب "نسخہ خواجہ، تجزیہ و تحسین" نیز تحسین فراقی اور خود معین الرحمٰن کے کتابچوں کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن اس میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے کام پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ موقع نہیں کہ میں نقوی صاحب کے کتابچے کا مفصل جائزہ لوں۔ اس کے اہم مشمولات کا اپنے الفاظ میں خلاصہ کرتا ہوں:

۱۔ شروع میں انھوں نے "ماہ نو" جولائی ۱۹۵۴ء سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا پورا مضمون نقل کر دیا ہے (ص ۵ تا ۱۴)۔ اس میں عرشی صاحب کا مفصل تحقیقی خط ص ۷ تا ۹ پر شامل ہے۔

۲۔ ڈاکٹر عبداللہ کے مضمون میں ایک جملہ ہے "حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مرزا غالب کے دیوانِ اردو کا ایک قلمی نسخہ داخل ہوا ہے"۔ اس کے معنی ہیں کہ یہ نسخہ لائبریری میں ۵۳ یا ۵۴ء میں آیا۔ معین الرحمٰن نے اپنی تدوین میں اس جملے کے الفاظ "حال ہی میں" حذف کر دیے (ص ۱۴) لائبریری کے داخلہ ۶۸۱۲ سے داخلے کی صحیح تاریخ معلوم ہو سکتی ہے۔

۳۔ ڈاکٹر عبداللہ اور معین الرحمٰن کا یہ قیاس درست نہیں کہ یہ نسخہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری میں لٹا۔ اگر یہ اس سنہ تک مالک کے پاس رہا ہوتا تو اس میں ۱۸۵۶ء تک کا کلام ہوتا، جو نہیں ہے۔ (ص ۱۵)

۴۔ غالب کے اردو دیوان کا دیباچہ "کلیات نثرِ غالب" ص ۵۶ پر دیباچۂ "گل رعنا" کے بعد اور خاتمہ "گل رعنا" کے پہلے، درمیان میں دیا ہے جس کے معنی ہیں کہ یہ دیباچہ، "گل رعنا" کی تدوین کے وقت لکھا گیا۔

۵۔ ڈاکٹر معین نے مخطوطۂ دیوان ص ۸۷ کا ایک شعر ۔ ہو کر شہید عشق..... دوش ہے، نستعلیق کتابت میں حذف کر دیا ہے۔ (ص ۳۰) اس پر نقوی صاحب کا اعتراض بجا ہے لیکن انھوں نے متداول شعر ۔ نے مژدۂ وصال ..... چشم و گوش ہے، کو نستعلیق میں شامل کرنے پر کیوں اعتراض کیا ہے، سمجھ میں نہ آیا ہے، کیونکہ یہ مخلوطے میں موجود ہے۔

۶۔ ص ۲۴ سے ص ۳۱ تک معین الرحمٰن کی تعداد اشعار میں حساب کتاب کی غلطیاں دکھائی ہیں۔

۷۔ اس نسخے پر لکھنے والوں میں سے کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ غالب نے اپنا اردو دیوان کس کس کو بھیجا۔ نقوی صاحب نے خطوں سے دریافت کیا کہ مطبوعہ ایڈیشن آٹھ حضرات کو بھیجا گیا اور قلمی نسخہ صرف دو کو: مہاراجا جے پور اور نواب یوسف علی خاں والی رام پور کو۔ یہ دیوان مہاراجا جے پور والا نسخہ ہے۔ تقسیم ملک کے فساد میں کسی نے اسے چرا کر جزدان الگ پھینک دیا ہو گا۔ مرصع جلد الگ کر دی۔ غالب نے ۱۷ خطوں میں جے پور کو دیوان بھیجنے اور اس کے صلے کے انتظار میں بے چینی کا بیان کیا ہے۔ آخر ۱۴ جون ۱۸۵۳ء کو ہنڈوی ملی (ص ۳۷ تا ۴۲)۔ حنیف نقوی نے سب سے پہلے یہ قیاس کیا تھا۔ اب دیکھا جائے کہ مخطوطے پر جلد دوبارہ باندھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ نہیں۔ مخطوطے کی تیاری اور صلے کے ملنے کی تاریخ معنی خیز ہے۔

۸۔ نقوی صاحب نے منقش اور رنگین لوحوں اور جد ولوں کا ماہرانہ جائزہ لیا۔ غالب کے دوسرے تمام نسخوں کے شروع میں لوح پر مسلمانوں کے متبرک کلمات ہوتے ہیں لیکن اس دیوان میں کوئی اسلامی کلمہ نہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کسی غیر مسلم کو پیش کیا گیا۔ اسے دو بار چرایا گیا۔ ایک دفعہ مہاراجا جے پور کے یہاں سے، دوسری بار پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے۔ (ص ۴۳ تا ۴۶)۔

۹۔ خواجہ منظور حسین کے نام دیوان کو منسوب کرنا کافی تھا۔ ان کے نام سے موسوم کرنا مدح بالذم ہے۔ (ص ۴۷)۔

سید قدرت نقوی کا کتابچہ علمی انداز میں لکھا ہوا عالمانہ ہے۔ (مجھے اطلاع ملی ہے

کہ معین الرحمٰن نے مخطوطے کے ہر ورق کو **Laminate** کرا دیا ہے۔ کسی لیبوریٹری میں بھیج کر ''فتح دین'' والے صفحے کا غلاف کھلوایا جائے، چپی ہٹائی جائے اور حقیقت برآمد کرائی جائے۔

حواشی و تعلیقات

رفاقت علی شاہد

۱۔ سید قدرت نقوی مرحوم کے کتابچے کے کوائف درج ذیل ہیں ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ۔ ایک جائزہ۔'' کراچی، مکتبۂ تخلیقِ ادب۔ اگست ۲۰۰۰ء۔

۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے مطابق ڈاکٹر گیان چند جین سے ان کی اکتوبر ۸۹ء میں گیان چند صاحب کے اقامت خانے پر بہ مقام حیدرآباد دکن تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے مقالے ''گزشتہ نصف صدی کی اردو تحقیق'' میں تحسین صاحب کی مرتبہ کتاب ''عجائبات فرنگ'' کے عالمانہ مقدمے کے لیے کلمات توصیف کہہ چکے ہیں۔ ''دیکھیے نیا دور'' لکھنؤ کا ''نصف صدی نمبر''۔ ص ۳۲۔

۳۔ جنھیں مقالہ نگار ''ذاتیات'' قرار دے رہے ہیں، وہ ناگزیر حقائق تھے جن کا ذکر ''نسخہ لاہور'' کے ضمن میں ضروری تھا۔ ''ذاتیات'' سے مقالہ نگار کی مراد غالباً ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اُن ادبی گھپلوں کے بیان سے ہے جن کا تعلق زیرِ بحث ''دیوانِ غالب، نسخہ لاہور'' سے براہِ راست نہیں۔ مثلاً رشید احمد صدیقی کے ساتھ جعلی تصویر بنوانا، ''جاگیرِ غالب'' اور ایم اے کی طالبہ کے مقالے کو اپنے نام سے شائع کرانا وغیرہ۔ میری رائے میں ''دیوانِ غالب، نسخہ لاہور'' کے معاملے میں معین الرحمٰن صاحب کی جعل سازی کی صحیح تصویر مذکورہ ''ذاتیات'' کے ذکر کے بغیر صحیح طور پر واضح نہیں ہوسکتی۔ اگر بحث کا دائرہ محض ''دیوان غالب، نسخہ لاہور'' تک محدود رکھا جاتا تو اندازہ ہے کہ اسے کوئی زیادہ اہمیت نہ دی جاتی،

لیکن ڈاکٹر معین الرحمٰن کی دیگر علمی بددیانتیوں کے ذکر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہیں۔ معین صاحب کے کردار کی یہ اصل تصویر مذکورہ ''ذاتیات'' کے ذکر کے بغیر واضح نہیں ہو سکتی۔

۴۔ حیرت ہے گیان چند جین جیسا بالغ نظر محقق بیانِ حقائق کو ''ذاتیات'' میں شمار کرے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچے کے ص ۲۰ تا ۲۲ میں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے

ص ۲۰، ۲۱ پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس شک کا اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے مبینہ ''نسخہ خواجہ'' اور نسخہ متعارفہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ میں جن اختلافات کی نشاندہی کی ہے، یہ اختلافات جعل سازی سے بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بعض الفاظ میں نقطے بڑھا کر اور بعض کے کسی حرف کے کسی حصے کو کھرچ کے حسبِ مطلب ترمیم کر کے دونوں مذکورہ نسخوں میں اختلافات پیدا کرنے ممکن ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچے کی درج ذیل عبارت پر غور کیا جانا چاہیے۔ گیان صاحب نے اس عبارت میں بیان کی گئی تفاصیل کو بھی ''ذاتیات'' میں شمار کیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی عبارت یہ ہے۔

''بدگمانی تو نہیں کرنی چاہیے مگر چونکہ تحقیقی و تدوینی معاملات میں بدقسمتی سے خود معین صاحب کی شہرت اچھی نہیں۔ اس لیے بعید نہیں کہ یہ ''کارِ خیر'' انھی کے ہاتھوں انجام پایا ہو۔ آخر جو شخص رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر اُسے چھپوا سکتا ہو (دیکھیے ''جدید اردو غزل۔'' ۱۹۸۷ء کا بیک ٹائٹل)، جو شخص پرتھوی چندر کی ''جاگیر غالب'' اپنے نام سے شائع کر سکتا ہو (دیکھیے۔ ''سورج'' کا غالب نمبر۔ ۱۹۹۶ء)، جو شخص اپنی ایم اے کی شاگرد بشریٰ باسط کے مقالے ''ادا جعفری۔ شخصیت اور شاعری'' (۱۹۹۱ء) کا بیشتر حصّہ اپنے نام سے ''نقوش'' میں چھپوا سکتا ہو (دیکھیے ''نقوش۔'' شمارہ ۱۳۹۔ص ۶۶۳ تا ۷۳۹) اور اسی قبیل کے دیگر کئی افسوس ناک کام (جن کی تفصیل کبھی آئندہ) کر سکتا ہو، اُس سے بعید نہیں کہ زندگی کے کسی کمزور لمحے میں اس سے یہ ترامیم بھی 'سرزد' ہو گئی ہوں! بس، خطا نمودہ اَم وچشم آفریں دارم، والا معاملہ ہے، معاملہ نہیں المیہ ہے۔ (ص ۲۰، ۲۱)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ اس سب کا تعلق ''نسخہ لاہور'' اور اس کے قضیے سے ہے۔ اس اقتباس کے ساتھ حاشیہ نمبر۳ کو ملا کر پڑھا جائے تو صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تحسین صاحب کے کتابچے میں محض ''دیوانِ غالب'' کے ''نسخہ خواجہ'' اور ''نسخہ لاہور'' تک بحث کو محدود رکھا جاتا، معین الرحمٰن کے دیگر ادبی گھپلوں کی نشاندہی اس میں نہ کی جاتی، لیکن غور تو فرمائیے۔ مذکورہ بالا بیان میں معین

صاحب کے دیگر ادبی گھپلوں کا ذکر ''نسخہ لاہور'' کے ضمن ہی میں آیا ہے۔ اقتباس مندرجہ بالا کے پہلے جملے کو پڑھیے۔ اس جملے میں جس حقیقت کا بیان کیا گیا ہے، بعد کے بیان کردہ ادبی گھپلوں کی تفصیل اس حقیقت کو ثقاہت اور تقویت دینے کے لیے نہایت ضروری تھی۔ گویا معین صاحب کے مذکورہ ادبی گھپلوں کی تفصیل ''نسخہ لاہور'' میں جعل سازی کے قیاس کو یقین میں بدل دیتی ہے، اور ظاہر ہے یقین کی حد تک یہ قیاس معین صاحب کے دیگر ادبی گھپلوں کے بیان کے بغیر نہ کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ معین صاحب کے مزید افسوس ناک کاموں کی تفصیل بعد میں پیش کی جائے گی۔ گویا وہ اس کتابچے میں معین صاحب کے غیر متعلق افسوس ناک کاموں کی تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ گیان چند صاحب نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے اس بیان کو اہمیت کیوں نہیں دی؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔

۵۔ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ مبینہ ''نسخہ خواجہ'' اصل میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا گم شدہ نسخہ لاہور ہی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی ایک رائے یہ ہے:

''ڈاکٹر معین الرحمٰن حیاتِ غالب کے اس مخطوطے کو محفوظ رکھ سکے اور دوسرے مخطوطاتِ دیوان کی طرح اسے گم نہ ہونے دیا۔ اردو دنیا پر یہ ان کا بڑا احسان ہے۔'' (مضمون ہذا۔ آخری سے پہلا صفحہ)۔

بعض دیگر اہلِ علم بھی معین صاحب کے بارے میں یہی موقف رکھتے ہیں۔ مجھے ایک بار پھر بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے بزرگ محقق اور ادیب نسخہ لاہور کے قضیے کی سنگینی کا یا تو ادراک ہی نہیں کرسکے، اور اگر انھیں ادراک ہوا بھی تو کسی مجبوری، دباؤ یا تعلقات کی خاطر وہ حقیقت سے آنکھیں چرا کر لگی لپٹی لگا کر کہتے اور سچ بولنے اور لکھنے سے کتراتے رہے۔ صد افسوس!

اگر معاملہ واقعی اتنا ہوتا کہ ''نسخہ لاہور'' کسی طرح معین صاحب کے پاس پہنچ گیا اور انھوں نے اسے حفاظت سے رکھ کر اب شائع کر دیا، تو یقیناً ہم بھی معین صاحب کے ممنون ہوتے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔

ا۔ نسخے کے ص ۲۲ کے نیچے سے Accession No. 6812 کا کھرچا جانا اور نسخے کے آخر میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مدّور مہر پر ''فتے دین / فتح دین'' کی چیپی لگانا یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب مالِ مسروقہ کو اپنا بنانے کی غرض سے کیا گیا۔ اگر یہ جعل سازی معین صاحب نے نہیں کی تو یہ فطری امر تھا کہ وہ مخطوطہ حاصل ہونے کے بعد آخری صفحے پر ''فتے دین'' کی چیپی اتار کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں یہ مخطوطہ ۱۹۸۱ء کے

لگ بھگ حاصل ہوا۔ ۱۹۹۸ء میں اس کی اشاعت کے وقت اسے سترہ سال کے "لگ بھگ" ہو گئے کہ یہ معین صاحب کے پاس رہا، لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے اس دوران یہ تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی کہ "فتح دین" کی چیپی کے نیچے کیا ہے۔

ب۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا عرشی اور قاضی عبدالودود کے تعارف پا ہے پڑھ کر اور "نسخہ خواجہ" ملاحظہ کر کے کئی اہل علم اس نتیجے پر، بہ یک نظر پہنچ گئے کہ یہ "نسخہ لاہور" ہی ہے۔ کیا سترہ سالوں میں معین صاحب کو اس کا ادراک نہ ہوسکا۔ یقیناً ہوگیا، اسی لیے تو انھوں نے شد و مد سے اپنے مقدمے میں "نسخہ خواجہ" کو "نسخہ لاہور" سے الگ نسخہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے یہ کہانی بھی گھڑی کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں "دیوانِ غالب" کے ایک سے زائد نسخے تھے ("نسخہ شیرانی" کو چھوڑ کر)، جو اب غائب ہو چکے ہیں۔ حالانکہ وہ خود "اشاریۂ غالب" (جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۹ء) میں یہ لکھ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں "دیوانِ غالب" کا ایک ہی مخطوطہ ہے ("نسخہ شیرانی" کو چھوڑ کر)۔

ج۔ اگر معین صاحب واقعتاً اس نسخے کے امین تھے تو یہ ثابت ہونے کے بعد کہ یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا گمشدہ "نسخہ لاہور" ہے، انھوں نے نسخہ یونیورسٹی لائبریری کو واپس کرنے کے بجائے یہ پروپیگنڈا شد و مد سے کیوں کیا کہ یہ "نسخہ لاہور" نہیں، "نسخہ خواجہ" ہی ہے۔ انھیں تو فطری طور پر ڈاکٹر تحسین فراقی اور دیگر محققین کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ نسخے کی پہچان ہوگئی اور بغیر وقت ضائع کیے انھیں اس نسخے کو یونیورسٹی لائبریری کو واپس کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ یہی لکیر پیٹتے رہے کہ یہ "نسخہ خواجہ" ہی ہے اور دوسری طرف حالات کو اپنے خلاف ہوتا دیکھ کر یونیورسٹی لائبریری کو نسخہ اس طرح واپس کیا کہ جیسے وہ یونیورسٹی پر احسان کر رہے ہوں۔

د۔ اگر معین صاحب کی نیت صاف تھی تو انھوں نے یونیورسٹی لائبریری کو نسخہ واپس کرتے وقت لیمینیٹ (Laminate) کیوں کرایا؟ صرف اس لیے کہ کوئی "فتح دین" کی چیپی اتار کر حقیقت حال سے واقف نہ ہو جائے، جو ویسے بھی معلوم ہو چکی ہے۔

کیا مذکورہ بالا تمام تفاصیل ڈاکٹر معین الرحمٰن کی بدنیتی کو ثابت نہیں کرتیں؟ کیا ایسے آدمی کو یہ خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے کہ اُس نے نسخہ مذکورہ سنبھال کر رکھا اور اُسے شائع کر دیا۔

اسی معاملے کا ایک اور پہلو بھی دیکھتے چلیے۔ اگر یہ نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہوتا تو کیا وہاں یہ محفوظ نہ رہتا اور کیا اس کی اشاعت کا بندوبست نہ ہوسکتا؟ جب کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا مملوکہ ایک اور نادر نسخہ "دیوانِ غالب" (نسخہ شیرانی) آج بھی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور ۱۹۶۹ء میں مجلسِ ترقی ادب لاہور سے شائع بھی ہو چکا ہے۔

تمام معاملے پر غیر جانب دارانہ نظر ڈالنے اور مذکورہ بالا تفاصیل کا جائزہ لینے کے بعد اس امر کے لیے ڈاکٹر معین الرحمٰن کو کسی طور بھی خراج تحسین پیش نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے ''نسخہ لاہور'' سنبھال کر رکھا۔ انھوں نے اسے سنبھال کر نہیں رکھا بلکہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اُسے ایک عرصے تک چھپائے رکھا۔ یہ قابل تحسین اقدام تو کسی طرح نہیں کہلا سکتا، ہاں! معین صاحب کی بدنیتی، بے ایمانی، خیانت اور پنجاب یونیورسٹی جیسے بڑے قومی ادارے کے ساتھ دھوکا دہی کو ضرور ظاہر کرتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ گیان صاحب ان الفاظ کو بھی ''ذاتیات'' میں شمار نہ کرلیں، لیکن حقیقت تو حقیقت ہے، محقق کا کام حقیقت اور سچ کو سامنے لانا ہے، یہ گیان صاحب سے زیادہ کون جان سکے گا۔

۶۔ مقالہ نگار نے ذاتیات میں الجھنے کے سلسلے میں ''فریقین'' کا نام لیا ہے جو درست نہیں۔ مجھے نہیں معلوم ڈاکٹر گیان صاحب کی کیا مجبوری ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچے اور ڈاکٹر معین صاحب کے جوابی کتابچے کو برابر تولا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کا کتابچہ علمی تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتا ہے، اس کا اعتراف تو خود گیان صاحب کرچکے ہیں۔ جب کہ معین صاحب کا کتابچہ کوسنوں، بددعاؤں اور ذاتی عناد سے بھرا ہوا ہے۔ اقتباسات پیش کرنے کی ضرورت نہیں، اس مقصد کے لیے معین صاحب کا پورا کتابچہ ہی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ ڈاکٹر گیان صاحب کا یہ لکھنا بھی درست نہیں کہ ''معین صاحب نے معترض کے اعتراضات کے جو جواب دیے ہیں، وہ کہیں قائل کرتے ہیں ۔۔۔۔'' یہ گول مول بیان کسی امر کو ثابت نہیں کرتا۔ گیان صاحب کو معین صاحب کے کچھ ایسے معقول جوابات کی طرف اشارہ کرنا چاہیے تھا تاکہ بات واضح ہوسکتی۔ ویسے ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کے جواب میں معین صاحب کے جوابات کی حقیقت ملاحظہ کرنے کے لیے ڈاکٹر عارف ثاقب کا کتابچہ دیکھا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے تحسین صاحب کے اعتراضات اور معین صاحب کے جوابات کا موازنہ کرکے ثابت کیا ہے کہ معین صاحب، تحسین صاحب کے کسی اعتراض کا بھی تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ یہ کتابچہ کتاب ہٰذا میں شامل ہے۔

۸۔ مجھے حیرت ہے کہ گیان صاحب کو دُکھ کیوں کر ہوا؟ بطور محقق میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا، درست ہوا۔ یہ سب کچھ بہت پہلے ہونا چاہیے تھا تاکہ معین صاحب جیسے جعلی محققین سادہ لوحوں کی آنکھوں میں دھول نہ جھونک سکیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت عرصہ پہلے گیان صاحب نے اپنے ایک خطبے میں (جو بعد ازاں غالباً ''ہماری زبان'' علی گڑھ اور ''قومی زبان'' کراچی میں شائع بھی ہوا) اُن محققین اور

اساتذہ کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں گیا تھا جو مطلب پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کم تر سطح کا تحقیقی کام کرتے ہیں، لیکن اب وہی گیان چند ایک سارق کی سرقہ بازی کو طشت ازبام کیے جانے پر اُس کے لیے ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یا للعجب!

گیان صاحب سے زیادہ کون جان سکے گا کہ تحقیق کا مقصد اور محقق کا فرض سچائی کو سامنے لانا ہے۔ اس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی گیان صاحب اس پر تو یقین رکھتے ہوں گے کہ ''جیسی کرنی ویسی بھرنی''۔ جیسا معین صاحب نے بویا ویسا ہی کاٹا۔ پھر اس میں افسوس کی گنجائش کہاں سے نکلتی ہے؟

۹۔ اس سلسلے میں دیکھیے سیّد قدرت نقوی مرحوم کا کتابچہ جو اس کتاب میں شامل ہے۔ انھوں نے بجا طور پر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ معین صاحب نے مذہب و مطلّا بیل بوٹوں اور آرائشی محرابوں کی تفصیل بیان نہیں کی۔ گیان صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ مخطوطات کے بیان میں یہ تفصیلات کتنی اہم ہوتی ہیں۔ محض اسی امر کو پیش نظر رکھا جائے تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معین صاحب نے مخطوطے کے تعارف میں تمام ضروری معلومات فراہم کردی ہیں؟ اس کے علاوہ یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ معین صاحب نے مخطوطے سے متعلق جو معلومات مہیّا کی ہیں، وہ کاملاً ۔۔۔۔ یا بیش تر سیّد عبداللہ، مولانا عرشی اور قاضی عبدالودود سے ہی مستعار ہیں۔

۱۰۔ حیرت ہے گیان صاحب کا خیال اس طرف کیوں نہیں گیا کہ غالب کے قلم کی اصلاحوں وغیرہ کی تفاصیل معین صاحب سے قبل ڈاکٹر سیّد عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی بیان کر چکے تھے۔ معین صاحب نے انھی محققین کے بیانات سے خوشہ چینی کی ہے۔ وہ خود یہ ساری تفصیلات بیان کرنے پر قادر ہیں، یہ امر محتاج ثبوت ہے۔

۱۱۔ گیان صاحب نے اپنے مضمون میں جو زیادتیاں کی ہیں، ان کی تفصیل حواشی کے ذریعے واضح کروی گئی ہے لیکن اُن کا یہ لکھنا کہ '' مقدمہ تحقیقی اعتبار سے تشفی بخش ہے'' باقی زیادتیوں پر بازی لے گیا ہے۔

خود گیان صاحب بھی معین صاحب کی متعدد خامیوں اور غلطیوں کی نشان دہی فرما چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تحسین فراقی اور سیّد قدرت نقوی کے کتابچوں میں معین صاحب کے مقدمے میں تحقیق کے ڈھول کا پول بڑی کامیابی کے ساتھ کھولا گیا ہے۔ حیرت ہے گیان صاحب یہ کتابچے دیکھنے کے باوجود یہ لکھتے ہیں کہ ''مقدمہ تحقیقی اعتبار سے تشفی بخش ہے۔'' میرا خیال ہے اس بیان کے ابطال میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بیان خود ناقابل یقین ہے، اس کا اندازہ اُن قارئین کو بہ خوبی ہے جنھوں نے اس معارضے کے

سلسے کے تینوں کتابچے پڑھے ہیں اور ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' بھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔

۱۲۔ یہاں پھر گیان صاحب نے جانبداری سے کام لیا ہے۔ انھیں صاف صاف لکھنا چاہیے تھا کہ فارسی دیباچے کا اُردو ترجمہ معین صاحب کا زائیدۂ فکر نہیں۔ معین صاحب کی مہارت فارسی کی حقیقت تو ڈاکٹر تحسین فراقی اپنے کتابچے میں اچھی طرح واضح کر چکے ہیں۔ اس کے بعد تو گی لپٹی رکھنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ معلوم نہیں کس مجبوری نے ڈاکٹر گیان کو یہ بات صاف صاف لکھنے سے روکا۔

۱۳۔ اس سلسلے میں دیکھیے حاشیہ نمبر ۵۔

۱۴۔ حیرت ہے! یہ کہہ کر تو گیان صاحب نے حد ہی کر دی کہ ''میرے بعض مشاہدات اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے جملہ اعتراضات کے باوجود میں معین الرحمٰن کے اس کام کو اچھی تدوین کہوں گا۔''

اگر یہ الفاظ واقعتا معروف محقق ڈاکٹر گیان چند جین ہی کے ہیں تو بطور محقق، مجھے ان کا یہ بیان پڑھ کر از حد دُکھ ہوا ہے کہ انھوں نے ایک ساقط الاعتبار ترتیب کی ان الفاظ میں تعریف کی۔

اس ایک جملے میں گیان چند صاحب نے دو متضاد بیانات دیے ہیں۔ ایک یہ کہ معین صاحب کی تدوین پر گیان صاحب، قدرت نقوی صاحب اور تحسین فراقی صاحب کے اعتراضات، اور دوسرا بیان معین صاحب کے کام کو اچھی تدوین کہنا۔ واضح نہیں کہ گیان صاحب نے دونوں بیانات میں کیا ربط پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے اُن کے، ڈاکٹر تحسین فراقی کے اور سید قدرت نقوی کے اعتراضات کی روشنی میں معین صاحب کے کام کو کسی طرح بھی اچھی تدوین نہیں کہا جاسکتا، اور اگر معین صاحب کے کام کو اچھی تدوین مان لیں تو مذکورہ تینوں حضرات کے وزنی اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ یہ لکھنا زیادتی کی انتہا ہے کہ ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' تدوین کا اچھا نمونہ ہے۔ میں یہاں اعادہ کرنا چاہوں گا کہ جانے گیان صاحب کی کیا مجبوری ہے کہ وہ اس مضمون میں بعض بیانات خلافِ حقیقت لکھ گئے ہیں۔ اُن جیسے آزمودہ کار اور بزرگ محقق سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔

۱۵۔ معلوم نہیں گیان صاحب کے اس بیان کے بارے میں کیا رائے دی جائے کہ ''اسے مولانا عرشی کے ''نسخۂ عرشی'' کے معیار سے نہ پرکھیے۔'' اچھا ہوتا اگر گیان صاحب وہ معیار بھی بیان کر دیتے جس پر پرکھ کر ''نسخۂ خواجہ'' کو اچھی تدوین کہا جاسکتا۔

مجھے حیرت کے پے درپے جھٹکے لگے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ مضمون واقعتا معروف محقق ڈاکٹر گیان چند جین ہی نے لکھا ہے۔ آج سے پہلے نہ انھوں نے اپنی کسی

تحریر میں اور نہ کسی اور محقق نے یہ بیان کیا ہے کہ تحقیق اور تدوین کے بھی مختلف معیار ہوتے ہیں۔ ہم ایسے طالب علم تو ڈاکٹر گیان چند اور دیگر محققین کی تحریروں میں یہی پڑھتے آ رہے ہیں کہ تحقیق کے اصولوں پر پوری اترنے والی تحریر اور متن ہی تحقیق و تدوین کہلا سکتی ہے۔ آج گیان صاحب تدوین کے دو جداگانہ معیاروں کی بات کر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا اس پر کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے، اور کس پر یقین کیا جائے اور کس پر نہ کیا جائے۔

ادبی دُنیا میں مکروریا اور جعلسازیوں کی حیرت انگیز رُوداد

رفیق احمد نقش (کراچی)

مرزا غالب کی تحریروں کی اشاعت میں جعل سازی کا آغاز خود غالب کی ذات گرامی سے ہوتا ہے۔ محمد حسین دکنی کی فارسی لغت ''بُرہان قاطع'' کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے جب غالب نے ''قاطع بُرہان'' شائع کی تو اس وقت کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور غالب کی کتاب کے جواب میں کئی کتابیں سامنے آئیں۔ مذکورہ کتابوں میں سے کچھ میں نازیبا زبان استعمال کی گئی تھی۔ غالب کو یہ بات اپنی حیثیت سے کم تر معلوم ہوئی کہ ان کا جواب اپنے نام سے تحریر کریں؛ تاہم جواب دینا بھی ضروری تھا۔ سید سعادت علی کی فارسی تالیف ''محرق بُرہان قاطع'' کا جواب غالب نے ''سوالات عبدالکریم'' کے نام سے اردو میں شائع کیا۔ یہ کتاب عبدالکریم نامی طالب علم کی تصنیف کے طور پر سامنے آئی۔ ماہرین غالبیات کی متفقہ رائے ہے کہ یہ کتابچہ غالب کی تحریر ہے۔ ''محرق قاطع بُرہان'' کے جواب میں غالب نے ''لطائف غیبی'' کے نام سے اردو ہی میں ایک اور کتابچہ تحریر کیا اور اِس کتاب پر بطور مصنف اپنے شاگرو میاں داد خان سیاح کا نام درج کیا۔ ساتھ ہی سیاح کو ''سیف الحق'' کے خطاب سے نوازا۔ سیاح کو اپنے تخلص کی رعایت سے سیرو سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ وہ اکثر حالتِ سفر میں رہتے تھے۔ سیاح کے نام سے غالب کا کتابچہ ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو چھپا۔ ظاہر ہے کہ کتابچے کی اشاعت سے سیاح کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی۔ اس جعل سازی کا سیاح کی زندگی پر کیا اثر پڑا؟ عبدالرؤف عروج ''بزم غالب'' (ص ۱۰، ۲۰۹) میں لکھتے ہیں:

''۱۸۷۸ء میں سیاح بمبئی سے حیدرآباد جا رہے تھے۔ انھوں نے

دوسرے درجے کا ٹکٹ خرید کر سو روپے کا نوٹ بھنایا۔ اس کے فوری
بعد ایک اور مسافر نے بھی سو روپے کا نوٹ دے کر ٹکٹ حاصل کیا۔
اس کے اور سیاح کے نوٹ کا نمبر ایک ہی تھا' جس پر کارروائی پولیس
کے سپرد کی گئی اور سیاح کو حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر جعلی کرنسی بنانے
اور چلانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ زبردست پہرے میں بمبئی
لائے گئے جہاں ان کو چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔"

"قاطع بُرہان" کے ہنگامے میں غالب نے نہ صرف اپنی تحریریں دوسروں کے ناموں سے اپنی حمایت میں شائع کیں' بلکہ اپنی فارسی دانی کو پایۂ استناد بخشنے کے لیے ایک ایرانی الاصل اُستاد بھی تخلیق کر ڈالا۔ غالب کے مطابق اس کا اصلی نام ہرمزد تھا۔ پچاس سال تک علمائے عرب سے استفادے کے بعد اس نے زردشتی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا اور اپنا اسلامی نام عبدالصمد رکھا۔ ۱۲۳۱ھ (۱۷۔۱۸۱۶ء) میں وہ آگرہ پہنچا اور دو سال تک غالب کا مہمان رہا۔ اس عرصے میں غالب نے اس سے فارسی زبان کی باریکیاں اور اسرار و رموز سیکھے۔ محقق بے بدل قاضی عبدالودود کے مطابق: "غالب کو ایک سہارے کی ضرورت تھی اور اس کے احساس نے اُنہیں عبدالصمد کی تخلیق پر مجبور کیا۔ علمی تحقیقات شاعری نہیں کہ غالب یہ دعویٰ کر سکیں کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

تحقیقات میں غالب کے لیے "عبدالصمد" وہی ہے جو "غیب" شاعری میں ہے۔"

غالب نے اس خوبی سے اپنے فرضی استاد کے خدوخال ابھارے ہیں کہ حالی سے حال تک کے محققین عبدالصمد کے وجود خارجی کے ہونے نہ ہونے پر اپنے دلائل دیتے رہے ہیں۔

یہاں تک تو ہوئی غالب کی جعل سازی۔ دوسری طرف خود غالب کی زندگی میں ان کی دو جعلی شاگرد پیدا ہو گئے۔ سید محمد فخرالدین حسین خاں سخن دہلوی اور شاہ باقر علی باقر بہاری نے غالب سے تلمذ کا دعویٰ کیا' بل کہ سخن نے تو غالب سے رشتے داری ظاہر کر کے انھیں اپنا نانا قرار دے لیا۔ یہ سارا سلسلہ بھی "قاطع بُرہان" کے ہنگامے کا

شاخسانہ تھا۔ غالب کی کتاب کے جواب میں آغا احمد علی احمد نے ''مؤید برہان'' لکھی۔ یہ صاحب کلکتے کے ایک مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ غالب نے کتاب دیکھے بغیر، صرف اس کا ذکر سُن کر، اکتیس اشعار پر مشتمل ایک قطعہ اس کے جواب میں لکھا۔ اس قطعے کا جواب آغا احمد علی نے لکھا مگر اس پر نام اپنے شاگرد مولوی عبدالصمد فدا سلہٹی کا دیا۔ یہاں ہمارے دونوں ہیرو باقر علی باقر اور فخرالدین سخن اس ڈرامے میں وارد ہوئے اور اسی زمین میں فدا کے قطعے کا جواب لکھ کر شائع کر دیا۔ بعد میں چاروں قطعات ''ہنگامہ دل آشوب'' کے نام سے ۱۸۶۷ء میں یک جا شائع ہوئے۔ اس کتاب میں قطعہ باقر کے ذیل میں ''تلمیذِ حضرت غالب مدظلہ العالی'' اور قطعہ سخن کے ذیل میں ''تلمیذ و نبیرۂ حضرت جناب نواب اسداللہ خان غالب ممدوح الصدر......'' لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے:

> ''سخن...... جانتے تھے کہ چوں کہ وہ غالب کی طرف داری کر رہے ہیں، اس لیے اگر خود کو ''تلمیذ و نبیرۂ غالب'' لکھیں تو غالب ہرگز تردید نہیں کریں گے۔ انھوں نے نہ صرف خود کو، بلکہ اپنے دوست باقر کو بھی تلمیذِ غالب لکھ دیا۔''

(''صحیفہ''، لاہور۔ غالب نمبر۔ حصہ سوم۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔ ص ۹۱)

سخن کا دیوان، غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) کے سترہ سال بعد ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں سخن نے غالب کے نام سے ایک تقریظ لکھ کر شامل کر دی۔ اس میں غالب کی طرف سے اپنی رشتے داری پر یوں مہر تصدیق ثبت کرائی ہے:

> ''میں مغلوبِ دہر، غالب نام، جو بازار ہستی میں متاع کا سد ہوں، بحسب اصطلاحِ فقہا، اس سیدزادہ قدسی نہاد کا جدِ فاسد ہوں۔''

غالب اور کلام غالب کے سلسلے میں جعل سازی کا سلسلہ حیاتِ غالب سے تاحال جاری ہے۔ عبدالباری نے ۱۹۳۱ء میں اپنی شرح کلام غالب شائع کی تو بائیس غزلیں خود کہہ کر غالب کے نام سے مذکورہ شرح میں داخل کر دیں، ساتھ ہی اپنے والد بزرگ وار خلیفہ حسام الدین احمد آلدنی کو ان الفاظ میں غالب کی قربت بخش دی:

''خود میرے والد مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں تھے۔ ان کے کمالِ سخن کے پورے راز دان تھے۔''

سید محمد اسماعیل رسا ہمدانی نے غالب کے ایک اصلی خط کے ساتھ چھبیس جعلی خط غالب کے نام سے لکھ کر ''نادر خطوط غالب'' کے عنوان کے تحت شائع کیے۔

جعلی سازی میں مفتی انتظام اللہ شہابی کو کمال حاصل تھا۔ انھوں نے بے شمار غلط روایات، بیش تر کسی حوالے کے بغیر اور کم تر روایات حوالوں سے تحریر کیں اور یہ حوالے بھی جعلی ہیں۔ ''لطائف الشعرا'' میں من جملہ اور شعرا کے غالب کے بارے میں بھی وہ ایک حقیقی تو دس بیس فرضی حکایات لکھ ماری ہیں۔

بھوپال کے ماڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر مولانا ابراہیم خلیل نے اسکول کے مجلّے ''گوہر تعلیم'' بابت اپریل ۱۹۳۷ء میں ''اپریل فول'' کے عنوان کے تحت غالب کی ایک (جعلی) غزل چھاپی تھی؛ جس کا مطلع تھا:

بھولے سے کاش وہ اِدھر آئیں تو شام ہو
کیا لُطف ہے جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو

اس غزل کا مقطع ہے:

پیرانہ سال غالب مے کش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

شدہ شدہ یہ غزل ''ہمایوں'' (اپریل ۱۹۳۹ء) میں غالب کے نام سے نقل ہوئی اور وہاں سے لے کر مالک رام جیسے ماہر غالبیات نے اپنے مرتبہ ''دیوانِ غالب'' میں شامل کر دی۔

کلام غالب کے سلسلے میں جعل سازی کا تازہ ترین شاہ کار ''دیوانِ غالب' نسخہ خواجہ'' ہے۔ چوٹی کے محققین کے مطابق ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے پیش کیا جانے والا دیوانِ غالب دراصل ''نسخہ لاہور'' ہے جو جامعہ پنجاب کی ملکیت تھا اور وہاں سے غائب ہو گیا/ غائب کر لیا گیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قضیے پر روشنی ڈالنے سے قبل ایک اور ''نسخۂ لاہور'' کی بابت بھی کچھ بات ہو جائے۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ساری دنیا میں بالعموم اور پاک و ہند میں بالخصوص غالبیات میں قابلِ قدر

اضافے ہوئے۔ اس سال کا ایک اہم تحفہ خود نوشت مخطوطہ دیوانِ غالب تھا۔ یہ مخطوطہ امروہہ کے تاجر کتب توفیق احمد چشتی کو بھوپال سے دست یاب ہوا۔ انھوں نے اس نسخے کو فروخت کے لیے پیش کرتے ہوئے اسے ''نسخہ امروہہ'' سے موسوم کیا۔ اس نسخے کے لیے ''نسخہ امروہہ کے علاوہ ''نسخہ بھوپال قدیم''، ''نسخہ بھوپال ثانی''، ''نسخہ عرشی زادہ''، ''نسخہ لاہور'' اور ''نسخہ نقوش'' کے نام بھی سامنے آئے۔

''امروہیوں [کذا۔ درست امروہویوں] کا اصرار یوں ہے کہ پہلے پہل امروہہ کے ایک دکان دار کے ہاتھ یہ نسخہ لگا۔ عرشی زادہ کا اصرار یوں ہے کہ ایک امروہوی نے سودا بازی کر کے اس پر دیباچہ لکھ ڈالا۔ بھوپالیوں کا اصرار یوں ہے کہ نسخے نے بھوپال سے امروہہ ہجرت کی تھی۔ لاہوریوں کا اصرار یوں ہے کہ انھوں نے اسے چھاپا۔ اگر فیصلہ اس بات پر ہونا ہے کہ نسخہ کس شہر کا ہے تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ یہ نسخہ نہ امروہہ کا ہے، نہ بھوپال کا، نہ لاہور کا اور نہ رام پور کا! یہ نسخہ دہلی کا ہے کیوں کہ اس کا کاتب دہلی (چاہے اکبرآباد کہہ لیجیے) کا تھا اور سب سے پہلے یہ نسخہ وہیں تھا۔'' (''نقوش'' غالب نمبر (۳)' ۱۹۷۱ء۔ ص ۳۷۴)۔ ''نقوش'' کا شمارہ نمبر ۱۱۳، اکتوبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ یہ غالب نمبر حصہ دوم تھا۔ اس میں دیوانِ غالب' بخطِ غالب مع نستعلیق نقل چھاپا گیا۔ اس کے صفحہ ۴ پر محمد نقوش (محمد طفیل) لکھتے ہیں۔ ''چونکہ یہ بیاض سب سے پہلے لاہور میں چھپی ہے، اس لیے میری خواہش ہے کہ اسے نسخہ لاہور کے نام سے یاد کیا جائے۔'' لیکن ان کا یہ دعویٰ درست نہ تھا کیونکہ نسخہ عرشی زادہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں چھپ چکا تھا اور چند افراد تک پہنچ بھی گیا تھا۔ گیان چند نے بے حد باریک بینی سے جائزہ لے کر ثابت کر دیا کہ ''نقوش'' کے مذکورہ شمارے میں شائع شدہ دیوانِ غالب کے مرتب کی نظر سے نسخہ عرشی زادہ گزر چکا ہے اور بغیر کسی حوالے یا اعتراف کے اس سے بھرپور استفادہ ہر صفحے سے مترشح ہے۔ یوں اس متنازع نسخے کو جس بنا پر نسخہ لاہور قرار دیا جاتا' وہ بنا ہی غائب ہوگئی۔ اس سلسلے کے تفصیلی مطالعے کے لیے ''رموز غالب۔'' (از گیان چند۔ شائع کردہ ادارۂ یادگار غالب، کراچی) کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

''ماہ نو'' کراچی کے جولائی ۱۹۵۴ء کے شمارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے جامعہ پنجاب' لاہور میں موجود دیوانِ غالب کے ایک نسخے کا تعارف کرایا۔ ''دیوان غالب کا

ایک نادر قلمی نسخہ'' نامی اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے: ''حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مرزا غالب کے دیوانِ اردو کا ایک قلمی نسخہ داخل ہوا ہے جس کی میرے نزدیک کئی وجوہ سے اہمیت ہے۔'' اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ نسخہ ۱۹۵۳ء کے اواخر یا ۱۹۵۴ء کے اوائل میں جامعہ پنجاب کے کتب خانے کی زینت بنا ہو گا۔

مشہور محقق اور ماہر غالبیات قاضی عبدالودود جب پاکستان آئے تو انھوں نے نومبر ۱۹۵۷ء میں لاہور میں مذکورہ نسخے کا روٹو گراف تیار کرایا اور اسے اپنے ساتھ ہندوستان لے گئے، جہاں یہ روٹو گراف امتیاز علی عرشی کو دے دیا گیا۔ قاضی عبدالودود نے دیوانِ غالب کے اس نسخے سے متعلق اپنی تحریری یادداشتیں ''نقوش'' کے اکتوبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں ''متفرقات'' کے ذیل میں ''مخطوطہ دیوانِ غالب'' کے عنوان سے شائع کرائیں۔ قاضی صاحب کے فراہم کردہ روٹو گراف سے امتیاز علی عرشی نے بھرپور استفادہ کیا اور ۱۹۵۸ء میں اپنے مرتبہ ''دیوان غالب'' کی طبع اوّل کے مقدمے میں، جہاں انھوں نے اپنے زیرِ مطالعہ بارہ قلمی نسخوں کی تفصیلات پیش کی ہیں' وہیں دسویں نمبر پر زیرِ بحث نسخے کو ''نسخہ لاہور'' قرار دیتے ہوئے وہ اس کی تفصیلات بھی ضبطِ تحریر میں لائے ہیں۔ دیوانِ غالب کا یہ نادر نسخہ بعدازاں کتب خانہ جامعہ پنجاب میں موجود نہیں رہا۔ ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا مرتبہ ''دیوانِ غالب' نسخہ خواجہ'' بڑی آب و تاب سے سامنے آیا۔ یہ حسنِ طباعت کا شاہ کار تھا۔ اس میں دائیں ہاتھ پر مخطوطے کا عکس اور بائیں ہاتھ پر مروج املا میں اس عکس کی نستعلیق نقل موجود ہے۔ حواشی لکھنے میں محنت نظر آتی ہے۔ مقدمے میں سارا زور اس بات پر ہے کہ ان کا مرتبہ موجودہ نسخہ ایک نئی دریافت ہے۔ نسخے کا انتساب انگریزی زبان و ادب کے مشہور استاد اور اردو کے معروف ادیب پروفیسر خواجہ منظور حسین مرحوم کے نام کیا گیا ہے۔ نیز اس نسخے کو خواجہ صاحب ہی سے موسوم کر کے اسے ''نسخہ خواجہ'' قرار دیا ہے۔

اس سال یعنی ۲۰۰۰ء میں' ''دیوانِ غالب' نسخہ خواجہ' تجزیہ و تحسین'' کے نام سے سوا تین سو صفحات سے زائد کی ایک کتاب سید معین الرحمٰن کے بیٹے سید وقار معین کے نام سے منسوب ادارے ''الوقار پبلی کیشنز، لاہور'' سے چھپی ہے۔ کتاب پر مرتبین کے طور پر

ڈاکٹر سید معراج نیز اور اصغر ندیم سید صاحبان کے نام دیے گئے ہیں۔ یہ دونوں حضرات سید معین الرحمٰن کے شاگرد [شاگرد نہیں ماتحت ہیں۔ مدیر] ہیں۔ مرتبین کے مطابق: "یہ مضامین زیادہ تر خود استاد محترم کے توجہ دلانے پر ضبط تحریر میں آئے۔ ان نگارشات کی جمع و ترتیب کی عزت ہمارا مقسوم ٹھہری۔ سعادت مند شاگردوں کی پہچان یہی ہے کہ وہ استاد کے کام آنے کو اپنی عزت سمجھتے ہیں......" اس کتاب کی پیش کش سے لے کر اس کے مندرجات کی ترتیب تک غالب اور ان کے شاگرد میاں داد خان سیاح کے روابط کی یاد دہانی کراتی نظر آتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ سید معین الرحمٰن نے "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" کی اشاعت کے ساتھ ہی "...... تجزیہ و تحسین" کی اشاعت کا منصوبہ بھی پیش نظر رکھ لیا تھا۔ رشید حسین خان کو کتاب نذر کرتے ہوئے جو عبارت لکھی تھی، اسے اپنے پاس الگ سے محفوظ کر لیا۔ ضمیر نیازی سے جو مراسلت ہوئی، اس کے درمیان' فون پر کی جانے والی گفت گو سے متعلق ڈائری کا اندراج بھی موجود ہے۔ اہل علم کو "نسخۂ خواجہ" کے نسخے بھیج بھیج کر ان سے فوری تاثرات لکھ بھیجنے کا تقاضا کیا گیا...... ظاہر ہے کہ فوری طور پر تعریف تو ممکن ہے، اور بیش تر افراد نے حسنِ طباعت کی بجا طور پر تعریف کی ہے۔ تحقیقی نقائص ظاہر کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اسی لیے محتاط محققین نے سید معین الرحمٰن کے خاطر خواہ تعریف سے کام نہیں لیا۔ "نسخۂ خواجہ پر آپ میری تحریر چاہتے ہیں۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار تو میں نے دیوان دیکھتے ہی کر دیا تھا۔ بہرحال' کچھ لکھ بھیجوں گا۔" (مختار الدین احمد...... ص ۳۴)

"اس سلسلے میں اتنی رائیں اور ایسے ایسے لوگوں کی رائیں' آپ نے "تحقیق نامہ" میں اور اس نسخے کے آغاز میں شامل کر لی ہیں کہ وہ کافی ہیں۔ ان پر اب اضافے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔" (رشید حسن خان...... ص ۵۸)

"...... تجزیہ و تحسین" میں شامل متعدد مضامین پر اختلافی یا وضاحتی حواشی "معین الرحمٰن" کے قلم سے ہیں۔ غالب میں کم از کم اتنا سلیقہ تو تھا کہ سیاح کے نام سے "لطائف غیبی" شائع کی تو اس میں اپنے نام سے کوئی تحریر نہیں لکھی' الا بہ صورتِ اقتباس۔ سید معین الرحمٰن کے تحریر کردہ حواشی کے معیار کا اندازہ صفحہ نمبر ۴۵ پر دیے گئے حاشیے سے ہو سکتا ہے جہاں انھوں نے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے: "نسخۂ خواجہ" کسی "نظر فریب

جزدان'' سے تہی ہے (معین الرحمٰن)۔ اس حاشیے میں ایجاد بندہ کے تحت لفظ ''تہی'' کو مخالف سمت میں معنوی وسعت دینے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھا ہے: ''کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے اپنے طور پر دیوانِ غالب کے جس ''نسخہ لاہور'' کا تعارف کرایا ہے، وہ معین صاحب کے شائع کردہ اس نسخے سے مختلف نہیں۔'' (''...... تجزیہ و تحسین' ص۳۸)۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں ''مجھے تو یہ نسخہ عین مین ''نسخہ لاہور'' ہی معلوم ہوتا ہے۔'' (ص۵۵) ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''میں نے اسے ''نسخہ خواجہ'' نہیں لکھا، یوں کہ اس کا جواز مجھے نظر نہیں آیا، میں اسے ''نسخہ لاہور'' ہی کہوں گا۔'' (ص۵۹)۔

اس سلسلے میں سید معین الرحمٰن کا موقف ابہام اور ژولیدہ بیانی سے مملو ہے: ''نسخہ خواجہ، نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا توام ضرور ہے، لیکن یہ سید عبداللہ کے نسخے سے مماثل، مگر اس سے مختلف ہے۔'' (ص۵۷)۔ صفحہ نمبر ۶۰ پر سید عبداللہ کے نام سے قبل، ''ڈاکٹر'' کے اضافے سے یہی عبارت دُہرائی ہے:

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

''نسخہ لاہور'' کے حوالے سے سید معین الرحمٰن کا تازہ ترین موقف ''نئی صدی'' لاہور کے ایڈیٹر عمر زمان کے جائزے بہ عنوان ''دیوانِ غالب کا نادر نسخہ اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن'' میں چھپا ہے (پندرہ روزہ ''بجنگ آمد''، جلد ۵، شمارہ ۱) اس کے مطابق ''...... قاضی (عبدالودود) صاحب کی اطلاع پر امتیاز (علی) عرشی صاحب نے یہ فرض کر لیا کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سید عبداللہ نے کیا ہے۔ انھوں نے نسخوں کو ایک ہی سمجھ لیا۔ جن کی زیادہ نظر نہیں، وہ بلا تحقیق ایک ہی نسخے کی بات کر رہے ہیں، حالانکہ ایک سے زیادہ نسخے رہے ہوں گے''۔

واضح رہے کہ ''نسخہ لاہور'' امتیاز علی عرشی نے ۱۹۵۸ء میں قرار دیا تھا اور ۱۹۶۹ء میں جب سید معین الرحمٰن نے ''اشاریہ غالب'' شائع کیا تو عرشی صاحب (بتوسط قاضی عبدالودود) اور سید عبداللہ کے متعارفہ نسخوں کو الگ الگ نسخے نہیں بلکہ ایک ہی نسخہ مانا ہے۔ ''اشاریہ غالب'' میں ''دیوانِ غالب اردو کے اہم خطی اور مطبوعہ نسخوں کا تاریخ وار

اجمالی خاکہ'' پیش کرتے ہوئے نویں نمبر پر ''نسخہ لاہور'' ۱۲۶۸ھ' ۱۸۵۲ء کو رکھا ہے اور اس سلسلے میں حاشیے میں یہ اطلاع دی ہے کہ: ''اس نسخے کے تعارف کے لیے دیکھیے' مضمون! ڈاکٹر سید عبداللہ، ''ماہ نو'' کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء م، ص ۱۵۔۱۹''

''نسخہ لاہور'' کو ''نسخہ خواجہ'' بننے تک کن مراحل سے گزرنا پڑا' یہ ایک عبرت ناک داستان ہے۔

۱۹۹۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی مرتبہ کتاب ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ'' اور ۲۰۰۰ء کے اوائل میں ''دیوانِ غالب' نسخہ خواجہ....... تجزیہ و تحسین'' شائع ہوئی۔ ثانی الذکر کتاب میں تجزیہ بقدر اشک بلبل ہے' تقریباً ساری کتاب تحسین پر مبنی ہے جو کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد ہے۔ اس صورتِ حال پر سخن شناس ڈاکٹر تحسین فراقی نے مُہر شکوت توڑی اور ۲۷ صفحات پر مبنی ایک تحقیقی مطالعہ بہ عنوان ''دیوانِ غالب' نسخہ خواجہ....... اصل حقائق'' پیش کیا۔ اس کتابچے میں دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ''نسخہ خواجہ'' اصل میں ''نسخہ لاہور'' ہے' جس کا تعارف قبل ازیں ڈاکٹر سید عبداللہ' قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی پیش کر چکے ہیں۔ اس کتابچے کے جواب میں ''دیوانِ غالب' نسخہ خواجہ...... صحیح صورت حال'' کے نام سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ۶۴ صفحات کا ایک کتابچہ شائع کیا۔ یہ کتابچہ اس سال مئی میں سامنے آیا۔ اگست ۲۰۰۰ء میں مشہور ماہر غالبیات سید قدرت نقوی کے کتابچے ''دیوانِ غالب' نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ......ایک جائزہ'' کی اشاعت ہوئی' جس میں غالب کے اردو خطوط اور دیوانِ غالب کے زیر بحث نسخے کے غائر مطالعے سے انھوں نے ثابت کیا کہ غالب نے یہ نسخہ خاص اہتمام سے تیار کرا کے مہاراجا جے پور کو بھجوایا تھا کہ وہاں سے کچھ یافت ہو۔ اس سلسلے کا چوتھا کتابچہ پہلے دو کتابچوں کے تقابلی جائزے پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر عارف ثاقب اپنے اس جائزے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''معین صاحب فراقی صاحب کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے۔ ہنوز، جواب ان پر قرض ہے۔''

اس دوران مختلف اخبارات و رسائل میں اس قضیے سے متعلق ایک درجن سے زیادہ تحریریں چھپ چکی ہیں۔ علاوہ ازیں اس سلسلے میں شائع شدہ تین نظمیں بھی ہماری نظر سے گزری ہیں۔ ''مخطوطہ دیوانِ غالب کی چوری پر'' ہاتف زعفرانی کی نظم کے آخری

شعر کی ترکیب ثانی سے ۱۴۲۱ھ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے:

نسخۂ مملوکۂ پنجاب یونیورسٹی
نسخۂ مسروقہ گنجینۂ مانوس ہے

اس قضیے کے نتیجے میں ''انجمن تحفظِ ناموسِ غالب و رشید احمد صدیقی'' کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس انجمن نے ابتدائی طور پر ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ ''اہل علم و ادب کو مژدہ ہو۔'' اس پمفلٹ میں معین صاحب کی جعل سازیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے آخر میں اہل علم کو مژدہ سنایا گیا ہے کہ ''اب خاموشی کا پردہ چاک ہوگا اور علم و ادب کے ساتھ جعل سازی کرنے والا ہر جعل ساز پیوندِ خاک ہوگا''

ہم اس قضیے اور متعلقہ معاملات پر اپنے مشاہدات پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے کتابچے میں علمی وقار قائم رکھا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا ذکر کرتے ہوئے یا تو ان کا پورا نام لکھا ہے یا ''معین صاحب'' لکھا ہے۔ ''معین صاحب'' نے جوابی کتابچے کے ابتدائیے ''حرفے چند ......'' میں صورت حال کی مماثلت کا لحاظ روا رکھتے ہوئے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی تحریر کا اقتباس دیا ہے ''جس شخص کو دوست سمجھا ہو اس کے خلاف توہین و تحقیر کے الفاظ میرے قلم سے نہیں نکل سکتے۔'' لیکن آگے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس اقتباس میں دیے گئے اصول کی دھجیاں اڑا کر اخلاقی دیوالیے پن کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مذکورہ جوابی کتابچے میں ''معین صاحب'' نے پانچ جگہ ''تحسین فراقی'' اور کم از کم پینتیس جگہ ''ت۔ف'' لکھ کر ڈاکٹر تحسین فراقی کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں دوسری طرف سے ہاتف زعفرانی اور جعفر بلوچ نے اپنے منظومات میں ''م۔ر'' اور ''مر'' کے ذریعے ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

م ر نے نسخۂ مسروقہ شائع کر دیا
گویا اب یہ نسخہ اس کا خرقۂ سالوس ہے

(ہاتف زعفرانی)

''حضرت مر'' کی ہیں توفیقات اس سے بھی فزوں
ہے غلط املا تو کیا ؟ کج ہے اگر انشا تو کیا؟

(جعفر بلوچ)

خود معین الرحمٰن صاحب نے اپنے نام کی جس طرح تخفیف کی ہے، وہ زیادہ بامعنی ہے۔ اپنے مجموعہ مضامین ''تحقیق غالب'' (طبع اول ۱۹۸۱ء) کے صفحہ نمبر ۱۲۰ کے حاشیے کے آخر میں انھوں نے اپنے نام کا مخفف ''م۔ا۔ر'' دیا ہے۔ ان حروف کو ملا کر لکھنے سے جو لفظ بنتا ہے، اس کے پیشِ نظر ہمیں ایک غیر متعلق شعر یاد آ گیا جس میں صنعتِ ایہام کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

زلف لٹکا کے وہ جس دم سرِ بازار چلا
ہر طرف شور اٹھا، مار چلا، مار چلا

''نسخہ خواجہ'' کے ''نسخہ لاہور'' ہونے یا نہ ہونے سے متعلق معین صاحب کے بیانات میں رفتہ رفتہ تبدیلی آتی نظر آتی ہے۔ ''اشاریہ غالب'' کے حوالے سے ہم قبل ازیں اشارہ کر چکے ہیں کہ قاضی عبدالودود کے توسط سے جس نسخے کا روٹو گراف حاصل کر کے امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب میں اسے ''نسخہ لاہور'' قرار دیا تھا، معین صاحب نے اس کے بارے میں حاشیہ لکھا ہے: ''اس نسخے کے تعارف کے لیے دیکھیے مضمون: ڈاکٹر سید عبداللہ، ماہِ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۱۵۔۱۹'' (''اشاریہ۔ غالب''، ص ۳۱۶)

اس سے پتا چلتا ہے کہ معین صاحب کے نزدیک مذکورہ بالا تینوں محققین کے متعارفہ نسخے دو یا تین نہیں بلکہ ایک ہی نسخہ تھا۔ تاہم جب اس نسخے کو انھوں نے اشاعت کے لیے تیار کیا تو ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون میں موجود دو ایک فروگزاشتوں کی بنا پر انھوں نے اسے محولہ بالا نسخے سے الگ نسخہ قرار دیا۔ جب نسخے کی اشاعت کے بعد معین صاحب نے اہم علمی و ادبی شخصیتوں کو تبصرے کے لیے مجبور کیا تو ڈاکٹر حنیف نقوی اور رشید حسن خان جیسے صاحب نظر محققین نے سابقہ ''تین نسخوں'' اور موجودہ نسخے سے متعلق اپنی الگ الگ رائے میں یہی اظہار کیا کہ: ......اصل میں ''چاروں'' ایک ہیں۔

ڈاکٹر حنیف نقوی کے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے معین صاحب نے یہ موقف اختیار کیا کہ ''میں نسخہ خواجہ کو ڈاکٹر سید عبداللہ کے متعارفہ نسخے کا ہم عصر اور مماثل مانتا ہوں، لیکن ان میں فرق اور اختلاف بھی بہت نمایاں ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کا متعارفہ قلمی نسخہ، جسے عرشی صاحب نسخہ لاہور کہتے ہیں، نسخہ خواجہ سے نسبتاً زیادہ

مماثلت رکھتا ہے، لیکن انھیں من و من ایک کہنا یا سمجھنا قرین حقیقت نہیں۔''

رشید حسن خاں نے جب انھیں لکھا کہ ''مجھے تو یہ نسخہ عین مین نسخہ لاہور ہی معلوم ہوتا ہے'' تو جواباً معین صاحب عجب گول مول موقف اختیار کرتے ہیں۔ ''نسخہ خواجہ، نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا توام تو ضرور ہے، لیکن یہ سید عبداللہ کے نسخے سے مماثل، مگر اس سے مختلف ہے۔''

معین صاحب کا تازہ ترین بیان ''جنگ آمد'' (۶۔ تا ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۰ء) کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے...... ''جن کی زیادہ نظر نہیں، وہ بلا تحقیق ایک ہی نسخے کی بات کر رہے ہیں، حالانکہ ایک سے زیادہ نسخے رہے ہوں گے۔''

ان تمام باتوں سے قطع نظر، تحسین فراقی نے اپنے کتابچے کے آخر میں جو مختلف عکس شائع کیے ہیں، ان کو بہ چشم سر دیکھ کر، ایک عام آدمی بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ مختلف عکس ایک ہی نسخے کے ہیں۔ کوئی کاتب ایک ہی مسودے کو سامنے رکھ کر اگر دو ایک جیسے نسخے بنانا چاہے تو وہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، اس کے لفظوں کی نشست، نقطوں کی جگہ اور کشش کے انداز میں ہر صفحے میں کہیں نہ کہیں ضرور فرق ہوگا، جبکہ سید عبداللہ کے متعارفہ نسخے، عرشی صاحب کو فراہم شدہ روٹو گراف اور نسخہ خواجہ کے متعلقہ صفحوں کے عکوس میں سرمو کوئی فرق نہیں اور نسخہ خواجہ میں جہاں فرق پیدا کیا گیا ہے، وہیں سے چوری پکڑی جا رہی ہے۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، ہر باقاعدہ کتب خانہ داخل کی جانے والی کتابوں کا کوئی ایک صفحہ ایکسیشن نمبر لکھنے کے لیے مخصوص کر لیتا ہے تاکہ کسی وجہ سے کتاب کے ابتدائی صفحات ضائع ہو جائیں تو بھی مخصوص صفحے پر نمبر دیکھ کر متعلقہ رجسٹر سے کتاب کے کوائف معلوم کیے جا سکیں۔ جامعہ پنجاب کے کتب خانے نے صفحہ ۲۲ کو مخصوص کر رکھا ہے۔ نسخہ خواجہ میں مخطوطے کا جو عکس چھپا ہے، اس میں صفحہ نمبر ۲۲ پر تزئینی چوکھٹے کے نچلے حصے سے کتاب کا ایکسیشن نمبر چھیل کر مٹایا ہوا ہے۔ اگر یہ نسخہ جامعہ پنجاب کا نہیں تو اس کے اسی صفحے پر چھیلنے کا نشان کیوں ہے؟

نسخہ خواجہ میں مخطوطے کے آخری صفحے کے عکس میں صفحے کے زیریں نصف میں ''فتے دین'' اور اس کے ٹھیک نیچے ''فتح دین'' لکھا ہوا ہے اور یہ کتاب کے صفحے پر نہیں،

بلکہ ایک الگ کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر اسے کتاب پر چپکایا گیا ہے۔ معترضین کا کہنا ہے کہ کاغذ کے اس ٹکڑے کے نیچے جامعہ پنجاب کے کتب خانے کی مدور مہر کو چھپایا گیا ہے۔ سید قدرت نقوی کے بقول، ''چپکی ہوئی چیپی کا چھڑانا کوئی مشکل کام تو نہیں تھا۔ جب کہ آج کل ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے والے طلبہ تک لفافوں سے ٹکٹ آبی عمل یا عمل تبخیر کے ذریعے باآسانی، اچھی حالت میں اتار لیتے ہیں تو پھر معین الرحمٰن جیسے ''زیرک محقق'' کے لیے یہ کون سا دُشوار کام تھا؟ انھوں نے صرف اس وجہ سے اس چیپی کو الگ نہیں کیا کہ اس کے ہٹ جانے سے وہ پوشیدہ امر ظاہر ہو جاتا جسے وہ راز رکھنا چاہتے تھے......''

اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں متعلقہ چیپی ہٹانی نہ پڑ جائے، ''حفاظتی نقطہ نظر سے'' جامعہ پنجاب کو پیش کرنے سے پہلے مخطوطے کے صفحات پر لیمینیشن کروا لیا گیا۔ تاہم اب بھی حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے توجہ دلائی ہے کہ ''عہدِ جدید کی تکنیکی پیش رفت کے باعث فرینزک تکنیک اور انفرا ریڈ کیمرے اور کیمیائی تجزیوں بشمول کاربن ٹیسٹ وغیرہ سے دستاویزات میں نقطے برابر ردوبدل اور تحریف و تغیر کا بھی ناقابلِ تردید تعین ممکن ہے، چنانچہ ان جدید ترین تکنیکوں کا اطلاق نسخہ خواجہ کی چند تحریفات پر بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے، تاکہ حقیقتِ حال کھل کر سامنے آ جائے۔''

معین صاحب بجا طور پر دیوانِ غالب کے زیرِ بحث مخطوطے کو ''اپنے ذخیرے کی بڑی قیمتی متاع'' خیال کرتے رہے۔ انھوں نے ''حفاظت کے مستقل انتظام'' کی شرط پر شیخ الجامعہ پنجاب کو پیش کش کی کہ ''......میں آپ کی اجازت سے اس بے مثال قیمتی نسخے کو بلا قیمت، عطیہ اعزازی کے طور پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کو پیش کرنے کی خوشی پاؤں تو یہ امر میرے لیے طمانیت اور سعادت کا باعث ہوگا۔''

یہ پیش کش ۷ اگست ۱۹۹۹ء کو وائس چانسلر ڈاکٹر خالد حمید شیخ کو کی گئی تھی جو انھوں نے بوجوہ قبول نہیں کی۔ بعدازاں موجودہ شیخ الجامعہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود نے جامعہ پنجاب کی جانب سے مذکورہ مخطوطہ بوجوہ قبول کر لیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معین صاحب کو کیا کوئی ایسی ضمانت فراہم کر دی گئی ہے کہ آئندہ اس نسخے کی حفاظت کا مستقل انتظام ہوگا؟ اگر ہاں، تو معین صاحب نے اپنا

سارا ذخیرۂ غالبیات وہاں کیوں نہ ''محفوظ'' کرا دیا کہ اس سے استفادے کا دائرہ وسیع ہو جاتا؟ اگر نہیں، تو اتنا قیمتی نسخہ ایسی جگہ کیوں جمع کرایا جہاں سے قبل ازیں دیوانِ غالب کا نسخہ شیرانی اور بقول سید معین الرحمٰن، دیوانِ غالب کے دیگر مخطوطے غائب ہو چکے ہیں؟ [دیوانِ غالب کا نسخہ شیرانی قلمی لائبریری سے تاحال چوری نہیں ہوا۔ مدیر]۔ ان سوالات پر غور کرتے ہوئے ایک ہی قوت ''دیوانِ غالب'' کا مخطوطہ جامعہ پنجاب کو واپس کرنے کے پسِ پشت کارفرما نظر آتی ہے اور اس قوت کو عرفِ عام میں ''ضمیر کی خلش'' کہا جاتا ہے۔ امجد اسلام امجد نے اپنے ایک شعری مجموعے کی ابتدا میں کسی ستم ظریف کا قول نقل کیا ہے کہ ضمیر آپ کو برائیوں سے روک نہیں سکتا، البتہ ان کا مزا ضرور خراب کر دیتا ہے۔

یہاں ہمیں سید معین الرحمٰن کے نام معروف بے باک صحافی ضمیر نیازی کے ایک خط کا فقرہ یاد آ گیا۔ ان کے موقف سے کوئی بھی باشعور شخص اختلاف نہیں کرے گا۔ وہ لکھتے ہیں: ''خود اپنی پی آر بہت گھٹیا اور ادب سے گرا ہوا فعل ہے......''

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن پر جعل سازی اور فریب کاری کے سنگین الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ الزامات میں سے کچھ کو انھوں نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے، کچھ کے جواب میں الزام لگانے والوں کو بد دعاؤں اور کوسنوں سے نوازا ہے اور کچھ الزامات کے جواب میں جو موقف اختیار کیا ہے، اس سے ''عذرِ گناہ، بدتر از گناہ'' کا عملی نمونہ سامنے آ جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:

رشید احمد صدیقی کی دسویں برسی (۱۹۸۷ء) کے موقع پر ان کے مقالے ''جدید غزل'' کو عابد رضا بیدار کے مقالے ''جدید اردو غزل'' کے ساتھ ملا کر ثانی الذکر نام سے معین صاحب نے شائع کروایا۔ کتاب کے پس ورق پر رشید احمد صدیقی اور سید معین الرحمٰن کا ایک ''گروپ فوٹو'' چھپا ہے جو جعل سازی کا شاہ کار ہے۔ تصویر میں دونوں حضرات کسی کنج باغ میں سبزے پر ایک جیسی دو کرسیوں پر متمکن دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ معین الرحمٰن کی زندگی بھر رشید صاحب سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ انھوں نے ''بڑی محنت'' سے ایک اضافی خالی کرسی کے ساتھ اپنی تصویر کھنچوائی۔ بعدازاں رشید صاحب کی ایک تصویر میں سے قطع و برید کے بعد انھیں اپنی تصویر کی خالی کرسی پر

جلوہ افروز کر دیا۔

چھ صفحات پر مشتمل ''انتساب''، ''اظہار عقیدت'' اور ''عرض مرتب'' کی عبارات میں معین صاحب نے کہیں یہ وضاحت نہیں کی کہ ''میں نے رشید صاحب کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی تیار کی ہے'' جیسا کہ بعد میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا۔ قبل ازیں یہی تصویر ''آپ بیتی رشید احمد صدیقی'' (مرتبہ سید معین الرحمٰن) میں بھی شامل کی گئی تھی۔

معین صاحب کا بیش تر کام ''قطع و پیوست'' CUT AND PASTE کا ہے۔ ان کی آرائشی عبارتیں تک دوسرے ادیبوں کی تحریروں سے اڑائی گئی ہیں اور جہاں انھوں نے ان عبارتوں کو پیوست کرنے کے لیے اپنی کارگزاری دکھائی ہے، وہاں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند صاف نظر آ جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریر کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

''شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔...... غزل فن ہی نہیں، فسوں بھی ہے...... '' (جدید اردو غزل، ص ۱۷)۔

معین صاحب نے اس کتاب کو رشید احمد صدیقی کی یاد سے منسوب کیا ہے۔ انتساب کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

> ''غزل فن ہی نہیں، فسوں بھی ہے، رشید صاحب بھی کچھ ایسے ہی تھے!
> غزل کا ذکر آتے ہی مجھے تشابہ لگنے لگتا ہے اور میرا ذہن رشید صاحب کی طرف مائل ہو جاتا ہے...... جیسے دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہو!''

اس انتساب میں ....''تشابہ لگنے'' کا محل استعمال، محلِ نظر ہے۔ ''تشابہ لگنے'' کے معنی ہیں: ''شبہ پڑنا۔ قرآن شریف کہیں سے کہیں پڑھنے لگ جانا۔ بھول میں پڑنا۔ چُوکنا۔'' صاحب ''جامع اللغات'' نے صراحت کی ہے کہ ''یہ محاورہ صرف قرآن شریف کے متعلق ہے۔''

رشید احمد صدیقی، معین صاحب کی خاص دلچسپی کا موضوع رہے ہیں۔ ان کے حوالے سے معین صاحب نے چار کتابیں مرتب کی ہیں اور مزید (کم از کم) دو کتابوں کی

ترتیب کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ رشید صاحب سے اظہار عقیدت میں غلو کی حد کو پہنچ گئے ہیں۔ ''اگر میں ان سے خون کا رشتہ بھی محسوس کرنے لگا ہوں تو کیا عجب! وہ میرے لیے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے، بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست!''

''زیادہ عزیز بزرگ دوست'' کی تحریروں سے معین صاحب کی بے خبری جائے حیرت و افسوس ہے۔ ''علی گڑھ میگزین'' (۴۹۔۱۹۴۸ء) میں رشید احمد صدیقی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ غالب سے متعلق اس مضمون کا عنوان تھا، ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔'' اس مضمون میں رشید صاحب نے وہ مشہور جملہ لکھا تھا جسے غالب پر تبصرے کے ذیل میں اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ تک رشید صاحب کے حوالے سے امتحانی کاپیوں میں لکھتے آئے ہیں: ''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اردو اور تاج محل''

معین صاحب نے ''قومی زبان'' کراچی میں شائع شدہ بقلم خود انٹرویو میں اپنے ''عزیز بزرگ دوست'' کے اس مشہور قول کو عبدالرحمٰن بجنوری سے منسوب کر دیا۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!

''نذر نظیر'' (اشاعت: نومبر ۱۹۹۸ء) میں معین صاحب کے مضمون ''نظیر صدیقی، بے مثل و بے نظیر'' کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے، ''مجھے لاہور، علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ اور بعض دوسری جامعات میں اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا......''

معین صاحب نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم بہاول نگر سے حاصل کی، بی اے اردو کالج کراچی سے، ناکمل ایل ایل بی اردو کالج کراچی سے اور ایم اے (اردو) جامعہ کراچی سے کیا۔ پی ایچ۔ڈی کی ڈگری سے جامعہ سندھ نے نوازا۔ احسان ناشناسی اور دروغ گوئی کو کام میں لاتے ہوئے معین صاحب نے اپنی مادران علمی کے ذکر سے اجتناب برتا اور ناحق جامعات: لاہور، علی گڑھ، الہ آباد اور لکھنؤ سے اپنا تعلق جوڑنے کی سعی کی۔

''نقوش'' کے شمارہ نمبر ۱۳۹ میں ''ادا جعفری، ایک تفصیلی مطالعہ'' کے عنوان سے ایک گوشہ مختص کیا گیا ہے جس میں محترمہ ادا جعفری کے انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ

''ادا جعفری، سوانحی و مزاجی خاکہ'' اور ''ادا جعفری کا شعری سرمایہ، تحقیق اور تلاش کی روشنی میں'' کے عنوانات کے تحت ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے نام سے دو تحریریں شامل اشاعت ہیں۔ یہی دونوں تحریریں ''ادا جعفری ...... شخصیت اور شاعری'' نامی مقالے میں ''تلاش'' (ص ۱۳ تا ۵۹) اور ''تحقیق اور تلاش'' (ص ۱۶۲ تا ۳۶۷) کے نام سے دو ابواب کے طور پر موجود ہیں۔ یہ مقالہ ایم۔اے۔ اردو کی تکمیل کے لیے بشریٰ باسط نامی طالبہ نے گورنمنٹ کالج، لاہور کے شعبہ اردو میں داخل کرایا تھا۔ اس مقالے کے نگران ڈاکٹر سلیم اختر تھے۔ ڈاکٹر صاحب مقالے کے معیار سے مطمئن نہ تھے، بنا بریں مقالے کی ''نگرانی'' معین صاحب نے سنبھال لی۔

اپنی شاگرد کی تحریروں کو سرقہ کرنے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے معین صاحب نے ایک جرم کا اعتراف کیا ہے کہ دراصل مذکورہ طالبہ کے مقالے کے لیے یہ تحریریں انھوں نے خود لکھ کر دی تھیں تاکہ طالبہ جلد از جلد امریکا جا کر اپنی بیمار والدہ سے مل سکے۔ طالبہ نے بھی اپنے مقالے کے پیش لفظ میں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ مقالے کے آغاز اور اختتام کے اجزا میرے لیے بمنزلہ ''ارمغان اور عطیہ رحمان'' ہیں۔

واضح رہے کہ ایم۔اے۔ کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ ۲۰۰ نمبر کا ہوتا ہے...... اور ملکی قوانین کے تحت امتحانات میں امیدوار کی اعانت قابلِ دست اندازی پولیس، جرم ہے۔ معین صاحب لکھتے ہیں: ''اگر کسی نہ کسی طوران کا تھیسس مکمل نہ ہو پاتا تو وہ ایم۔اے۔ کے دوسرے سالانہ امتحان میں شرکت کے لیے پاکستان نہ آپاتیں اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل میں، والدہ سے دور، تین برس کی طویل مدت گزارنے کے بعد اور باوجود، صرف بی اے کی بی اے رہ جاتیں۔''

گویا اگر کوئی طالب علم کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو انسانی ہمدردی کے تحت اس کی جگہ امتحان دیا جا سکتا ہے تاکہ وہ متعلقہ ڈگری کے حصول میں کامیاب ہو جائے۔ افسوس! کہ ہمارے ملکی قوانین، انسانی ہمدردی کے اس عظیم فعل کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتے۔ قانون کی اس کھلم کھلا خلاف ورزی اور شائع شدہ تحریری ثبوتوں کے باوجود معین صاحب اس وقت فخریہ محکمہ تعلیم حکومت پنجاب میں بی پی ایس ۲۱ کی تنخواہ اور مراعات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

محترمہ ادا جعفری پر ان کی تحریروں کے متنازع ہونے کا ایک ثبوت ۱۹۹۸ء میں شائع ہونے والی کتاب ''ادا جعفری، شخصیت اور فن'' ہے جس کے مرتبین ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور امراؤ طارق ہیں۔ اس کتاب میں قاضی عبدالغفار کی تحریر سے لے کر ''جنگ فورم'' کے تحت شاعرہ کی خود نوشت پر اظہار خیال کے لیے منعقدہ مذاکرے کی کارروائی تک ۳۹ تحریریں شامل کی گئی ہیں، تاہم پوری کتاب میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا نام ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتا۔

پرتھوی چندر کی سالہا سال کی تحقیق اور ان کے بیٹے نامور فوٹو گرافر وید پرکاش کی فوٹو گرافی کے اعلا نمونوں سے مزیّن ''جاگیرِ غالب'' کو معین صاحب نے ''ترتیب نو' تعارف اور مقدمہ'' کے نام پر اپنے نام سے چھاپا اور پس ورق پر اپنی ہی تحریر کے اقتباس کے ساتھ اپنی رنگین تصویر شائع کی۔

فارسی سے اچھی واقفیت نہ ہونے کے باوصف رشید حسن خان کے کیے ہوئے غالب کی کتاب ''دستنبو'' کے اردو ترجمے کی بنیاد پر ''غالب اور انقلاب ستاون'' نامی کتاب اپنے نام سے شائع کی۔ ستم ظریفی یہ کہ ہندوستان میں اس کتاب کی طباعت کی نگرانی رشید حسن خان صاحب کے سپرد کر دی اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کتاب کی طبعِ سوم (دہلی، ۱۹۸۸ء) میں غالب کے ایک مصرع کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا:

کیوں کر شکر ادا کیجیے اس لطفِ خاص کا!

معین صاحب نے یہ ''مصرع'' اسی صورت میں ''جاگیر غالب'' کے مقدمے کے اختتام پر کتاب کے ناشر عبدالحمید چودھری کی خدمت میں پیش کیا ہے (ص ۳۱)۔

غالب کا شعر ہے:

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ایک ایسا شخص جو غالب کے ایک مشہور مصرعے کو ایک سے زائد جگہوں پر بے وزن اور بے ربط کر کے لکھتا ہو، ماہر غالبیات ہونے کا دعوے دار ہے، بلکہ اصغر ندیم سید

کے نام سے چھپنے والی تحریر میں اسے ''غالب شناسی میں سب سے معتبر شخصیت اور غالب کے سب سے بڑے محقق و نقاد'' کے گراں قدر الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

تفو برتو، اے چرخ گرداں تفو!

(ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ فروری ۲۰۰۱ء۔ ص ۱۳ تا ۲۰)

☆

دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ
اصل حقائق

نگہت جہاں

حال ہی میں منظر عام پر آنے والی کتاب ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' میں ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے جناب ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ادبی بد دیانتی اور سرقے کا پردہ بھی چاک کیا ہے اور ان کی تحقیق کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے باقاعدہ ثبوت و شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کا متعارفہ ''دیوان غالب'' جسے وہ ''نسخہ خواجہ'' کہتے ہیں، اصل میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا وہی متعارفہ نسخہ ہے جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے گم ہو چکا ہے۔

یہ بات تحسین فراقی صاحب نے قیاساً نہیں کی بلکہ واضح دلائل کے ساتھ اصل حقائق بے نقاب کیے ہیں کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا متعارفہ نسخہ، جسے امتیاز علی عرشی نے ''نسخہ لاہور'' کا نام دیا تھا، اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کا متعارفہ نسخہ، جسے معین صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' کا نام دیا ہے، دراصل دونوں ایک ہیں، مگر معین صاحب نے اس قلمی نسخے کو ''نسخہ لاہور'' سے الگ ثابت کرنے کے لیے جگہ جگہ تصرّ فات سے کام لیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''نسخہ لاہور'' کے جو کوائف بتائے تھے اور قاضی عبدالودود نے ''متفرقات'' کے زیرِ عنوان مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' کے سرنامے کے تحت پنجاب یونیورسٹی کے اسی نسخے پر مختصر تعارفی شذرہ لکھا تھا، اس کے نکات اور امتیاز علی عرشی نے (نسخہ عرشی) میں جو خصوصیات بیان کی تھیں، تقریباً وہی خصوصیات ''نسخہ خواجہ'' میں موجود ہیں جن کا اقرار خود معین صاحب نے بھی کیا ہے۔

سید معین الرحمٰن صاحب نے جن خود ساختہ اختلافات کی بنیاد پر اپنے نسخے کو

''نسخہ لاہور'' سے الگ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ان تمام اختلافات کا تحسین فراقی صاحب نے ٹھوس دلائل کے ساتھ رد کیا ہے۔ اس ضمن میں پاکستان کے معروف مخطوطہ شناس خلیل الرحمٰن داؤدی کے مطابق معین الرحمٰن صاحب کا متعارفہ ''دیوان غالب'' کا نسخہ وہی ہے جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے جولائی ۱۹۵۴ء کے 'ماہ نو' کے شمارے میں متعارف کرایا تھا، جو اب پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے چوری ہو چکا ہے۔

رشید حسن خان بھی ''نسخہ لاہور'' اور ''نسخہ خواجہ'' کو الگ الگ قرار نہیں دیتے۔ بقول ان کے: ۔

''ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا''

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ معین صاحب کو یہ نسخہ کہاں سے ملا؟ فراقی صاحب لکھتے ہیں کہ معین صاحب کا کہنا ہے کہ یہ نسخہ ۱۹۸۱ء کے آس پاس، پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے مع ایک قلمی نسخے اور تین نادر مطبوعہ کتب کے ہاتھ لگا، مگر معین صاحب نے یہ وضاحت نہیں کی کہ پرانی کتابوں کا یہ کاروباری کون ہے؟ قیاس کیا جا رہا ہے کہ یہ نسخہ معین صاحب کو ایس۔ ایم۔ اکرام کی لائبریری سے ملا ہے کیونکہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی امتیاز علی عرشی کے علاوہ ایس۔ ایم۔ اکرام سے بھی اس نایاب نسخے کے بارے میں خط و کتابت رہی تھی اور سید عبداللہ صاحب نے یقیناً یہ نسخہ ایس۔ایم۔ اکرام کو روانہ کیا ہو گا اور کسی وجہ سے یہ واپس نہ آ سکا۔ ان کی وفات کے بعد معین صاحب نے ان کی نجی لائبریری کی فہرست سازی کی اور یہ نایاب نسخہ اپنی تحویل میں لے لیا ہو گا۔ واضح رہے کہ قیام پاکستان کے بعد چند سالوں تک بعض خاص افراد کو ایک فارم بھر دینے کے بعد قلمی نسخے جاری کر دیے جاتے تھے۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے ذریعے یہ نسخہ ایس۔ ایم۔ اکرام تک پہنچا ہو۔

اردو میں ترتیب و تحقیق متن کے آغاز کو ایک صدی بیت چکی ہے۔ قلمی نسخوں کے مرتبین نے نہایت توجہ اور محنت سے بہت عمدہ قلمی نسخے مرتب کیے۔ اس حوالے سے حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، رشید حسن خان، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ڈاکٹر خلیق انجم کے نام لیے جا سکتے ہیں، مگر معین صاحب جسے اپنا اعلیٰ تدوینی کارنامہ قرار دے رہے ہیں، فراقی صاحب کے نزدیک وہ تدوین کا قابل فخر کارنامہ نہیں

ہے۔ معین صاحب نے ''نسخہ خواجہ'' کو پندرہ، سترہ برس کی ریاضت کا حاصل قرار دیا ہے۔ کیا یہ نسخہ تحقیق و تدوین کے معیار پر پورا اترتا ہے؟ کیا اسے متنی تحقیق و تدوین کا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ فراقی صاحب نے اس نسخے میں ایک سو سے زائد اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ بقول فراقی صاحب، مرتب نے قلمی نسخے کی تدوین کے سلسلے میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔

تحقیق کے اصولوں کے مطابق دواوین کی ترتیب کے کام کے سلسلے میں مدون کو زبان، قواعد زبان، قواعد بیان، قواعد شاعری اور اوزان سے واقفیت نہایت ضروری ہے جبکہ معین صاحب تو مصرع تک وزن میں نہیں پڑھ سکتے اور تدوین متن شعر کے لیے موزوں طبع ہونا شرط اول ہے۔ اور تو اور، فراقی صاحب نے ان کی اس بے خبری کی بھی نشاندہی کی ہے کہ وہ نثر اور شعر کی مقفی عبارات کو منظوم عبارات سمجھ بیٹھے ہیں۔ تحقیق کے اصولوں کے مطابق تو ایسے شخص کو ترتیب دیوان کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ (ص ۲۷، ۲۸، ۲۹)

معین صاحب کے تدوین کردہ نسخے میں اغلاط کی اتنی بھرمار ہے کہ اسے کسی بھی طرح عمدہ تحقیق و تدوین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض اور قابل مذمت بات یہ ہے کہ یہ نسخہ ہی مسروقہ ہے۔ اس مسروقہ نسخے کو اپنا تحقیقی کارنامہ قرار دے کر شائع کرانا باعث ندامت ہے، اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ معین صاحب کے سرقے کی یہ داستان، داستانِ اول نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی ادبی چوریاں منظر عام پر آ چکی ہیں اور اہل ادب ان سے باخبر ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ پرتھوی چندر کی ''جاگیر غالب'' معین صاحب اپنے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر چھپوانے کا معاملہ بھی سب پر عیاں ہے۔ اپنی ہی شاگرد بشریٰ باسط کے مقالے ''ادا جعفری۔ شخصیت اور شاعری'' (۱۹۹۱ء) کا بیشتر حصہ بھی رسالہ ''نقوش'' میں اپنے نام سے شائع کرا چکے ہیں۔ ''ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک نادر خط'' جسے عاصمہ وقار نے سہ ماہی ''ارتکاز'' اکتوبر ۱۹۹۵ء میں متعارف کرایا تھا، اسی خط کو ۱۹۹۵ء کے ہی ماہ نومبر میں رسالہ ''ملامت'' میں معین صاحب نے اپنے نام سے متعارف کروایا۔

یہ سب ادبی گھپلے نہیں ہیں تو کیا ہیں؟

فراقی صاحب کی کتاب، جس میں انھوں نے معین صاحب کے سرقے کے راز فاش کیے ہیں، کے جواب میں معین صاحب نے جو وضاحت نامہ لکھا ہے، وہ وضاحت نامہ نہیں بلکہ دشنام نامہ محسوس ہوتا ہے۔ تحقیقی اور علمی امور اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انھیں علمی پیرائے میں بیان کیا جائے اور اختلافی امور کو سلیقے سے بیان کیا جائے مگر یہ بات قابل افسوس ہے کہ معین صاحب نے جو زبان استعمال کی ہے، انھیں اس قسم کی عامیانہ اور بازاری زبان سے اجتناب کرنا چاہیے تھا۔ تحسین فراقی صاحب عرصہ پچیس برس سے پیشہ تدریس سے وابستہ ہیں اور سب ہی ان کی شرافت نفاست اور دیانتداری کے قائل ہیں۔ ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید نے جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں فراقی صاحب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تحسین فراقی کے بارے میں سب کی یہی رائے ہے، وہ کسی ادبی دھڑے بندی یا یونیورسٹی اساتذہ کی کسی منفی سیاست میں شریک نہیں رہے۔ وہ اچھے شاعر اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ مرنجاں مرنج، وضع دار اور شریف النفس انسان ہیں۔''

اظہر جاوید آگے چل کر لکھتے ہیں:

''چند دن پہلے ایک قومی اخبار میں لطیف الزماں کا انٹرویو چھپا۔ ایک زمانہ نہ صرف ان کی تحقیق وجستجو کا قائل ہے بلکہ انھیں غالب پر سند کا درجہ دیا جاتا ہے۔ لطیف الزماں نے بھی تحسین فراقی کی حمایت کی ہے اور معین الرحمٰن کی دو چار اور چوریاں بھی گنوا دی ہیں۔''

معین صاحب کو کسی شریف النفس انسان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اخلاق کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ فراقی صاحب کی ادبی دنیا میں ایک اچھی پہچان ہے، نیک شہرت ہے۔ ان کی بہت سی علمی، تنقیدی، تحقیقی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ وہ ایک صاف گو اور دیانت دار محقق کی حیثیت سے معروف ہیں اور کئی ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ وہ ذاتی تاثرات وتعصبات سے بالا ہو کر فن پاروں اور ادبی کارناموں کا جائزہ مرتب کرتے ہیں۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں بھی انھوں نے معروضی اور خالص علمی انداز میں حقائق کو بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ایک استاد کے لیے اس قسم کے معاملات میں ملوث ہونا نہ صرف بذات خود شرمندگی کا باعث ہے بلکہ سنگین جرم بھی ہے۔ یہ اُس ادارے کی بدنامی ہے جس سے معین صاحب وابستہ ہیں۔ تدریس ایک نہایت مقدس اور پیغمبرانہ منصب ہے۔ معین صاحب نے اس قسم کے کام کر کے نہ صرف اپنے پیشے کے ساتھ ناانصافی کی ہے بلکہ تحقیق کے تقاضے بھی مجروح کیے ہیں۔

(مجلہ "زباب"۔ شمارہ نمبر ۵ ستمبر ۲۰۰۰ء۔ ص ۴۳ تا ۴۶)

☆

جاگیرِ غالب سے دیوانِ غالب تک

اختر حیات

قوموں کے عروج و زوال کے فلسفے پر غور کیا جائے تو، اور اسباب کے علاوہ ایک بڑا سبب اُس قوم کی تصورِ زندگی قرار پاتا ہے۔ زندہ قومیں حرکت اور حرارت کو اپنی زندگی کا اصل اُصول قرار دیتی ہیں اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگی رہتی ہیں۔ نت نئے علمی انکشافات اور تازہ کاری ان کے ضمیر کا حصہ ہوتی ہے۔ وہ ہر لحظہ اپنے عمل کا حساب کرتی رہتی ہیں اور ہر لمحہ صداقت اور سچائی کی تڑپ انھیں بے چین رکھتی ہے۔ مغربی قوموں کے عروج اور غلبے کا بڑا سبب اُن کی یہی علمی لگن ہے جس کے سبب وہ کائنات کی تسخیر میں مگن ہیں اور دُنیا کے متعدد منطقوں پر اپنی ثقافتی برتری کا جھنڈا گاڑے ہوئے ہیں۔

پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے ترپن برس ہو چکے مگر بدقسمتی سے یہ ملک ابھی تک کوئی بڑی علمی اور تحقیقی روایت پیدا نہیں کرسکا۔ پاکستان کے وہ تعلیمی ادارے جو تقسیم سے پہلے اپنی بے پناہ علمی لگن اور تحقیقی کارناموں کے باعث دُنیا میں نیک نام تھے، تخلیقِ پاکستان کے بعد اپنا علمی معیار قائم نہ رکھ سکے۔ یونیورسٹیوں کی علمی مسندوں پر رفتہ رفتہ ایسے لوگ قابض ہوتے چلے گئے جن کی حیثیت سیاسی طالع آزماؤں سے مختلف نہ تھی۔ حکام رسی، عہدہ طلبی اور بلند مناصب اُن کی زندگی کا واحد مقصد قرار پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دانش گاہیں اور ممتاز علمی ادارے انھی کاروباری ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان لوگوں کی چونکہ خود کوئی ممتاز علمی حیثیت نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنے اسٹاف میں بھرتی کرنے کے لیے بھی اپنی ہی قبیل کے لوگوں کا چناؤ شروع کردیا۔ نتیجہ یہ کہ طالع آزماؤں اور علم کو کاروبار بنانے والوں کا ایک سیلاب آ گیا۔ اب ان تعلیمی اداروں کی حالت یہ ہے کہ علم اور تحقیق کے نام پر جھوٹ اور جعل کا کاروبار پروان چڑھ رہا ہے۔ تعلیمی اداروں کے اساتذہ بڑا علمی و تحقیقی کام کرنے کی بجائے طلبہ کے لیے نوٹس لکھ رہے ہیں

اور پیسا بنا رہے ہیں۔ مادی آسائشوں کے حصول کے لیے ایک موش دوڑ لگی ہوئی ہے۔ علم کی مسندیں جہالت کی آماج گاہیں بن گئی ہیں۔

عرصہ ہوا مشہور صحافی ممتاز لیاقت نے ایک بڑی ہنگامہ خیز کتاب ''بکف چراغ دارد'' مرتب کر کے شائع کی تھی، جس میں انھوں نے بعض نامور ادبا کی علمی ڈاکہ زنی کو طشت ازبام کیا تھا۔ یہ کتاب پچیس تیس برس پہلے لکھی گئی تھی۔ تب سے اب تک علمی ڈاکہ زنی کی یہ روایت مزید پھلی پھولی، اور اب حالت یہ ہے کہ یار لوگ دھڑلے سے دوسروں کے علمی کاموں کو اپنے ناموں سے چھپوانے لگے، اور بدقسمتی سے کوئی ان کا محاسبہ کرنے کو تیار نہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں، جہاں ایک زمانے میں محمد حسین آزاد، ڈاکٹر لائٹنر، علامہ اقبال، ڈاکٹر عبدالسلام اور خواجہ منظور حسین جیسے بڑے اساتذہ پڑھاتے تھے، وہاں بعض ایسے اساتذہ بھی پڑھا رہے ہیں جو شاہین بچوں کو خاک بازی کا درس دے رہے ہیں۔ اب اردو کے ڈین اور صدر شعبہ سید معین الرحمٰن ہی کو لیجیے۔ اکیسویں گریڈ کے ان پروفیسر صاحب نے کچھ عرصہ پہلے دیوانِ غالب کا ایک قلمی نسخہ ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ نسخہ ان کے بقول انھیں ''پرانی کتابوں کے ایک کاروباری'' سے ملا تھا۔

یہ قلمی نسخہ غالب کے ۱۸۵۲ء تک کے کلام کا حامل ہے۔ یہ نسخہ اپنی خوبصورت مطلا لوح اور عمدہ کتابت کی وجہ سے کسی شاہزادے کے خزانے کی متاع لگتا ہے، جو ۱۸۵۷ء کے سانحے میں لٹ کر، کئی ہاتھوں سے گزر کر بالآخر ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی زینت بنا۔ وہاں سے یہ نسخہ چوری ہو کر یا کسی اور واسطے سے سید معین الرحمٰن کے ہاتھ لگا اور انھوں نے اسے ۱۹۹۸ء کے آخر میں ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ پھر اس نسخے پر پاک و ہند کے ممتاز و غیر ممتاز اہلِ قلم سے فرمائشی مضامین لکھوا کر اپنے شعبے کے ماتحتوں کے نام سے اپنے ہی اشاعتی ادارے سے شائع کر دیے۔ معین الرحمٰن صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان کا شائع کردہ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا قلمی نسخہ نہیں، جبکہ بعض اہلِ علم کی رائے میں یہ عین مین پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا نہایت قیمتی نسخہ ہے اور معین صاحب نے اسی مالِ مسروقہ کو اپنی متاع بنا کر شائع کیا ہے۔

اس ضمن میں کچھ عرصہ پہلے ایک کتابچہ ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' کے زیرِ عنوان شائع ہوا، جس میں قوی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا وہی قلمی نسخہ ہے جس کا تعارف جولائی ۱۹۵۴ء میں ممتاز استاد و دانشور ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''ماہِ نو'' میں کرایا تھا۔ اس کتابچے کے مصنف ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر تحسین فراقی ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے اس مقالے میں جن دلیلوں کے ساتھ اسے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا قلمی نسخہ قرار دیا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سید معین الرحمٰن کے متعارفہ نسخے کے صفحات ایک سو اٹھائیس ہیں۔ سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی عرشی نے بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے دیوانِ غالب کے جس قلمی نسخے کا تعارف کرایا تھا، اس کے صفحات ایک سو اٹھائیس ہیں۔

۲۔ معین الرحمٰن کے متعارفہ نسخے کی طرح باقی حضرات کے متعارفہ نسخوں میں بھی مسطر کی سطروں کی تعداد پندرہ ہے۔

۳۔ معین الرحمٰن صاحب کے متعارفہ نسخے کی لوح مطلا اور مذہب ہے اور چھ رنگ کی ہے۔ باقی حضرات کا متعارفہ نسخہ بھی بالکل یہی خصوصیات رکھتا ہے۔

۴۔ معین الرحمٰن صاحب کے دیوانِ غالب کے عکسی متن اور عرشی و سید عبداللہ کے عکسی متن میں نقطے اور شوشے تک کا فرق نہیں۔

۵۔ نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور کے ایک ہونے کی ایک ناقابلِ تردید دلیل یہ بھی ہے کہ اس پر لکھنے والے چاروں حضرات نے نیر رخشاں کی تقریظ کے اختتامی پیرے کے جو الفاظ نقل کیے ہیں، اُن میں غزل، قصیدہ، قطعہ اور رباعی کے اشعار کی مجموعی تعداد ''ایک ہزار پانچ سو پچاس سے کچھ اوپر'' بتائی گئی ہے۔

۶۔ نسخہ خواجہ کی طرح پنجاب یونیورسٹی کے نسخے کا بھی وہی سائز ہے، مسطر کی سطریں، کاتب کے قلم کا پوائنٹ اور صفحات کی تعداد سب ایک ہیں۔ ان میں ایک حرف تو کجا، ایک نقطے اور شوشے کا فرق نہیں۔ نسخہ خواجہ کی ہر سطر جس لفظ سے شروع ہوکر جس لفظ پر ختم ہوتی ہے، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے کے محفوظ صفحوں کی

بھی ہر سطر اسی لفظ سے شروع ہو کر اسی لفظ پر ختم ہوتی ہے۔ یہی حال متن کے اشعار کا ہے، یعنی پنجاب یونیورسٹی کے نسخے اور نسخہ خواجہ میں صفحہ بہ صفحہ بالکل ایک ہی پیٹرن پر اشعار کا اندراج ملتا ہے۔ جس جس صفحے پر ''ترک'' ہے، وہاں نسخہ خواجہ اور نسخہ پنجاب یونیورسٹی میں ذرہ برابر فرق نظر نہیں آتا۔

۷۔ ہندوستان کے ممتاز محقق رشید حسن خاں، معین الرحمٰن صاحب کے متعارفہ نسخے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے کو الگ الگ قرار نہیں دیتے۔ ان کا یہ جملہ لاہور اور کراچی کے اہل علم میں گردش کر رہا ہے کہ ''ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا۔''

۸۔ ہندوستان کے ایک اور ممتاز مصنف ڈاکٹر حنیف نقوی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ معین الرحمٰن صاحب کا نسخہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا نسخہ ہے، اس سے الگ نہیں۔

۹۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے قلمی نسخے اور معین الرحمٰن صاحب کے قلمی نسخے میں جو چند اختلاف نظر آتے ہیں، وہ خود معین الرحمٰن صاحب کی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں تحقیقی اور تدوینی معاملات میں پہلے بھی معین الرحمٰن صاحب کی شہرت اچھی نہیں تھی کیونکہ انھوں نے ایک عرصہ پہلے رشید احمد صدیقی کی تصویر کے ساتھ اپنی تصویر کی پیوند کاری کر کے یہ تاثر دینا چاہا تھا کہ دونوں میں ملاقات رہی ہے، حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پھر معین صاحب نے اپنی شاگرد بشریٰ باسط کے مقالے ''ادا جعفری، شخصیت اور شاعری'' کا بڑا حصہ ''نقوش'' کے شمارہ ۱۳۹ میں اپنے نام سے شائع کرایا۔ انھوں نے آنجہانی پرتھوی چندر کی کتاب ''جاگیرِ غالب'' بھی کچھ عرصہ پہلے اپنے نام سے شائع کر لی تھی اور ان کے اس کارنامے کی قلعی ''سورج'' کے غالب نمبر ۱۹۹۶ء میں کھولی گئی تھی۔ اسی طرح کے کئی اور افسوسناک کارنامے ان کے ہاتھوں پہلے بھی انجام پا چکے ہیں۔ اس لیے کچھ بعید نہیں کہ انھوں نے اپنے قلمی نسخے کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے سے الگ ثابت کرنے کے لیے اس میں ترامیم کر لی ہوں۔

۱۰۔ دیوانِ غالب کے نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے آخری صفحے پر مدور مہر صاف نظر آتی

ہے۔ معین صاحب کے نسخے میں اس مدور مہر کے اوپر کسی ''فتے دین'' کی چیپی لگادی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے سوال اُٹھایا ہے کہ کیا ''فتے دین'' اور ''جناب معین'' اصل میں دونوں ایک ہیں۔

۱۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس قیاس کا بھی اظہار کیا ہے کہ معین صاحب کو دیوانِ غالب کا یہ نادر نسخہ مشہور غالب شناس ایس۔ایم۔ اکرام کی لائبریری سے ہاتھ لگا ہے جس کی کتب کی فہرست سازی انھوں نے اکرام کی وفات کے بعد کی تھی۔ یہ نسخہ ایس۔ایم۔ اکرام تک سید عبداللہ کے توسط سے پہنچا ہوگا کیونکہ سید عبداللہ اور ایس۔ایم۔ اکرام کے مابین اس نسخے کے سنہ اور بعض دیگر تحقیقی اُمور کے تعین کے ضمن میں خط و کتابت رہی تھی۔

۱۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے دیوانِ غالب متعارفہ معین الرحمٰن کے ضمن میں متعدد اہل علم سے بھی تبادلہ خیالات کیا۔ ان سب کی متفقہ رائے یہ ہے کہ نسخہ خواجہ متعارفہ معین الرحمٰن، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ہی کے گم شدہ یا مسروقہ نسخے کا ظہورِ ثانی ہے۔

۱۳۔ پاکستان کے ممتاز ترین مخطوطہ شناس اور صاحبِ نظر محقق خلیل الرحمٰن داؤدی کا خیال ہے کہ ان کا پچاس برس کا مخطوطہ شناسی کا تجربہ بتاتا ہے اور اُن کی سوچی سمجھی رائے ہے کہ معین الرحمٰن صاحب کا متعارفہ نسخہ عین مین اور ہو بہو وہی نسخہ ہے جس کا تعارف جولائی ۱۹۵۴ء کے ''ماہ نو'' میں سید عبداللہ نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ایک نادر نسخے کے طور پر کریا تھا اور جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے غائب ہو چکا ہے۔

۱۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے پیشِ نظر کتابچے میں جو دلیل سب سے اہم نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی تحقیق کی رو سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ضابطے کے مطابق اس لائبریری کا متعینہ سیکرٹ پیج نمبر۲۲ ہے، جہاں ایکسیشن نمبر لگایا جاتا ہے تاکہ اگر کتاب چوری ہوجائے تو اس سیکرٹ پیج پر لگے نمبر کی مدد سے اس کی پہچان اور باز یافت ممکن ہو۔ اس تناظر میں اگر معین الرحمٰن صاحب کے نسخہ خواجہ کے ص ۲۲ کی عکسی نقل دیکھی جائے تو جدول کا زیریں حصہ صاف کھرچا گیا نظر آتا ہے۔

اس حصے پر اس نادر قلمی نسخے کا ایکسیشن نمبر درج تھا اور یونیورسٹی کی مہر ثبت تھی۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں سوال اُٹھایا ہے کہ آخر اس مشکوک یا مسروقہ نسخے کی خریداری ''پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے'' کس اُصول کے تحت کی گئی اور کیا اندریں حالات، اس کا موجودہ مالک قانون کی گرفت سے بچ سکتا ہے؟

ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن دلائل کو برتا ہے ان کی روشنی میں یہ یقین کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ معین الرحمٰن صاحب کا دیوانِ غالب کا متعارفہ نسخہ یقینی طور پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا نادر قلمی نسخہ ہے۔

''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' نامی اس مقالے میں مصنف نے جہاں یہ ثابت کیا ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ دراصل، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا گم شدہ یا مسروقہ نسخہ ہے، وہاں نہایت تفصیل کے ساتھ اور مثالیں پیش کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ نسخہ خواجہ کے مرتب سید معین الرحمٰن مصرع موزوں نہیں پڑھ سکتے اور ان کا یہ تدوینی کام، جس میں بقول معین صاحب، انھیں سولہ سترہ برس کی محنت اور ریاضت کرنی پڑی، تدوین کا نہایت ناقص اور مایوس کن نمونہ ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا خیال ہے کہ ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ'' کے مدونہ متن اور دیگر امور پر تحقیقی نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ معین الرحمٰن صاحب بڑی عجلت میں تھے۔ انھوں نے عکسی متن کے بالمقابل ہر صفحے کے اشعار کو جدید کتابت میں بھی شائع کیا ہے تاکہ جو لوگ قدیم خط سے واقف نہیں، وہ بھی دیوان کو سہولت سے پڑھ سکیں، مگر افسوس یہ ہے کہ مرتب موصوف نہ تو قلمی نسخے کا متن زیادہ توجہ سے دیکھ پائے اور نہ اس کی اطمینان بخش باز نوشت TRANSCRIPTION کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔

دیوانِ غالب کے نسخہ لاہور کی متنی تحقیق و باز نوشت میں ان کا ماڈل عرشی کا مرتبہ دیوانِ غالب رہا ہے چنانچہ اس کی اندھا دُھند تقلید سے (خصوصاً رموزِ اوقاف کے ضمن میں) تدوین کے تقاضے مجروح ہوئے ہیں اور بعض جگہ مفہوم خبط ہو گیا ہے۔ معاملہ صرف شعری متن تک محدود نہیں، معین الرحمٰن کے پیش کردہ نثری متن میں بھی غلطیاں ہیں اور

کلامِ غالب کی توقیت کے ضمن میں پیش کردہ مصرعوں، توضیحات اور تعلیقات میں بھی۔ انھوں نے غالب کے فارسی دیباچے اور نیر رخشاں کی تقریظ کے جو ترجمے ''تشکیل دیے'' ان میں بھی انھوں نے کئی مقامات پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ جہاں کہیں قُلابین کا اہتمام ضروری تھا، وہاں سرے سے ایسا کوئی اہتمام نظر نہیں آتا۔ حد تو یہ ہے کہ اس مختصر سے دیوانِ غالب کے شعری متن کے مشمولات کی فہرست تک غیر حاضر ہے۔

تدوینِ شاعری کے لیے املا کا یکساں ہونا ضروری ہے مگر معین الرحمٰن صاحب، مقالہ نگار کے بقول، اس ضمن میں بھی انتشارِ ذہنی کا شکار نظر آتے ہیں جس کے باعث املا دو عملی کا نونہ بن گئی ہے۔

معین صاحب ناموزوں طبع بھی ہیں۔ اس لیے انھوں نے قطعات کے مقفّیٰ عنوانات کو منظوم عنوانات قرار دے کر قارئین کے لیے تفننِ طبع کا وافر سامان پیدا کیا ہے۔ علاوہ ازیں مقالہ نگار کی رائے ہے کہ معین صاحب فارسی زبان سے قطعی ناواقف ہیں۔ اسی لیے ان سے غالب اور نیر کی فاسی عبارتوں کو نقل کرتے وقت کئی مقامات پر لغزشیں ہوئی ہیں۔ انھوں نے اضافتوں کا بے جا استعمال کر کے فارسی متن کے مفہوم کو خبط کر دیا ہے۔ مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> ''حیرت اس بات کی ہے کہ نسخۂ خواجہ کے مرتب کی کاوش سے ایک سو چھتیس برس قبل مطبع نظامی کے شائع کردہ دیوانِ غالب (۱۸۶۲ء) میں غالب کا فارسی دیباچہ کامل صحت کے ساتھ شائع ہو چکا تھا۔ نیز معین سے مدتوں پہلے عرشی اپنے نسخے میں فارسی دیباچہ و تقریظ بہت حد تک اطمینان بخش طریقے سے شائع کر چکے تھے، مگر افسوس کہ نسخۂ خواجہ مرتب کرتے وقت وہ ان کاوشوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ خود وہ فارسی جانتے نہیں کہ ان مشکل عبارات کو صحت کے ساتھ ضبط کر سکتے۔''

تحسین فراقی صاحب کی یہ کاوش اس باب میں بھی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اپنے اس مقالے میں واضح کر دیا ہے کہ دیوانِ غالب کے فارسی دیباچے (از غالب) کے کم از کم تین تراجم معین صاحب کے ترجمے سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے اعظم علوی، ڈاکٹر ظہور الدین احمد اور پروفیسر جابر علی سید کے تراجم کا ذکر اور تقابل کیا

ہے اور لکھا ہے کہ یہ تراجم چند کوتاہیوں کے باوجود اپنی اپنی خوبیاں بھی رکھتے ہیں اور معین صاحب نے ان میں سے بعض تراجم کو سامنے رکھ کر میں اپنا ترجمہ تشکیل دیا۔ یعنی ان کا پیش کردہ ترجمہ خود ان کی اپنی کاوش نہیں۔

زیرِ نظر مقالے کے آخر میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن جدید تکنیکوں کا ذکر کیا ہے جس کی مدد سے کسی بھی قلمی نسخے میں کی جانے والی ایک نقطے کی تحریف کی نشاندہی بھی ممکن ہے۔ اگر معین صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا دیوان غالب کا نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے سے الگ کوئی نسخہ ہے تو کیا وہ اس کے اس تکنیکی معائنے پر تیار ہیں؟

پیش نظر کتاب ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اس قسم کی علمی و تحقیقی کاوشیں اس اعتبار سے مفید ہوتی ہیں کہ ان سے نہ صرف تحریف اور جعل کا رستہ بند ہوجاتا ہے بلکہ اعلیٰ علمی تحقیق کے لیے نئے رستوں کے امکانات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ فاضل مصنف حافظ محمود شیرانی کی علمی روایت کے امین ہونے کے ناطے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ اپریل ۲۰۰۱ء۔ ص ۲۹ تا ۳۱)

☆

''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق''

رفاقت علی شاہد

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ۱۹۹۸ء میں ''دیوان غالب (اردو)'' کے ایک نادر مخطوطے کا عکس شائع کیا اور عقیدت کی بنا پر اسے معروف تعلیمی شخصیت خواجہ منظور حسین کے نام سے معنون کرتے ہوئے اسے ''نسخہ خواجہ'' کا نام دیا۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں بتایا کہ انھیں ''دیوانِ غالب'' کا یہ نادر مخطوطہ پرانی کتابیں بیچنے والے ایک کتاب فروش سے دستیاب ہوا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بڑے شد ومد سے لکھا کہ اس مخطوطے کی ترتیب میں ان کی عمر عزیز کے کئی قیمتی سال صرف ہوئے۔

زیر تبصرہ کتاب میں معین الرحمٰن صاحب کے ان دعووں کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ فاضل مصنف ڈاکٹر تحسین فراقی نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں معین الرحمٰن صاحب کے اس دعوے کے بارے میں تحقیقی و واقعاتی شواہد پیش کیے گئے ہیں کہ دیوان غالب کا مخطوطہ انھیں کسی کتاب فروش سے ملا تھا۔ تحسین فراقی صاحب نے ناقابل تردید ثبوت پیش کر دیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ''دیوانِ غالب'' کا مذکورہ مخطوطہ اصل میں پنجاب یونیورسٹی کا وہی گمشدہ مخطوطہ ہے جس کا تعارف قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کرا چکے ہیں۔ فاضل مصنف نے معین الرحمٰن صاحب کے دعووں کا تحقیقی و واقعاتی جائزہ لے کر اصل صورت حال کی وضاحت بہ صراحت کر دی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں ''دیوان غالب (نسخہ خواجہ)'' کے عملی پہلوؤں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ معین الرحمٰن صاحب نے دیوان غالب کے فارسی دیباچے کا اردو ترجمہ بھی کتاب میں شائع کیا ہے۔ فاضل مصنف نے بہ دلائل واضح کیا ہے کہ یہ ترجمہ معین صاحب کا زائیدہ فکر نہیں بلکہ معین صاحب فارسی سے اس حد تک واقف ہی نہیں کہ

فارسی سے اردو ترجمہ کرسکیں۔ مصنف کتاب نے دیباچہ دیوان غالب کے اردو ترجموں کی تفصیلات مہیا کر کے یہ واضح کیا ہے کہ معین صاحب نے مختلف ترجمے سامنے رکھ کر اپنا ترجمہ "وضع" کیا ہے۔

"دیوان غالب (نسخہ خواجہ)" کی تدوین سے متعلق بھی فاضل مصنف نے تحقیق کر کے بیسیوں متنی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان غلطیوں پر نظر کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "نسخہ خواجہ" کی خواندگی اور ترتیب میں کوئی خاص کاوش نہیں کی گئی اور معین صاحب کا یہ دعوا محل نظر ہے کہ اس کام میں ان کی عمر عزیز کے پندرہ سترہ سال صرف ہو گئے۔

کتاب کے آخر میں "نسخہ خواجہ"، "دیوان غالب" (نسخہ جامعہ پنجاب) متعارفہ سید عبداللہ اور "دیوانِ غالب" متعارفہ مولانا امتیاز علی عرشی کے چند صفحات کے عکس برائے موازنہ شامل کیے گئے ہیں۔ ان کا تعلق کتاب کے پہلے حصے سے ہے، یعنی "نسخہ خواجہ" کوئی الگ نسخہ نہیں بلکہ جامعہ پنجاب کا گمشدہ نسخہ ہی ہے۔ پیش کیے گئے عکسوں سے یہ بات بہ خوبی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ تینوں حضرات کے متعارفہ نسخوں کے متعلقہ اوراق کے عکس سے صاف نظر آ رہا ہے کہ تینوں میں سر مو فرق نہیں۔ اس کے علاوہ صفحہ ۲۲ سے کتب خانہ جامعہ پنجاب کے ایکسیشن نمبر کا چھیلا جانا، ور "تنوطے کے آخر میں کتب خانے کی مہر پر چیپی لگا کر اوپر "فتے دین، فتح دین" لکھنا اس امر کو تقویت پہنچا کر پایہ ثبوت تک پہنچا دیتے ہیں کہ "نسخہ خواجہ" اصل میں جامعہ پنجاب کا گمشدہ نسخہ ہی ہے۔ ایکسیشن نمبر کا چھیلنا اور مہر پر چیپی لگانا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ یہ سب کچھ جعل سازی سے مال مسروقہ کو اپنانے کے نقطہ نظر سے کیا گیا۔

فاضل مصنف (ڈاکٹر تحسین فراقی) نے اس چھوٹی سی کتاب میں بڑا معرکہ کیا ہے۔ ادب میں یوں تو جعل سازی کا چرچا اول سے رہا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اتنی ڈھٹائی کے ساتھ کسی نے جعل سازی نہیں کی ہو گی جیسی معین صاحب نے کی ہے۔ فاضل مصنف کا انداز تحریر سادہ اور موثر ہے۔ انھوں نے بڑی چابک دستی سے اپنے اعتراضات تحریر کیے ہیں کہ پوری کتاب میں کہیں ایک جملے میں بھی ذاتی عناد کا رنگ نظر نہیں آتا، جبکہ میرا موقف یہ ہے کہ اس طرح کے "ادبی دزدوں" کے خلاف سخت لہجے اور انداز میں بات کرنا غیر مناسب نہیں۔ اس نقطہ نظر سے فاضل مصنف نے اپنا ہاتھ بہت

ہلکا رکھا ہے۔

''ادب کی کساد بازاری'' کی اصطلاح ہمارے ہاں آج کل بہت مستعمل ہے۔ اس کی ایک وجہ اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے والے نام نہاد ادیب اور محقق بھی ہیں، جس کی ایک مثال فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کر دی ہے۔ حقیقت میں ڈاکٹر فراقی نے ادبی جہاد کیا ہے اور ایک ایسے جعل ساز اور سارق کے خلاف آواز اٹھائی ہے جس کی جھوٹی تعریف میں بڑے بڑے ادیب رطب اللسان تھے۔

یہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ارد گرد صرف انسان ہی نہیں ادبی ڈاکو بھی موجود ہیں، جو فریب نظر سے دوسروں کا اعتماد حاصل کر کے دندناتے پھر رہے ہیں۔ ان کے خلاف کلمہ حق کہنا اس وقت سب سے بڑا جہاد ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی اس کتاب کو پہلا پتھر سمجھنا چاہیے جو پرسکون پانی کی سطح پر ارتعاش پھیلا دیتا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ ادب کی بہتری اور فلاح کے لیے ایسے جہاد کرنے والے جاں باز منظر عام پر آئیں گے اور اپنی تحریروں سے جعلی ادیبوں کی نشاندہی کر کے ادب کی خدمت بجا لاتے رہیں گے۔

(روزنامہ ''دن'' لاہور۔ ۱۸ جولائی ۲۰۰۰ء)

☆

حصہ سوم : کالم

دیوان غالب ــــ نسخہ خواجہ یا نسخہ لاہور؟

ظفر اقبال

عزیز القدر اختر شمار نے اپنے پندرہ روزہ ''بجنگ آمد'' کے تازہ شمارے میں ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ کی مقبولیت'' کے عنوان سے جو خبر بنائی ہے، اس میں لکھا ہے کہ ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' کو ایک نایاب نسخے کے طور پر شائع کیا، اور بعد ازاں انھیں اس پر داد و تحسین سے نوازا گیا اور یہ تاثرات و مضامین کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے۔ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ۔ اصل حقائق'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں انھوں نے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو غلط ثابت کرتے ہوئے کہا کہ ''نسخۂ خواجہ'' غالب کا کوئی نیا نسخہ نہیں ہے بلکہ یہ ''نسخہ لاہور'' ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر معین الرحمٰن پر دیگر کئی الزامات لگائے اور ان کی تفصیلات درج کیں جس کے جواب میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے کتابچے ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ۔ صحیح صورت حال'' میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے تمام الزامات کو رد کر دیا،[1] اور تفصیل سے اپنی صفائی پیش کی۔ یہ سلسلہ تا حال ختم نہیں ہوا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر معین الرحمٰن کے جواب میں پھر جواب لکھ رہے ہیں جو ان کے کتابچہ میں شائع ہو رہا ہے۔ دیکھیے! وہ کیا موقف اختیار کرتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں نسخہ خواجہ بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ کئی حلقے اس فساد پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں، تاہم اس سے ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ'' کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، اور، لوگ ''نسخہ خواجہ'' خرید کر دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔

۱۔ یہ لکھنا درست نہیں کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے تمام الزامات کو رد کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب ہذا میں شامل ڈاکٹر عارف ثاقب کا کتابچہ جس میں تقابلی موازنے کے ذریعے واضح کر دیا گیا ہے کہ معین صاحب، تحسین صاحب کے کسی اعتراض کا بھی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ (ر ع ش)

اس شمارے کے اسی صفحے پر ممتاز نقاد، اور ماہر تعلیم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ایک بیان میں کہا ہے کہ نسخہ خواجہ کے حوالے سے فساد برپا نہ کیا جائے۔ جوابی تحریروں کا سلسلہ بند ہونا چاہیے، ورنہ ''برہان قاطع'' والی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے قلم سے محاکے میں بعض تلخ جملے نکل گئے تھے۔ معین الرحمٰن صاحب کے جواب میں بھی تلخ جملے موجود ہیں۔ نسخہ خواجہ کی اصل کہانی کیا ہے؟ اس پر غیر جذباتی انداز میں اظہار رائے کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ اس نسخے کو معین صاحب نے کہاں سے حاصل کیا، تاہم میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ نسخہ اتنا اہم نہیں ہے کہ اس پر فساد برپا کیا جائے۔ معین صاحب اسے اپنے ذخیرۂ غالبیات کا سب سے قیمتی موتی قرار دیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ محقق کو اتنا تو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے مال کی قدر و قیمت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے لیکن ''نسخہ خواجہ'' سے غالب فہمی میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوتا ہے۔ اگر بالفرض دس بارہ مقامات پر غالب نے اس پر قلم لگا ہی دیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے کوئی حقیقی متنی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ میری معین صاحب اور تحسین صاحب دونوں سے گزارش ہے کہ وہ اب جوابی تحریروں کا سلسلہ ترک کر دیں کہ کہیں ''برہان قاطع'' والی صورت حال نہ پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے، اس سے کسی کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔ البتہ ادیب، اور وابستگان ادب بدنام ہوتے ہیں جن کے بارے میں تصور پہلے ہی زیادہ خوش گوار نہیں ہے۔

ماشاء اللہ! یہ چوتھے خواجہ ہیں جو اس سلسلے سے متعلق ہوئے ہیں۔ ایک تو خواجہ منظور حسین مرحوم، جن کے نام نامی سے یہ نسخہ موسوم ہوا، دوسرے خواجہ معین الرحمٰن، تیسرے ہمارے محبوب طناز اور محقق مشفق خواجہ، اور اب چوتھے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ موخرالذکر کا موقف خاصا مصالحانہ، متین اور مشفقانہ ہے۔ اس سے پہلے، جیسا کہ انھوں نے ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ بھی اس موضوع پر کافی گرد اڑائی جا چکی ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں، کہ ڈاکٹر اجمل نیازی نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بارے میں کہا، مشفق خواجہ نے لطیف الزماں کے متعلق کیا فقرہ چست کیا، اور لطیف الزماں نے مشفق خواجہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا کہ یہ سب کچھ ناصر زیدی نے اپنے کالم

''باد شمال'' میں تفصیل کے ساتھ درج کر دیا ہے (بحوالہ روزنامہ ''پاکستان'' مورخہ ۱۵ جولائی سنہ دو ہزار) (۲) اس لیے بات جب تک کسی منطقی نتیجے تک نہ پہنچے، جسے دونوں فریق پہنچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں، اس وقت تک ''سیز فائر'' کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا صاف مطلب ہو گا کہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی ہار مان لی ہے، اور ان کا موقف اور تحقیق دونوں غلط تھے۔

ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کی ایک بات بطور خاص قابل غور ہے، یعنی انھوں نے جو کہا ہے کہ میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ اس نسخے کو معین صاحب نے کہاں سے حاصل کیا--- اور جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ خواجہ زکریا صاحب کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ معین صاحب نے یہ نسخہ کہاں سے حاصل کیا، لیکن وہ کسی وجہ سے، یا کسی مصلحت کی بنا پر اس کا اظہار کرنہیں رہے، ورنہ وہ صاف کہہ سکتے تھے کہ انھیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ یہ نسخہ معین صاحب نے کہاں سے حاصل کیا ہے۔ علاوہ ازیں، اس مصلحت یا پردہ پوشی کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس بارے خواجہ زکریا صاحب کا علم معین صاحب کے خلاف جاتا ہے، ورنہ وہ اس کا برملا اظہار کر دیتے کیونکہ یہی تو اصل بنائے فساد ہے کہ معین صاحب نے یہ نسخہ حاصل کہاں سے کیا ہے۔ معین صاحب کہتے ہیں کہ انھیں یہ ایک فٹ پاتھیے کباڑی سے حاصل ہوا ہے جبکہ ڈاکٹر تحسین فراقی کا موقف ہے کہ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت ہے جو وہاں سے چرایا گیا، یا خلاف ضابطہ کسی صاحب (ان کا نام بھی فراقی صاحب نے بتایا ہے) نے اپنے نام سے جاری کروایا اور پھر لائبریری کو واپس نہیں کیا، جہاں سے یہ معین صاحب کے ہاتھ لگ گیا، جبکہ معین صاحب نے اس کباڑیے کا نام پتا ابھی تک اخفا میں رکھا ہوا ہے جو کہ معین صاحب کا سب سے معتبر گواہ صفائی ہو سکتا تھا، لیکن معین صاحب نے ابھی تک اسے اپنی حمایت میں پیش نہیں کیا۔

خواجہ زکریا صاحب نے یہ کہہ کر اگرچہ اس نسخے کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی

۱۔ لطیف الزمان خاں کے حوالے سے جس خط کو ناصر زیدی نے اپنے کالم میں حوالہ بنایا، وہ گمنام خط تھا جسے ایک سازش کے تحت خاں صاحب کے خلاف استعمال کیا گیا۔ خاں صاحب نے ناصر زیدی صاحب کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے پر مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ (مرتب)

ہے کہ اس پر غالب نے اگر دس بارہ بار قلم لگا بھی لیا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، لیکن اس کے باوجود اس نسخے کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اس تناظر میں کہ اس کے مال مسروقہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اس (نسخۂ خواجہ) کی تحسین میں ایک مضمون لکھ کر کہیں شائع کرایا تو پروفیسر لطیفؔ الزماں نے انھیں فون کر کے پوچھا کہ کیا انھیں علم نہیں تھا کہ یہ نسخہ مال مسروقہ ہے اور یہ کہ معین صاحب کا دعویٰ اس بارے سراسر غلط ہے، تو ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ ہاں مجھے معلوم تھا؟ اس پر پروفیسر لطیف الزماں نے ان سے پوچھا پھر اس کے باوجود آپ نے اس پر تعریفی مضمون کیوں لکھا؟ جس پر مبینہ طور پر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے یہ کہا، وہ آ کر بیٹھ ہی گیا تھا، تو میں کیا کرتا؟ **واللہ اعلم بالصواب.**

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے موقف کی تائید میں جو سب سے وزنی دلیل دی ہے، وہ یہ ہے کہ لائبریریوں کے ضابطے کے مطابق لائبریری کی ہر کتاب کا ایک خفیہ صفحہ بھی ہوتا ہے جو کہ ایک مخصوص صفحہ اور مہر شدہ ہوتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا بھی ایک مخصوص صفحہ ہے جو کہ لائبریری کی ہر کتاب کے لیے مشروط اور مخصوص ہے۔ چنانچہ احتیاطی طور پر اس خاص صفحے، جس کا نمبر ۲۲ ہے، سے وہ مہر کھرچ لی گئی ہے تاکہ یہ لائبریری کی کتاب ثابت نہ ہو سکے۔ اس بات کا معین صاحب نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا، اور اس حساب سے سارا مُدّہ اس وقت تک انھی کے خلاف جاتا ہے جب تک کہ مذکورہ کباڑیا اس کی فروخت کی تصدیق نہ کرے، حالانکہ ایسے نایاب نسخے کا کسی کباڑیے تک پہنچنا بجائے خود ایک 'بہت بڑا سوال ہے' جس کا جواب بھی خود معین صاحب ہی پر واجب ہے۔

چنانچہ اس مسئلے کا کٹی کٹا نکالنے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ اس نسخے کی پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہو جانے کا پرچہ درج کرا دیا جائے اور الزام بے شک کسی پر نہ لگایا جائے، البتہ اس شبہے کا اظہار ضرور کر دیا جائے کہ یہ نسخہ وہی ہو سکتا ہے جو ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پاس موجود ہے۔ اگر لائبریری مذکورہ کا کوئی افسر مصلحتاً یہ پرچہ درج کرانے میں متامل بھی ہو تو فوجداری پرچہ کسی کی بھی طرف سے درج ہو سکتا ہے، جسے اس وقوعے کا تھوڑا سا بھی علم ہو۔ اس طرح دوران تفتیش دونوں فریقوں کو اپنا اپنا موقف

ثابت کرانے کا وافر موقع حاصل ہو سکتا ہے اور ایک اہم مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو سکے گا۔ ویسے عزیزی ناصر زیدی کی یہ بات یقیناً قابل غور ہے کہ ''اگر ذرا سی دیر کو فرض کر لیا جائے کہ ان کا دریافت کردہ ''نسخہ خواجہ'' وہی مخطوطہ ہے جو کبھی پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ تھا، اور وہاں سے غائب ہوگیا، پھر بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اسے انتہائی خوبصورت انداز میں لاکھوں روپے صرف کر کے اپنے حقیقی حواشی کے ساتھ چھاپ کر غالب دوستوں پر احسان کیا ہے۔'' اگر ڈاکٹر معین الرحمٰن خود بھی اپنے طرفدار کے اس موقف کی طرف آجائیں تو یہ جھگڑا پھر بھی ختم ہو سکتا ہے۔

(ظفر اقبال ''مکالمہ''۔ ہفت روزہ ''زندگی''، لاہور۔ ۲۷ اگست تا ۲ ستمبر ۲۰۰۰ء۔ ص ۵۵، ۵۶)

☆

دیوان غالب نسخہ خواجہ، اصل حقائق

اشرف بخاری

ڈاکٹر تحسین فراقی نے محقق اور نقاد کی حیثیت سے ایک بہت ہی مختصر مدت میں شہرت کی منزلیں بہت سرعت سے طے کی ہیں۔ انھیں اللہ نے علمی اور تحقیقی مزاج عطا کر رکھا ہے۔ اپنے عام معاصر اساتذہ کی طرح یک فنے، یک رخے نہیں بلکہ ان کے علم و ذوق کی دلچسپیوں کا سلسلہ کافی پھیلا ہوا ہے۔ اس وسعت علمی نے ان کی تحقیق و تنقید کو گہرائی اور اسلوب کی طرح داری بھی بخشی ہے اور توازن، سنجیدگی اور نکتہ آفرینی جیسی صفات بھی۔ ان کے جتنے بھی علمی کام اب تک منظر عام پر آئے ہیں، ان کے اسی رچے ہوئے مذاق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اب کے انھوں نے علمی دنیا کو تحقیق و تدقیق کا ایک اور تحفہ کتابی صورت میں پیش کیا ہے جسے ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' کا نام دیا گیا ہے۔ ان کی زیر نظر تالیف یوں تو تحقیق کے کڑے سے کڑے معیار پر پوری اترتی ہے اور ہم سب کی داد کی مستحق ہے لیکن ایک خاصا ہنگامہ آرا پس منظر بھی رکھتی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ہوا یوں کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کو دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ، بقول ان کے، ۱۹۸۱ء میں پرانی کتابوں کے کسی کاروباری سے ہاتھ لگا جس کی ترتیب و تدوین پر انھوں نے عمر عزیز کے سترہ سال صرف کر دیے اور روز و شب کی ''جگر کاوی، دیدہ ریزی اور محنت شاقہ'' کے بعد اسے ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ'' کے نام سے ۱۹۹۸ء کے اواخر میں لاہور سے شائع کر دیا۔ ''نسخہ خواجہ'' اسے اس لیے کہا گیا کہ اسے گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبیات انگریزی کے استاد اور مشہور علمی شخصیت مرحوم خواجہ منظور حسین کے نام معنون کیا گیا ہے۔ (ہمارے مرحوم دوست مظفر علی سید گورنمنٹ کالج لاہور میں خواجہ صاحب کے چہیتے شاگرد رہے تھے۔ ہم نے انھیں ہمیشہ اپنے اس باکمال استاد کی تعریف میں رطب اللسان پایا) اس نسخے کا چھپنا تھا کہ لاہور کی علمی فضاؤں میں ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ پہلے پہل تو اہل علم ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اس دعوے کی صحت کے بارے میں قدرے تذبذب میں

رہے اور شک و شبہے کی مدھم مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں لیکن آہستہ آہستہ وہ منزل آ گئی کہ شکوک و شبہات کی یہ لے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ رمز شناسان فن کی اکثریت نے فتویٰ دے ڈالا کہ ''نسخۂ خواجہ'' ڈاکٹر معین الرحمٰن کی دریافت قطعاً نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی کا گم شدہ یا چرایا ہوا مال ہے جس کا تعارف پہلے پہل ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''ماہ نو'' کراچی کے جولائی ۱۹۵۴ء کے شمارے میں کرایا اور پھر مولانا امتیاز علی خان عرشی نے اپنے ''دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی'' میں اسے ''نسخۂ لاہور'' کے نام سے یاد کیا اور لوگوں کی طرح ڈاکٹر تحسین فراقی کو بھی معین الرحمٰن صاحب کا دعویٰ باطل نظر آیا۔ انھوں نے ٹھان لی کہ اس نوع کی ادبی سرقہ بازی کا پول کھولنا ضروری ہے۔ فی الواقع علمی سرقے کی اس قدر کھلم کھلا واردات شدید بددیانتی ہی نہیں، علم اور اہل علم کی توہین اور سبکی بھی ہے۔ اگر اس قماش کی کارستانیوں پر گرفت نہ کی جائے تو دنیائے علم و ادب، فکری افلاس اور انار کی کا شکار ہونے لگے۔ ہم چاہتے ہیں قارئین پہلے نسخۂ خواجہ کے بارے میں تحسین فراقی صاحب کے تمہیدی کلمات پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ معاملہ کی نوعیت کیا ہے۔

> ''۱۹۹۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ مرتب و مدون کر کے اسے ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس نسخے کو انھوں نے اپنے ذخیرہ غالبیات کی پیش قیمت متاع قرار دیا ہے۔ یہ قلمی نسخہ مع ایک اور قلمی نسخے اور چند مطبوعہ نادر کتابوں کے، انھیں پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے ملا۔ بڑے مثالی اہتمام اور کاوش کے ساتھ تیار ہونے والا یہ قلمی نسخہ، بقول سید معین الرحمٰن، غالب ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد خان یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گوہر گم گشتہ ہو۔ دلچسپ بات ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے قلمی نسخے کا تعارف کراتے ہوئے چوالیس برس پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اسے ضیاء الدین احمد خان یا کسی شہزادے کے لٹے ہوئے خزانے کا در بے بہا قرار دیا تھا۔ میری رائے یہ ہے کہ معین الرحمٰن صاحب کا پیش کردہ یہ گوہر گم گشتہ اور سید عبداللہ کا نشان کردہ یہ در بے بہا کوئی الگ الگ دو موتی نہیں بلکہ ۱۸۵۲ء کے نصف اول کے کلام غالب کا حامل وہی ''در یتیم'' ہے جسے آخری حادثہ دہلی کی راج دہانی کے بجائے لاہور کے صوبائی دارالحکومت میں پیش آیا اور یوں یہ لٹ پٹ کر

موجودہ تدوین کار تک پہنچا۔ اس ضمن میں شواہد کی تفصیل ذرا آگے چل کر پیش کی جاتی ہے۔"

ہم معذرت خواہ ہیں کہ اقتباس قدرے طویل ہو گیا لیکن اس کے بغیر معاملہ سمجھ میں نہ آتا۔ چنانچہ اب ڈاکٹر صاحب کے قلم سے جو ان شواہد کی تفصیل نکلی ہے تو کتاب کے پورے ساٹھ صفحات پر پھیلتی چلی گئی۔ معین الرحمٰن کی تردید میں انھوں نے عقلی و نقلی دلائل کا انبار لگا دیا۔ کوئی دعویٰ ایسا نہیں کیا جس کا ثبوت پیش نہ کیا ہو۔ ان کے دلائل فی الواقع براہین قاطع کا حکم رکھتے ہیں جنھیں کوئی منصف مزاج شخص مانے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بات صرف یہیں تک محدود نہیں کہ تحسین فراقی صاحب نے معین صاحب کے دعوائے باطل کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے ہیں بلکہ اس "ابطال باطل" کے ساتھ ساتھ ان کے علم و فضل کا بھانڈا بھی بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا ہے، جس کی تفصیل کتاب ہی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس سارے قصے میں ہمیں تحسین فراقی صاحب سے ایک شکوہ پیدا ہوا جس کا تعلق کتاب کے صفحہ ۲۱ پر مندرج عبارت سے ہے۔ بچارے معین الرحمٰن صاحب سے کچھ سرقوں کا ارتکاب ہو گیا۔ فراقی صاحب نے اس بنیاد پر روایوں جمایا: "آخر جو شخص رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر اسے چھپوا سکتا ہو (دیکھیے "جدید اردو غزل" ۱۹۸۷ء کا بیک ٹائٹل)، جو شخص پرتھوری چندر کی "جاگیر غالب" اپنے نام سے شائع کر سکتا ہو (دیکھیے "سورج" کا غالب نمبر ۱۹۹۶ء)، جو شخص اپنی ایم اے اردو کی شاگرد بشریٰ باسط کے مقالے "ادا جعفری شخصیت اور شاعری" (۱۹۹۱ء) کا بیشتر حصہ اپنے نام سے "نقوش" میں چھپوا سکتا ہو (دیکھیے "نقوش" شمارہ ۱۳۹، صفحہ ۶۶۳ تا ۷۳۹) اور اسی قبیل کے دیگر کئی افسوسناک کام کر سکتا ہو۔ اس سے بعید نہیں کہ زندگی کے کسی کمزور لمحے میں اس سے یہ ترامیم بھی سرزد ہو گئی ہوں۔ بس خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم والا معاملہ ہے، معاملہ نہیں المیہ ہے۔"

ہماری گزارش یہ ہے کہ بچارے ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب سے پہلے جب نیاز فتح پوری، مولانا اسلم جیراجپوری، کرشن چندر، غلام جیلانی برق، پروفیسر وقار عظیم، غلام احمد پرویز وغیرہ ہم جیسے اکابر بھی دن دیہاڑے سرقہ بازی میں ملوث رہ چکے ہوں تو ایسے ایسے اساطین کے مقابلے میں اس "گیاہ ضعیف" کو تو بخش ہی دینا چاہیے تاکہ وہ پلٹ کر یہ تو نہ کہہ سکے کہ "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

تحسین فراقی صاحب نے اپنی اس تحقیقی کاوش میں کتاب کی جن اغلاط اور مرتب کی جن کوتاہیوں کا جائزہ لیا ہے، ناشر نے ان کا خلاصہ کتاب کے بیک ٹائٹل پر چھاپ دیا ہے، ان میں سے کچھ نکات نذر قارئین ہیں:

☆ ''دیوان غالب کا نسخہ خواجہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا گم شدہ، مسروقہ نسخہ ہے۔''

☆ ''نسخہ خواجہ کے مرتب ڈاکٹر معین الرحمٰن تحریف اور دوسروں کے علمی کام اپنے نام سے چھپوانے میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔''

☆ ''ڈاکٹر صاحب سے بعید نہیں کہ دیوان غالب کے اس نسخہ میں انھوں نے چند معمولی ترمیمیں کر کے اسے الگ نسخہ ثابت کرنا چاہا ہو۔''

☆ ''دیوان کے اس نسخہ میں تدوین اور ترجمے کی غلطیاں ایک سو سے زائد ہیں۔''

تحقیقی نثر بالعموم یبوست کی حدود چھوتی نظر آتی ہے لیکن مسرت ہوئی کہ تحسین فراقی صاحب نے شگفتہ نثر لکھی ہے اور اس میں ''ان اساتذہ کی نگار بندی کے باوجود کہیں کہیں ''درد حنا'' کی میلی آنکھ اپنے بے میل وجود کے ساتھ قاری کی پریشانی خاطر کا موجب بھی بنتی ہے۔'' جیسے مرصع اور سجے سجائے جملے بھی ملتے ہیں اور بڑی بات تو یہ ہے کہ بحث و جدل اور الزامات و طنزیات کے وفور کے باوصف کتاب پایہ ثقاہت سے نہیں گرنے پائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گفتہ غالب یہاں بھی ڈاکٹر تحسین فراقی کے پیش نظر رہا:

پیمانہ برآں رند حرام است کہ غالب
در بے خودی اندازۂ گفتار نداند

(اشرف بخاری، ''قندو نمک۔'' روزنامہ ''مشرق''، پشاور۔ ۱۸ فروری ۲۰۰۱ء)

☆

دیوان غالب -- نسخہ خواجہ کا تنازع

ڈاکٹر مشرف احمد

دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمٰن نے برسوں پہلے لاہور کے فٹ پاتھ سے پرانی کتابیں فروخت کرنے والے سے خریدا تھا۔ بقول خود انھوں نے زندگی اور صحت کو آنی جانی چیز سمجھتے ہوئے پندرہ برسوں تک شب و روز اس دیوان کی تدوین میں صرف کیے اور ایک جانب اصل کا عکس اور دوسری جانب جدید املا میں متن دے کر نہایت خوب صورت انداز میں اسے شائع کیا۔ اس نسخے کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بعدازاں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ انگریزی کے استاد پروفیسر خواجہ منظور حسین سے منسوب کرتے ہوئے اسے ''نسخہ خواجہ'' کا نام دیا۔

ایک سو بائیس برس پرانے اس نسخے کی دریافت اور اس کی اشاعت، جو مرزا غالب کی نظر سے گزر چکا تھا اور جس پر کہیں کہیں ان کے ہاتھ کی تصحیح ہے، ایسا عظیم الشان کارنامہ تھا جس پر ڈاکٹر معین الرحمٰن کو داد و شاباش ملی اور برصغیر کے ممتاز محققوں، ادب دوستوں اور غالب شناسوں نے اس کا خیر مقدم کیا، لیکن اس کی اشاعت کے کچھ مدت بعد اس قلمی نسخے کے بارے میں اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اردو کے استاد پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی نے جو اعتراضات کیے اور اپنے کتابچے میں تین ناقابل تردید حقائق پر سے پردہ اٹھایا، وہ ان دنوں غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی اسے اپنے ممتاز معاصر کی دریافت ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کے بقول یہ وہی نسخہ ہے جو کبھی پنجاب یونیورسٹی کی ملکیت تھا اور اب گم ہو چکا ہے۔ اس قلمی نسخے کے بارے میں ایک مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا جو جولائی ۱۹۵۴ء کے ماہنامہ ''ماہ نو'' میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں ڈاکٹر عبداللہ نے دو صفحات

کا عکس بھی شائع کیا تھا۔ بعدازاں اسے مشہور غالب شناس مولانا امتیاز علی عرشی نے مرتب کیا۔ا معروف محقق قاضی عبدالودود ۱۹۵۷ء میں جب پاکستان تشریف لائے تھے تو اس قلمی دیوان غالب کا ایک روٹو گراف لے گئے تھے، جو اب رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''نسخہ خواجہ'' اور ''دیوان غالب'' کے اس نسخے کے دوسرے عکس پیش کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن اور باقی دوسرے حضرات کے نسخے ایک ہی ہیں اور ان میں سرمو فرق نہیں ہے۔

اس کالم میں ان تمام علمی و ادبی مباحث کو اٹھانے کا موقع محل نہیں ہے۔ اپنے دعوے کی تائید میں ڈاکٹر فراقی نے مشہور مخطوطہ شناس خلیل الرحمٰن داؤدی کی رائے پیش کی ہے جو ''نسخہ خواجہ'' کو پنجاب یونیورسٹی کا گم شدہ مخطوطہ بتاتے ہیں۔ ان تمام اعتراضات کے جوابات محترم ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے کتابچے ''دیوان غالب۔ صحیح صورت حال'' میں دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے اس کارنامے کو اپنی زندگی کے علمی و ادبی کاموں کا حاصل سمجھتے ہیں اور اس پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ خدا کرے وہ اپنے اس کارنامے پر حشر کے دن مرزا غالب کے سامنے بھی سرخرو ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دفاع میں لکھے ہوئے کتابچے میں برصغیر کے ممتاز اسکالروں، محققوں اور غالب شناسوں کے خطوط کے اقتباسات بھی دیے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ ان حضرات کے خطوط مکمل صورت میں شائع کرتے۔ مثلاً انھوں نے ممتاز محقق رشید حسن خان کے خط کا اقتباس شائع کیا ہے لیکن ڈاکٹر تحسین فراقی نے رشید حسن خاں کا یہ فقرہ اپنے کتابچے میں پیش کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا۔''

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے کتابچے میں اس دیوان کو خواجہ منظور حسین سے منسوب کرنے پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے خواجہ صاحب کی روح کو تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس کا جذباتی جواب ڈاکٹر معین الرحمٰن نے یہ دیا ہے کہ کاش معترض ایسا تکلیف دہ جواب اپنی اولاد سے سنیں۔ اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو مردہ بہ دست زندہ والا معاملہ ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا ایک علمی اعتراض یہ ہے کہ جو شخص شعر موزوں نہ پڑھ سکتا ہو، اسے کسی دیوان کو مرتب کرنے کا حق نہیں ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن

نہ شعر موزوں پڑھ سکتے ہیں نہ درست انداز میں اسے نقل کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کے سخت گیر معترض بے جا اعتراض کر رہے ہیں۔ بہت سے شعرا اپنا کہا ہوا شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے جب کہ ڈاکٹر صاحب تو صرف نثر نگار ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے ادبی پیرو مرشد اور اردو ادب کے پیر طناز رشید احمد صدیقی کا ایک اقتباس نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ رشید صاحب بھی شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی معیار نہیں ہے۔ رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین یا علمی، ہر جگہ آپ کو موزوں اشعار ملیں گے۔ رشید صاحب کے بیسوں شاگردوں کو ہم جانتے ہیں، کسی نے آج تک ان میں یہ عیب نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے رشید صاحب نے یہ بات بطور تفنن کے کبھی کہی ہو، جسے ناموزوں طبع افراد نے گرہ میں باندھ لیا ہو۔ کراچی میں علی گڑھ کے ایک ان پڑھ شاعر استاد عمر فاروقی رہا کرتے تھے۔ انھوں نے مشہور داستان ''کلیلہ ودمنہ'' کا نام سنا اور ایک دن رشید صاحب سے جا کر پوچھا کہ ''کلیلہ دومنہ'' کا کیا ہوتا ہے؟ رشید صاحب نے کہا کہ حاضرین محفل آ جائیں تو اس کے معنی بتاؤں گا۔ اس کے بعد وہ اکثر اس داستان کو ''کلیلہ دومنہ'' کا ہی کہا کرتے تھے۔ اب اگر ان کا کوئی شاگرد یہ کہے کہ اس کا درست نام وہی ہے جو رشید صاحب بتایا کرتے تھے تو اس سے شاگرد کی عقیدت مندی تو ظاہر ہو گی مگر نام غلط ہی رہے گا۔ خواجہ منظور حسین نے کلاسیکی روسی افسانوں کے اردو میں تراجم کیے تھے۔ اس کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ تراجم انھوں نے اردو زبان میں اپنی مشق اور استعداد بڑھانے کی غرض سے کیے ہیں۔ کیا آج کوئی کج فہم شخص ان کے انکسار کو یہ معنی پہنا سکتا ہے کہ انھیں اردو نہیں آتی تھی؟

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے مخالفتوں اور معترضوں کو معاف کرنے اور اعلیٰ ظرفی اختیار کرنے کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے اقتباسات نقل کیے ہیں مگر خود ان کا یہ حال ہے کہ ایک خالص علمی بحث میں وہ آپے سے باہر ہو گئے ہیں اور اپنے معترض کا پورا نام لینا بھی انھیں ناگوار ہے اور اگر بہ امر مجبوری نام لکھتے بھی ہیں تو اس کے ساتھ ہر جگہ ت۔ ف بھی لکھتے ہیں۔

''نسخہ خواجہ'' کے مرتب کی ایک تصویر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ساتھ کھنچی ہوئی

ہے۔ ان کے معترض کا کہنا ہے کہ رشید صاحب کبھی پاکستان نہیں آئے اور ڈاکٹر صاحب کبھی ہندوستان نہیں گئے، پھر یہ تصویر کس طرح کھینچی۔ ان کا جواب ڈاکٹر صاحب نے یہ دیا ہے کہ رشید صاحب سے غیر معمولی عقیدت و محبت کو دیکھتے ہوئے ان کے ایک عزیز نے دونوں کی تصویریں ساتھ رکھ کر ایک نئی تصویر بنا دی۔ رشید صاحب اپنے خطوط کے بارے میں ہمیشہ بڑے فکر مند رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بہترین خطوط وہ ہیں جنھیں ضائع کر دیا جائے۔ اگر انھیں اپنی تصویر کے حوالے سے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا تو شاید وہ کبھی اپنی کوئی تصویر نہ کھنچواتے۔

نسخہ خواجہ کی عبارتوں اور فارسی سے کیے جانے والے اردو ترجمے کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مرتب کو فارسی نہیں آتی۔ اس کا جواب ڈاکٹر معین الرحمٰن نے یہ دیا ہے کہ "ہماری یونیورسٹی میں ایم۔اے۔ اردو میں فارسی کا ایک پرچہ تھا۔" انھوں نے اس سلسلے میں کراچی یونیورسٹی کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا۔ کراچی یونیورسٹی میں فارسی زبان کے پرچے میں حافظ و سعدی کی دس دس غزلیں اور گلستان سعدی کی کچھ حکایتیں شامل تھیں جنھیں طالب علم اردو زبان کے ذریعے پڑھتا تھا، اور فارسی کے بنیادی قواعد بھی اس پرچے میں پڑھائے جاتے تھے لیکن اس سے طالب علم میں فارسی زبان کا ذوق پیدا نہیں ہوتا تھا اور بغیر فارسی جانے ہی اکثر طلبہ اس پرچے میں اچھے نمبر لے آتے تھے۔ اس کو اکثر طلبہ بھرتی کا پرچہ کہا کرتے تھے۔

"دیوان غالب، نسخۂ خواجہ" کو پنجاب یونیورسٹی کا گم شدہ نسخہ ثابت کرنے کے لیے ایک دلیل ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ دی ہے کہ دنیا کا ہر اہم کتب خانہ اپنی کتابوں پر ایک مخصوص کوڈ نمبر ڈالتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی اپنی کتابوں اور قلمی نسخوں کے صفحہ ۲۲ پر کوڈ نمبر تحریر کرتی ہے "نسخۂ خواجہ" کے اس صفحے پر کھرچنے کا نشان عکس میں واضح ہے جب کہ اس کی پشت کا صفحہ عکس میں محفوظ ہے۔

اس ادبی تنازعے سے پہلے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مخالفوں نے، جو شاید ان کی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں، یہ اعتراض کیا تھا کہ انھوں نے ایم۔ اے۔ اردو کی اپنی ایک طالبہ کے مقالے کو، جو اس نے ادا جعفری پر لکھا تھا اپنے نام سے "نقوش" میں چھپوا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے زیر تذکرہ کتابچے میں اس صورت حال پر سے پردہ اٹھایا ہے۔

انسانی ہمدردی اور طالبہ کی والدہ کے موت و زیست کی کش مکش کی وجہ سے ان کے بقول انھوں نے ادا جعفری پر اپنے غیر مطبوعہ مقالے سے استفادے کی طالبہ کو اجازت دے دی تھی۔ اخلاقی اور قانونی نقطۂ نظر سے یہ بات کتنی ہی قابل اعتراض ہو لیکن اس انسانی ہمدردی پر وہ لائق تعظیم ہیں۔ خیرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دوسرے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہو۔ اگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کی یہ خیرات دے ہی دی تھی تو اس کے اظہار اور اسے واپس اپنی جیب میں ڈالنے کا کیا جواز ہے؟ اس طرح تو انھوں نے اپنی طالبہ کے بہ حیثیت مصنفہ مستقبل کو تاریک اور مشکوک بنا دیا ہے۔

(ڈاکٹر مشرف احمد۔ ''با ادب۔'' روزنامہ ''ایکسپریس'' کراچی۔ ۸ جون ۲۰۰۰ء)

☆

لے مولانا عرشی نے اس نسخے کو مرتب نہیں کیا بلکہ اس کا تعارف اپنے مدونہ ''دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی'' میں ''نسخۂ لاہور'' کے نام سے کرایا ہے۔ (ج، ب)

مرزا غالب مغلوب اور جنرل ارشد محمود

ڈاکٹر اجمل نیازی

پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے مرزا غالب کے حوالے سے ایک مخطوطہ چوری ہو گیا۔ اس وقت کے وائس چانسلر نے کچھ نہ کیا۔ اب وہی مخطوطہ تحقیق کو نقالی کا درجہ دینے والے ایک حد درجہ نالائق پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ایک اور نام سے اپنی ریسرچ کا معرکہ بنا کے شائع کرا دیا ہے۔ ''نسخۂ لاہور'' اب ''نسخہ خواجہ'' ہے۔ اس حوالے سے خواجہ زکریا بہت خوش ہیں اور معین الرحمٰن کا معاون بن کر جی رہے ہیں۔ اس پر بہادر اور سچے محقق استاد ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک تحقیقی کتابچہ لکھا ہے جو اہل علم کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔ ملتان سے محترم لطیف الزمان خان نے واویلا کیا۔ وہ اس سے پہلے بھی غالب کے حوالے سے اس طرح کی چوریوں کے عادی مجرموں کا چرچا کرتے رہتے ہیں۔ شاعری کی چوری کا تو سنا تھا۔ اب تو پورا شاعر چرا لیا گیا ہے۔ اتنا ناجائز فائدہ جعلی ماہرین اقبال نے نہ اٹھایا ہو گا جو اس نقلی ماہر غالب نے اٹھا لیا ہے۔

خان صاحب کے پاس غالبیات کی تحقیقات اور ادبیات پر مبنی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ وہ مرزا غالب کے بڑے عاشق ہیں اور اس میدان کے رقیبوں کے دشمن ہیں۔ وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کو غالب کا سب سے بڑا دوست نما دشمن قرار دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر خالد آفتاب ساری صورت حال سے آگاہ ہیں۔ ان کے ذمے اس عظیم ادارے کی روایات اور مقام کی حفاظت ہے۔ انھیں خبر ہے کہ گورنمنٹ کالج کو برباد کرنے اور بدنام کرنے میں معین الرحمٰن کا غالب حصہ ہے۔ یہاں غالب کے کئی معنی مراد ہیں۔

پچھلے دنوں لطیف الزمان خان لاہور آئے اور اردو ادبیات کے قابل فخر جواں ہمت پروفیسر ڈاکٹر عارف ثاقب کے ہاں مہمان رہے۔ عارف ثاقب گورنمنٹ کالج کے

شعبہ اردو میں تھے۔ ڈائریکٹ ایسوسی ایٹ پروفیسر سلیکٹ ہو کر مرے کالج سیالکوٹ میں صدر شعبہ ہیں۔ وہ بہت لائق اور مخلص انسان ہیں۔ اس لیے معین الرحمٰن نے انھیں گورنمنٹ کالج میں ٹھہرنے نہیں دیا۔ اس سے پہلے بھی بہت قابل اور محترم پروفیسر ایک ایک شعبہ چھوڑ کر چلتے گئے ہیں۔ اب وہاں الو بولتے ہیں۔ ایک بھی قابل ذکر شخص وہاں نہیں۔ پچھلے سال ایم اے اردو میں کل پانچ چھ طالبات نے داخلہ لینا پسند کیا۔ پسندیدگی اور مجبوری ایک چیز بن گئی۔ کچھ خواہش مند لڑکوں کو معین نے داخلہ نہیں دیا۔ اب یہ شعبہ صرف گرلز کے لیے مخصوص ہو جائے گا۔ اردو تحقیق کے علاوہ معین نے اردو تدریس کو بھی بہت نقصان پہنچایا ہے۔ گورنمنٹ کالج کی ایک طالبہ بشریٰ باسط کا ایم اے کا مقالہ معین الرحمٰن نے اپنے نام سے چھپوا دیا ہے جبکہ وہ ریکارڈ پر موجود ہے اور اس پر ڈگری ایوارڈ ہو چکی ہے۔ یہ ایک بھیانک فراڈ ہے جس پر ڈاکٹر خالد آفتاب اور جنرل ارشد محمود کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے۔ جنرل ارشد محمود جانتے ہیں کہ میں ان کا مداح ہوں اور میں نے ان کے لیے سچ لکھا، جب میں ان سے ملا بھی نہ تھا۔ میں خوش ہوں کہ انھوں نے میرے سچ کی لاج رکھی ہے۔

محترم لطیف الزمان خان، پروفیسر عارف ثاقب اور میں جناب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی سے ملے۔ انھوں نے کمال مہربانی سے سارے معاملات کو سمجھا اور انکوائری کا حکم دیا۔ جنرل صاحب روشن چہرے، اچھے دل کے ماہر تعلیم ہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی کا خاصا گند صاف کر دیا ہے۔ ابھی ارادوں اور آرزوؤں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ یونیورسٹی کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے اور ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

خان صاحب اور عارف ثاقب نے غالب پر ہونے والے ظلم کی دہائی دی۔ جنرل صاحب متاثر ہوئے۔ اب امید کی جا سکتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں کیے گئے اس عظیم فراڈ کے لیے خاطر خواہ کارروائی ہو گی۔ لائبریری اور شعبہ امتحانات کے لیے جنرل صاحب نے قابل قدر اصلاحات کی ہیں۔ اب یہ اقدام بھی ان کی قابل ذکر معرکہ آرائی ہو گی۔ اس ضمن میں لطیف الزمان خان، ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر عارف ثاقب سے رابطہ مفید ہو گا۔

غالب ایک انگریز کرنل سے ملا تو کہا کہ میں آدھا مسلمان ہوں۔ وہ پاکستانی

جنرل سے ملتا تو کہتا کہ میں ایک چڑایا ہوا شاعر ہوں۔ انگریز کرنل غالب سے مل کر خوش ہوا تھا۔ غالب پاکستانی جنرل سے مل کر خوش ہوتا۔

(ڈاکٹر اجمل نیازی کی بے نیازیاں۔ روزنامہ "دن" لاہور۔ ۲۹ جون ۲۰۰۰ء)

☆

وی سی صاحب کو انتباہ

ڈاکٹر اجمل نیازی

باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چرایا ہوا نادر مخطوطہ (''دیوانِ غالب، نسخہ لاہور'') وائس چانسلر جنرل ارشد کو بڑی دھوم دھام سے واپس کر دیا ہے۔ اس سے پہلے اس حوالے سے انکوائری رپورٹ وائس چانسلر تک پہنچ چکی ہے، جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ یہ مخطوطہ یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا۔ اس کا لائبریری نمبر ۶۸۱۴ ہے۔ اس کی واپسی کے لیے وی سی صاحب نے مناسب کارروائی کے لیے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ خود معین الرحمٰن زیادہ بے قرار تھا۔

یونیورسٹی کی اپنی چیز کوئی واپس کرتا ہے، جبکہ وہ خود اس میں ایک مشکوک کردار ہے، تو اس میں اتنی شان و شوکت کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کوئی کسی اغوا شدہ لڑکی کو اس کے باپ کے گھر اس طرح لے جاتا ہے کہ وہ دلھن بنی ہوئی ہو جبکہ اس کے ساتھ دو بچے بھی ہوں۔

معین نے مخطوطے کو سجا بنا کے وی سی کو پیش کیا، جسے انھوں نے یقیناً شکریے کے ساتھ وصول کیا ہو گا۔ تصویریں بھی اتریں ہونگی۔ میں وی سی صاحب سے نامور غالب شناس لطیف الزمان خان اور پروفیسر ڈاکٹر عارف ثاقب کے ساتھ مل چکا ہوں۔ انھیں بڑے درد سے ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ انھیں معین الرحمٰن کی چوریوں اور سینہ زوریوں کے بارے میں کھل کر بتایا۔ انھوں نے ساری بات بہت محبت اور توجہ سے سنی، انکوائری کا حکم دیا۔ انکوائری رپورٹ ہماری گزارشات کے مطابق ہے۔

یہ بھی جنرل صاحب کو بتایا گیا تھا اور انکوائری رپورٹ میں اس کی وضاحت بھی موجود ہے، گورنمنٹ کالج لاہور سے ایک طالبہ بشریٰ باسط نے ایم اے اردو کے لیے ''ادا جعفری، شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے مقالہ لکھا، جس پر ڈگری عطا کی گئی ہے۔ یہ

مقالہ بھی یونیورسٹی کی ملکیت تھا۔ اسے ڈاکٹر معین نے اپنے نام سے پورے کا پورا رسالہ ''نقوش'' کے ستمبر ۱۹۹۱ء کے شمارے میں چھپوا دیا، حتیٰ کہ اس میں وہ غلطیاں بھی موجود ہیں جو مقالے میں ہیں۔

ڈاکٹر معین نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے جرأت مندانہ تحقیقی پمفلٹ کے ردعمل پر جو پمفلٹ لکھا، اس میں اعتراف کیا کہ لڑکی کی ماں بیمار تھی، اور اس کا مقالہ میں نے خود لکھا ہے، جبکہ یہ ایک جرم ہے، تو پھر امتحانات میں ایک امیدوار کی صرف امداد کرنے پر گرفتاری کیوں ہو جاتی ہے؟

حیرت ہے کہ اس کھلے اعتراف جرم کے بعد ایف آئی آر درج نہیں ہوئی اور کارروائی بھی نہیں ہوئی۔ یعنی جو اپنے جرم کا اعتراف کرے، اسے معاف کر دیا جائے۔ ایک چوری کے بعد کئی دوسری چوریاں بھی سامنے آتی ہیں۔ میں پہلے بھی ڈاکٹر معین الرحمٰن کی وارداتوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہ شخص تحقیق و تدریس کا دشمن ہے۔

یہ شخص پبلک سروس کمیشن سے لیکچرار سلیکٹ نہ ہو سکا تھا، مگر پروفیسر سلیکٹ ہو گیا۔ یہ بھی سازش کی ایک لمبی کہانی ہے۔ اب یہ پنجاب ایجوکیشن میں نمبر دو ہے۔ ویسے بھی یہ ''نمبر دو'' آدمی ہے۔ ''نمبر دو'' کام کرنے کا ماہر بلکہ ماہر تعلیم ہے۔ اس نے تنہا تعلیمی شعبے کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، ایسے سیکڑوں آدمیوں نے نہیں پہنچایا ہوگا۔

عظیم تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور کو برباد کرنے اور بدنام کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میرا خیال ہے کہ پرنسپل کالج ڈاکٹر خالد آفتاب گورنمنٹ کالج کے سنئے دنوں میں ایک نیک نامی ڈالنے کے خواہاں ہیں مگر اس شخص نے انھیں مسلسل دھوکے میں رکھا۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج کو چاہیے کہ وہ اس کی تعلیم دشمن سرگرمیوں کا نوٹس لیں۔ طالبہ بشریٰ باسط کے مقالے کے حوالے سے سنگین بدعنوانی کے معاملے میں گورنمنٹ کالج بھی بدنام ہوا ہے۔ انکوائری رپورٹ میں واضح طور پر اسے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ جنرل ارشد بھی اولڈ راوین ہیں۔

پبلک سروس کمیشن نے ایکسپرٹ کے طور پر اسے نااہل رکھا ہوا ہے، جبکہ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں وہ اس طرح کی ذمہ داریاں انجوائے کر رہا ہے۔ شعبہ امتحانات کے ماہرین اور ماہرین غالب سے ملاقات کے بعد جنرل ارشد موثر کارروائی کریں۔ ان کے

لیے ہمارا خیال اچھا ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی میں اصلاحات کا ایک نیا زمانہ شروع کیا ہے۔ ایک زمانہ ان کا معترف ہو رہا ہے۔

تازہ ترین دو سیکنڈل ان کی پوری توجہ چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ علمی شخصیتیں گھروں سے باہر نکل کے کسی مہم کا حصہ بنیں، جنرل صاحب اپنے حصے کا کام کر دیں۔ یہ کارنامہ ہوگا اور نیک نامی ہوگی۔

(ڈاکٹر اجمل نیازی۔ ''بے نیازیاں''۔ روزنامہ ''دن'' لاہور۔ ۲۳ اگست ۲۰۰۰ء)

☆

جھوٹی ایف آئی آر اور چور پروفیسر

پاکستان میں آج تک کسی تھانے میں ایک بھی سچی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی۔ یہ بات وزیر قانون و انصاف ڈاکٹر خالد رانجھا نے بتائی۔ وہ ایک بڑے وکیل، دانشور اور ماہر قانون ہیں۔ حکومت پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسا وزیر ملا۔ انصاف حاصل کرنے کے لیے ایف آئی آر بنیادی دستاویز ہے جسے کبھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ موقعے کے گواہان کا اندراج بھی اس میں ہوتا ہے۔ وہ بھی جھوٹے ہوتے ہیں جو عدالت میں ''سچ'' بولتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو وعدہ معاف گواہ بھی سچے نہیں ہوتے۔ ان میں سینئر بیوروکریٹ اور سیاستدان بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسا جھوٹا گواہ سابق سیکرٹری تعلیم پنجاب احمد صادق ہے۔ اس کے نام ایک جھوٹے پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی ایک کتاب کا انتساب کیا ہے۔ میں اسے کاذب لکھتا مگر احمد کے ساتھ یہ لفظ لکھنا محبت کی توہین ہے۔

ڈاکٹر معین نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے دیوان غالب کا ''نسخہ لاہور'' چوری کیا، اسے چھاپا، کمائیاں کیں اور پھر وی سی جنرل ارشد کو بڑے فخر کے ساتھ واپس کر دیا۔ ایم اے کی طالبہ بشریٰ باسط کا مقالہ اپنے نام سے رسالہ ''نقوش'' میں چھپوا دیا۔ اس چوری اور سینہ زوری کیخلاف بہت قابل ایجوکیشنسٹ پروفیسر ڈاکٹر عارف ثاقب کی وی سی کو درخواست ایک سچی ایف آئی آر سے بڑھ کر ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اور قدرت نقوی کے دو کتابچے اور میرے دو کالم بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ملتان کے ماہر غالبیات لطیف الزمان خان کی گفتگو تو جیسے عدالتی جرح ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کو نئی نیک نامی دینے والے جرنیل نے بھی کچھ نہیں کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خالد رانجھا کچھ کریں۔ وہ علوم کا ہجوم اپنے دل و دماغ میں رکھتے ہیں اور اولڈ

راوین ہیں۔ ایک نان راوین استاد ڈاکٹر معین نے ہمارے گورنمنٹ کالج لاہور کو بربادی اور بدنامی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ اب تھانے اور کالج میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اس تھانے کا محرر ڈاکٹر معین الرحمٰن ہے جو واقعی ڈائریکٹ حوالدار ہے۔ وہ پنجاب پبلک سروس کمیشن کے لیے مجسم اور مسلسل رسوائی کا باعث ہے۔ اس کا ایک ساتھی پنجاب پبلک لائبریریز کا ڈائریکٹر عبدالجبار شاکر ہے۔ اس نے پنجاب پبلک لائبریری کے ساتھ وہی کیا ہے جو یونیورسٹی لائبریری کے ساتھ معین نے کیا ہے۔ پنجاب پبلک لائبریری میں قرآن کے مخطوطے معین کے کسی کام کے نہ تھے، ان سے عبدالجبار شاکر نے جو کام لیا وہ تو پیشہ ور مولوی بھی نہیں لے سکے۔

رانجھا صاحب نے ٹھیک کہا کہ ہمارا معاشرہ جھوٹوں کا ڈیرہ ہے۔ میں نے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں کی مثال دی کہ وہاں تھانے، عدالت اور کہیں بھی جھوٹ کا گزر نہیں۔ اداروں اور تعلیمی اداروں میں تو سچ اور محبت ہی راہنما ہوتے ہیں۔ میں کئی دفعہ ناروے گیا ہوں۔ وہاں معلوم تاریخ کی روشنی میں بظاہر کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا، کوئی آسمانی ہدایت نہیں اتری۔ وہ سمندری چوروں کا ملک تھا۔ اب محبت کرنیوالوں کا مہذب ملک ہے۔

رانجھا صاحب نے کہا کہ تعلیمی فروغ اور فطری عادات نے انھیں اچھا شہری بنایا۔ میں نے سوچا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں ''ڈاکٹر معینوں'' کی کمی نہیں تو تعلیمی فروغ سے کیا ہوگا۔ ہمارے نام نہاد تعلیم یافتہ لوگ زیادہ مجرم اور کرپٹ ہیں۔ اس ملک کو ان پڑھ اور غریب لوگوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا، تو کیا کالجوں اور بالخصوص گورنمنٹ کالج لاہور کو فی الحال بند کر دیا جائے، جب تک ڈاکٹر معین الرحمٰن ریٹائرمنٹ کی عمر کو نہیں پہنچ جاتا۔

لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج نے کہا کہ تھانے بند کر دیے جائیں تو لوگ جرائم کرنا بند کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جج صاحبان کسی تھانیدار کا جو حشر عدالت میں کرتے ہیں، ڈاکٹر معین اس سے کہیں بڑھ کر بُرے سلوک کا مستحق ہے۔ سچے اولڈ راوین ڈاکٹر خالد رانجھا اپنی مادرِ علمی گورنمنٹ کالج لاہور کو ایک علم دشمن اور چور استاد سے بچائیں۔ جرنیل وائس چانسلر اور راوین پرنسپل اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ اس کے بڑے

بڑے لوگوں سے (رابطے) ہیں، جس طرح پیشہ ور مجرموں کو وڈیروں، لیڈروں کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔

(ڈاکٹر اجمل نیازی۔ ''بے نیازیاں''۔ روزنامہ ''دن'' لاہور۔ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۰ء)

☆

چانسلر صاحب وائس چانسلر کی مدد کریں

ڈاکٹر اجمل نیازی

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے غالباً اردو تحقیق کے ساتھ وہی کیا ہے جو نواب زادہ نصراللہ نے پاکستانی سیاست کے ساتھ کیا ہے، مگر ہم معین کو اردو تحقیق کا نصراللہ یا نصراللہ کو پاکستانی سیاست کا معین نہیں کہہ سکتے۔ اس طرح دونوں کی توہین ہو گی۔ ڈاکٹر معین نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے دیوان غالب کا مخطوطہ "نسخۂ لاہور" چرایا۔ پھر اسے شائع کرایا اور لاکھوں روپے کمائے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے کتابچہ لکھا۔ جس کی اردو دنیا میں پذیرائی ہوئی۔ سب نے ڈاکٹر معین کی تحقیقی چوری کی مذمت کی۔ ڈاکٹر عارف ثاقب نے بھی بہت دلیری سے تحقیقی مقابلہ کیا۔ میں نے بھی دونوں ادبی مجاہدوں کے ساتھ مل کر آواز بلند کی۔ میں نے کالم لکھے۔ کالم نگاری سالم نگاری ہے۔ میں نے ہر طرح کے ظلم کے خلاف قلم کو علم بنایا ہے۔ میرے لفظ نعرے بازی بھی کرنے لگتے ہیں۔ میں کالم نگاری کو کالم آرائی سمجھتا ہوں، اور کالم آرائی معرکہ آرائی سے کم نہیں۔

میں نے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنرل ارشد کی مدح آرائی کی۔ یہ "مذمت گردی" سے مختلف نہیں ہوتی۔ اللہ کے فضل سے میرے نزدیک مدح اور مذمت برابر ہیں۔ میں ڈاکٹر عارف ثاقب کے ساتھ وی سی صاحب سے ملا۔ ہمارے ساتھ تحقیقی استقامت والے غالب مرحوم کے عاشق صادق، دانشور، نامور ماہر غالبیات، دلیر و دانا اور دیدہ ور جناب لطیف الزمان خان بھی تھے۔ وہ ملتان سے خاص طور پر آئے تھے۔ ماہر تعلیم جرنیل وائس چانسلر ہماری باتوں سے متفق اور متاثر ہوئے۔ معاملے کی چھان بین کے لیے کمیٹیاں بن گئیں۔ ساری رپورٹیں ہماری گزارشات کے مطابق ڈاکٹر معین کے خلاف ہیں۔

اس دوران ڈاکٹر عارف ثاقب نے ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کے

کتابچوں کے موازنے پر مشتمل ایک زبردست ادبی رپورٹ مرتب کی، جس کی دھوم دور دور تک ہوئی، مگر نجانے کیا ہوا کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے یونیورسٹی لائبریری سے چرایا ہوا مخطوطہ وائس چانسلر کو پیش کیا۔ اس واقعے کی تصویریں بنائی گئیں اور چھپوائی گئیں۔ لگتا ہے جیسے وی سی صاحب ڈاکٹر معین سے کوئی انعام وصول کر رہے ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے توہین آمیز ہے۔ جنرل ارشد تو بہت دل والے روشن دماغ آدمی ہیں، انھیں کیا ہوا کہ انھوں نے اس حوالے سے آنکھیں بند کر لیں۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کو نئے منظر دیے ہیں جنھیں ہزاروں آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ ان کے آنے پر لوگوں نے واویلا کیا۔ میں نے نئے وی سی کے لیے خیر مقدمی کالم لکھا۔ انھوں نے میرے لفظوں کی لاج رکھی۔ وہ پرانی درس گاہ کو نئے صبح و شام دے رہے ہیں۔ وہ قبضہ گروپ یعنی ''غلبہ گروپ'' کے خلاف ڈٹ گئے تو وہ غالب مغلوب کو بھی بچائیں۔ انھوں نے جو کام آغاز کیے ہیں، ان کے لیے تعریف ہی تعریف ہے۔ اللہ کرے انجام بخیر ہو۔

ان سے ایک عظیم شاعر کی توہین کے لیے احتجاج کیا۔ اس ضمن میں ان سے انصاف اور امداد کی توقع کی۔ میں ذاتی کام تو اپنے خدا سے کہتے ہوئے بھی گھبراتا ہوں۔ خدا وی سی صاحب کو چیزیں اور چہرے دیکھنے کی توفیق دے، جیسا کہ اصل میں وہ ہیں۔ دوست مایوس اور مجبور ہو کے عدالت میں جانے والے ہیں۔ میں نے انھیں روک رکھا ہے۔ ابھی ہم وی سی صاحب سے پوری طرح ناامید نہیں ہوئے۔ معاملہ عدالت تک گیا تو جنرل صاحب کو بھی خواری کا سامنا ہو گا، اور ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اس زیادتی میں ہم غالب کے طرف دار ہیں اور وائس چانسلر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کیا ہم چانسلر صاحب کی طرف دیکھیں۔ وہ وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ گورنر پنجاب جنرل صفدر تعلیم و تحقیق کے فروغ کے لیے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ وائس چانسلر نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے معاملے میں چپ سادھ لی ہے اور ہمارا ارادہ ہے کہ علمی و ادبی اور تحقیقی و تعلیمی کرپشن کے حوالے سے ڈاکٹر معین کا کیس احتساب کے لیے نیب کے حوالے کیا جائے۔

آخری عمر میں جب مرزا غالب کو لوگ گالیوں سے بھرے ہوئے خطوط لکھتے تھے تو اس نے برا نہیں منایا تھا۔ اسے یہ برا لگا تھا کہ لوگوں کو گالی دینا بھی نہیں آتا۔ بوڑھے

آدمی کو ماں کی گالی نہیں دیتے۔ ڈاکٹر معین نے وہ کچھ کیا ہے جیسے مرنے کے بعد غالب کو ماں کی گالی دی ہے۔

ڈاکٹر معین نے ایک ڈاکہ اور مارا ہے۔ ایک کتاب ہے ''برسبیل غالب۔'' یہ کتاب بھی چوری اور سینہ زوری کا شاہکار ہے۔ ڈاکٹر معین ''برسبیل غالب'' اور برسبیلِ تذکرہ میں فرق نہیں جانتا۔ جیسے آج کے ماہر اقبالیات اور ماہر غالبیات میں فرق نہیں، تو غالب اور مغلوب بھی ایک صف میں کھڑے ہیں۔

(ڈاکٹر اجمل نیازی۔ ''بے نیاریاں''۔ روزنامہ ''دن'' لاہور۔ ۴ دسمبر ۲۰۰۰ء)

☆

چانسلر کے گھر پر وائس چانسلر کا "تحقیقی سچ"

ڈاکٹر اجمل نیازی

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنرل ارشد محمود نے کہا کہ ڈاکٹر معین نے مجھے دھوکہ دیا ہے، میرے سامنے جھوٹ بولا ہے۔ یہ دونوں کام تو ڈاکٹر معین کا معمول ہے اور اس کے لیے معمولی بات ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جنرل صاحب اصل بات تک ضرور پہنچیں گے۔ میرا خیال جنرل صاحب کے لیے اچھا ہے۔ میں انھیں ملا بھی نہ تھا جبکہ ان کے خلاف یونیورسٹی استادوں کا ایک وفد مجھے ملا تھا۔ میں نے تب بھی جنرل صاحب کا اپنے طور پر خیر مقدم کیا تھا۔ میں نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ یہ شخص پنجاب یونیورسٹی کے بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال لے گا اور ایک نیا زمانہ مادر علمی کو ملے گا۔ پھر یہ ہوا کہ ان کے مخالف اساتذہ بھی حیران ہوئے۔ میں اپنے سامنے سرخرو ہوا۔ خدا نے مجھے کبھی اپنے لکھے ہوئے لفظوں کے سامنے شرمندہ نہیں کیا۔ جنرل صاحب نے مجھے فون کیا تو میں نے کہا یہ ضروری نہیں کہ کوئی مجھے کہے تو میں لکھوں۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میں نے جو آپ کے لیے محسوس کیا تھا، آپ وہی ہیں۔ آپ نے میری یونیورسٹی کو ایک اعلیٰ درس گاہ بنانے کے لیے سچی جدوجہد کا آغاز کیا ہے۔ یہ ہمارے لیے اعزاز اور خوشی کا مقام ہے۔ مجھے امید ہے کہ ماضی کا سیاسی اور تعلیمی اکھاڑہ ایک علمی نخلستان میں تبدیل ہو گا۔ یہاں سیاستدان اساتذہ اور لیڈر طلبہ کا دنگل اب نہیں ہو گا، بلکہ جنگل میں منگل ہو گا اور یہ جنرل ارشد کے زمانے میں ہو گا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنرل اکرم ہیں اور وہاں زیر تعلیم میرے بھتیجے احمد بن اکبر نیازی نے بتایا کہ میں نے جنرل صاحب سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے، مگر اب تو کوئی نیا زمانہ ہے۔ تو کیا ساری یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر جرنیل ہوں، مگر وہ ایسے ہی جرنیل ہوں۔

گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر خالد آفتاب اپنے ادارے کے ایک ثابت شدہ

مجرم استاد ڈاکٹر معین الرحمٰن سے گورنمنٹ کالج کو نجات نہیں دلا سکے۔ میں ایک سچا راوین ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ گورنمنٹ کالج کو جس طرح کا جتنا نقصان ڈاکٹر معین نے پہنچایا ہے، گورنمنٹ کالج کے سارے مخالفوں نے مل کر بھی نہیں پہنچایا ہو گا۔ اب بھی وقت ہے ڈاکٹر خالد کے پاس کہ وہ یہ کارنامہ کر دیں۔ معین الرحمٰن کو ایسی سزا دیں کہ گورنمنٹ کالج اس کی پھیلائی ہوئی گندگیوں اور بندگیوں سے پاک ہو سکے۔ جس طرح اصل صورتحال کا ادراک جنرل ارشد کو ہوا ہے، کاش ڈاکٹر خالد آفتاب کو بھی ہوتا۔

جنرل صاحب کو میں برادرم ڈاکٹر عارف ثاقب اور محترم لطیف الزمان خان کے ہمراہ ملا تھا اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے معروف مخطوط ''دیوانِ غالب'' کے ''نسخہ لاہور'' کی چوری اور اسے ڈاکٹر معین کی طرف سے نسخہ خواجہ بنا کے شائع کرنے اور کمائیاں کرنے کے واقعے سے آگاہ کیا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر عارف ثاقب کی جرأت مندانہ تحقیق پر مبنی کتابچے بھی انھیں پیش کیے تھے۔ اس حوالے سے بہادر ماہر غالبیات لطیف الزمان خان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وی سی صاحب نے فوری طور پر پرنسپل اورینٹل کالج اکرم چوہدری کو رپورٹ پیش کرنے کو کہا تھا۔ چوہدری صاحب اور یونیورسٹی کے دوسرے کئی اہم حضرات کی طرف سے ساری تحقیق نے ہماری باتوں کی تصدیق کر دی ہے۔

اس دوران ڈاکٹر معین نے اپنے خوشامدانہ طریق کار سے وی سی صاحب کو مذکورہ مخطوطہ پیش کر دیا اور تصویریں بھی بنوا لیں۔ یونیورسٹی سے خود چوری کیے ہوئے مخطوطے کو اپنی دریافت کہا۔ اس کے خلاف چوری اور فراڈ کا پرچہ یونیورسٹی کی طرف سے درج ہونا چاہیے۔ اخباری بیان کے مطابق جنرل ارشد نے اس مجرمانہ حرکت کو ادبی تاریخ کا بڑا فراڈ قرار دیا ہے۔ اسے تحقیق و تدریس کے ساتھ بے وفائی کا نام دیا ہے۔ یہ باتیں انھوں نے چانسلر کے گھر یعنی گورنر ہاؤس میں ایک عشائیے کے موقع پر کہیں۔ گورنر پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔ انھیں کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔ انھوں نے بھی اس تحقیقی چوری کا نوٹس لیا ہے۔ وہ پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی میں کسی طرح کے فراڈ کرنے والے کو فرار نہیں ہونے دینا چاہتے۔ اس دوران ڈاکٹر معین نے خود تسلیم کیا ہے کہ اس نے اپنی ایک شاگردہ کو ایم اے اردو کا

مقالہ تحریر کر کے دیا تھا، اس لیے اسے اپنے نام سے ''نقوش'' میں شائع کروایا ہے، جبکہ اس مقالے پر بشریٰ باسط کو ایم اے کی ڈگری ملی ہے۔ ایسے کام اپنی تدریسی زندگی میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے بہت کیے ہیں۔ وہ پبلک سروس کمیشن میں لیکچرار سلیکٹ نہ ہو سکا تھا مگر پروفیسر وقار عظیم کو اپنی ''فرزندی'' دینے کا چکمہ دیکر پروفیسر سلیکٹ ہوگیا، پھر ان کی بیٹی سے شادی بھی نہ کی۔

(ڈاکٹر اجمل نیازی۔ ''بے نیازیاں۔'' روزنامہ ''دن'' لاہور۔ ۱۹ جنوری ۲۰۰۱ء)

☆

ادرک کا بیوپار کرنے والے بوزنے

ڈاکٹر عارف ثاقب

سید قدرت نقوی صاحب کے انتقال کی خبر غالب دوستوں کے حلقے میں بڑے دکھ سے سُنی گئی۔ غالب شناسی کا ایک باب ختم ہوا۔ ہمارے ہاں سچے محققین کی تعداد ہی کتنی ہے۔ ایسے میں ایک سچا غالب شناس دنیا سے اُٹھ جائے تو اس سے بڑا المیہ کیا ہو گا۔ میں سید قدرت نقوی صاحب سے اُن کی تحریروں کے ذریعے متعارف ہوا تھا اور میرے دل میں اُن کا بڑا احترام ہے۔ افسوس کہ میں اُن سے مل نہ سکا، انھیں دیکھ نہ سکا۔ قدرت نقوی صاحب گزشتہ ایک دو ماہ سے سخت بیماری کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اسی بیماری کی حالت میں انھوں نے غالب شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک کتابچہ تحریر کیا تھا۔ ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ۔ ایک جائزہ۔'' میرا اندازہ ہے کہ یہی ان کی زندگی کی آخری تحریر بھی تھی۔ غالب کے ساتھ محبت کرنے والے قدرت نقوی نے دیوانِ غالب کے اُس قضیئے میں بھی اپنا حصہ ڈالا جو آج کل ادبی حلقوں میں ایک غیر معمولی موضوع بنا ہوا ہے۔ قدرت نقوی صاحب نے اپنے اِس کتابچے میں جس عمیق نگاہی اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دیا ہے، یہی ہمارے سچے محققین کا طرۂ امتیاز رہا ہے، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ یہ لوگ کنجِ گمنامی میں رہے۔ جھوٹی شہرت حاصل کرنے کے ہنر وہ بھی جانتے تھے مگر انھیں بروئے کار لانا، وہ علمی دیانت کے خلاف سمجھتے تھے۔ بس اپنے گیان اور دھیان میں جستجو کی منازل طے کرتے رہے۔ یہی اُن کا کام تھا اور اِسی میں اُن کا نام ہے۔ لاہور میں ایک ایسے ہی محقق خلیل الرحمٰن داؤدی ہیں جنھوں نے اپنی ایک عمر تحقیق کے خارزاروں میں گزاری ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور کے ایماء پر جو کتب انھوں نے مرتب کیں اور جن کے مبسوط مقدمے انھوں نے تحریر کیے، وہ اردو تحقیق کی آبرو ہیں، مگر کس قدر مقام افسوس ہے کہ ایسے صاحب نظر ادبی دنیا والوں کو دکھائی نہیں دیتے اور جو

بزنے ادرک کا کاروبار کر رہے ہیں، وہ صاحب فضیلت ہیں۔ ہماری ادبی دنیا میں کیا گل و گلزار ہونے کے لیے مٹی میں ملنا ضروری ہے؟ ہمارے ہاں کیا زندوں سے اچھے مقدر مزاروں کے ہیں؟ کیا عزت و شہرت کے لیے کسی ادبی گروہ اور میڈیا سے وابستہ ہونا ضروری ہے؟ حلقۂ احباب کو خوش کرنا اور خوش رکھنا ضروری ہے؟ کیا ہمیں ان سوالوں پر غور کرتے ہوئے اپنا محاسبہ نہیں کرنا چاہیے؟

سید قدرت نقوی صاحب کا کتابچہ ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ۔ ایک جائزہ'' ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مرتب کردہ دیوانِ غالب ''نسخۂ خواجہ'' (اصلاً نسخہ لاہور) کے رو کے طور پر لکھا گیا تھا، جس میں انھوں نے مختلف شواہد اور خود غالب کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ دیوان غالب کا نسخہ خواجہ اور ''نسخۂ لاہور'' ایک ہی نسخہ ہے۔ انھوں نے اس نسخے کو ''نسخہ جے پور'' کے نام سے بھی متعارف کروایا۔ آج قدرت نقوی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کی تحریر کو تبدیل کر کے پیش کرنے والے محققین بھی موجود ہیں۔ میں یہاں صرف یہ دو اقتباسات درج کر رہا ہوں۔ پہلا اقتباس قدرت نقوی صاحب کے مذکورہ کتابچے کے صفحہ ۴۷ سے لیا گیا ہے۔ اسی اقتباس کو ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی تازہ کتاب ''بہ سبیل غالب'' میں صفحہ ۱۸۹ اور ۲۱۷ پر کس طرح درج کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

سید قدرت نقوی صاحب لکھتے ہیں:

''اس نسخہ پر کئی افتادیں پڑیں۔ پہلی افتاد اِس کی پیش کش کے سلسلہ میں واقع ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ ''خطوط غالب'' (فارسی و اردو) میں موجود ہے۔ دوسری افتاد جے پور میں تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ ریاست جے پور سے کوئی اڑا لایا اور پنجاب یونیورسٹی کو بیچ دیا۔ تیسری افتاد: لائبریری سے کسی نے کسی طرح اڑا لیا جو شدہ شدہ معین الرحمٰن کے ہاتھ آیا۔ یہ مسروقہ نسخہ مقبوضۂ معین الرحمٰن ہے، جسے انھوں نے ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے چھاپ کر اس کی بازیافت کی۔ طباعت اور پیشکش اچھی ہے۔''

(''دیوانِ غالب نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ۔ ایک جائزہ'' از سید قدرت نقوی۔ مکتبہ تخلیق ادب، کراچی۔ اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۴۷)

قدرت نقوی صاحب کے درج بالا اقتباس کو ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی کتاب

''برسبیلِ غالب'' کے صفحہ ۱۸۹ اور ۲۱۷ پر خود ساختہ تبدیلی کے ساتھ یوں درج کیا:

۔ ''دیوان غالب کے اس نسخے پر کئی افتادیں پڑیں۔ پہلی افتاد جے پور میں تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ اُسے ریاست جے پور سے کوئی اڑا لایا اور پنجاب یونیورسٹی کو بیچ دیا۔ پھر یونیورسٹی لائبریری سے کسی نے کسی طرح اڑا لیا جو شدہ شدہ معین الرحمٰن کے ہاتھ آیا، جسے انھوں نے ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے چھاپ کر اُس کی بازیافت کی۔ طباعت اور پیش کش اچھی ہے۔''

(''برسبیل غالب'' از ڈاکٹر معین الرحمٰن۔ الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔ ستمبر ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۸۹، ۲۱۷)

آپ نے درج بالا دونوں اقتباسات ملاحظہ فرمائے، اصل بھی اور حوالے کے طور پر درج شدہ بھی۔ معین الرحمٰن صاحب نے اِسے حوالے کے طور پر درج کرتے ہوئے پھر واوین کا استعمال نہیں کیا۔ البتہ نیچے قدرت نقوی صاحب کا نام لکھا ہے۔ کتابچے کا حوالہ بھی نہیں دیا، جبکہ ان کے دیگر اقتباسات میں پورے حوالے موجود ہیں۔ یہاں کیوں اِس سے انحراف کیا گیا؟ کیا دنیا کا کوئی تحقیقی اصول ایسا ہے جو اِس تحریف کو جائز قرار دے؟ کیا ڈاکٹر معین الرحمٰن اصل پیراگراف کو درج کرتے ہوئے اُسے اپنے حق میں تبدیل کر دینے کا حق رکھتے ہیں؟ کیا یہ اُن لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف نہیں جو اصل اقتباس سے لاعلم ہیں؟ اور کیا یہ تحقیقی بد اخلاقی نہیں؟ قدرت نقوی صاحب تو اب صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتے۔ وہ تو اپنے لکھے ہوئے کتابچے کے جواب کے منتظر رہے۔ ''برسبیل غالب'' کے مصنف نے قدرت نقوی صاحب کے کتابچے کے جواب میں تو ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ ان کے کسی اعتراض کا جواب نہیں دیا۔ بس اُن کا ایک اقتباس دو دفعہ درج کیا اور وہ بھی تحریف کر کے۔ یوں تو یہ ساری کتاب سیاق و سباق سے کاٹ کر جملوں اور اقتباسات کی ''تشکیل'' پر مبنی ہے جس پر گفتگو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں مجھے نظیر صدیقی صاحب کی چند سطور یاد آ رہی ہیں جو انھوں نے اپنے ایک تازہ خط میں مجھے لکھیں۔ نظیر صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

''موجودہ کتابچے میں تم نے ڈاکٹر معین کی سخت گرفت کی ہے۔ وہ میرے دوستوں میں ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتے اور مہلک غلطیوں کا RISK لیتے رہتے ہیں۔''

ناصر زیدی صاحب معین الرحمٰن صاحب کا جرمِ تحقیق پوچھتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ یہی اُن کا جرمِ تحقیق ہے! بس یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر میں سوچتا ہوں کہ ہم نے اُن سچے محققین سے کیوں چشم پوشی کر رکھی ہے جو شہرت، نام وری اور مقام و مرتبے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ ''برسبیل غالب'' میں نام لے کر اور نام لیے بغیر جو ذاتی نوعیت کے حملے کیے گئے ہیں، اُن کا جواب ابھی اُس سطح پر آ کے نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک علمی معاملہ ہے لہٰذا انداز بھی علمی ہی رہے تو بہتر ہے، لیکن اگر من گھڑت کہانیاں سنا کر حقائق کو چھپانے کی کوشش ہو گی اور ''برسبیل غالب'' کی طرح ذاتیات کو اچھالا جائے گا تو پھر کچھ لوگ اسی سطح پر اُتر کر جواب دینے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ ناصر زیدی صاحب اطمینان رکھیں۔ ہم وہ ہرگز نہیں کریں گے جو اہلِ لکھنو نے یگانہ کے ساتھ کیا۔ البتہ ہم ان دستاویزات کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کرتے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں گی۔

باقر صاحب کا ایک شعر ہے:

ذائقوں کے قتل کے یوں سلسلے جاری ہوئے
بوزنے اِس عہد میں ادرک کے بیوپاری ہوئے

خُدا جانے ہمارے ہاں بوزنے، ادرک کا کاروبار کب تک کرتے رہیں گے؟ اور کب تک ذائقوں کے قتل کا سلسلہ جاری رہے گا!!

(ڈاکٹر عارف ثاقب۔ ''حرف عارفانہ'' ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ فروری ۲۰۰۱ء)

عالم ارواح سے مرزا اسداللہ خان غالب کا خط

حفیظ الرحمٰن خان

ایک صاحب عالم آب و گل سے عالم بے کیف وکم میں، کہ جس کو عرف عام میں برزخ کہتے ہیں، تازہ وارد ہوئے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ تم خانوادہ لوہارو کے چشم و چراغ ہو۔ جمیل الدین احمد خان نام پایا ہے، متخلص بہ عالی ہو اور سلطنت خداداد موسوم بہ پاکستان کے شہر کراچی میں تمھارا قیام ہے۔ علاء الدین احمد خان علائی کا پڑپوتا جمیل الدین احمد خان عالی، واہ کیا خوب مناسبت ہے۔ یہاں مادی دنیا کے مہ وسال کے پیمانے مستعمل نہیں، خدا جانے مرورایام کے حساب سے کتنا زمانہ بیت چکا ہے۔

یاد آتا ہے کہ جہان اسباب میں تمھارے خانوادے سے گہری نسبت تھی۔ تم بھی اسی نہال کے ثمر ہو جس کا میں ہوا خواہ اور سایہ نشین رہا۔ کیونکر مجھ کو عزیز نہ ہو گے۔ رہی دیدوادید، اس کی دو صورتیں ہیں۔ میں مثل پہلے جنم کے دوسرا پاؤں یا تم دار فنا سے عالم بقا میں آؤ۔ پہلی صورت جہان فانی میں ہنود کا واہمہ تھا، دوسری صورت بہرحال شدنی ہے۔ آؤ گے تو مل بیٹھیں گے۔

اب پوچھو کہ تو کیونکر عالم برزخ کی رستاخیزی میں بچ رہا۔ صاحب بندہ! بچ کہاں رہا۔ ایک سنسان بے آب و گیاہ وادی کا سفر کرتا ہوں۔ دھوپ ہی دھوپ ہے۔ سایہ کا نام ونشان نہیں۔ خلق خدا پسینہ میں شرابور بھٹکتی پھرتی ہے۔ کوئی راستہ نہیں، کوئی بدرقہ نہیں۔ وہ تو خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ میرے سیاہ نامے میں چند شعر اعتراف گناہ کے پائے گئے۔ چند آنسو شرمساری کے دامن میں گرے تھے، کام آ گئے۔ ورنہ میں کہاں اور یہ عالم نفسانفسی کہاں۔ یہاں وہ دارو گیر ہے کہ اللہ کی امان۔ میری جان! یہاں آنا تو زاد سفر ضرور ساتھ لانا۔ بڑے بڑے زہاد، کہ دنیا میں ارسائی و بے ریائی میں نام رکھتے تھے، یہاں آ کر حقیقت کھلی کہ دکھاوا تھا۔ اصل متاع سے خالی کیسہ ہیں۔ ان پر وہ افتاد ہے کہ الامان والحفیظ! دیکھیے! انجام کار کیا ہو۔

بھائی! یہاں تازہ واردان بساط برزخ کی ایک مجلس میں گزر ہوا۔ ذکر ہو رہا تھا کہ عالم آب و گل کے ریختہ دان حلقوں میں شعر غالب کا بڑا چرچا ہے۔ غالب شناسی، شعری

روایت کا اہم جزو قرار پائی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پنجاب کے شہر لاہور میں میرے دیوان کے ایک قلمی نسخے کے حوالے سے تنازع کھڑا ہو گیا۔ کوئی سید زادہ موسوم بہ معین الرحمٰن ایک قدیم قلمی نسخے کی دریافت کا دعویٰ رکھتا ہے۔ اس قلمی نسخے اوراق ۶۴، سرلوح و تعوید مطلا، شنگرف ولاجورد سے منقش، پہلے صفحات مطلا، حاشیہ و بین السطور مطلا بیل بوٹے، ہر نئی غزل سے پہلے بیل بوٹے شنگرفی، خاتمے پر بھی طلا کاری ہے۔ لاہور کے سید زادے کا بیان ہے کہ یہ نایاب قلمی نسخہ پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے اسے ملا۔ ادھر جامعہ علمیہ پنجاب کے ایک استاد نے، کہ تحسین فراقی کے نام سے معروف ہے، یہ تحقیق ثابت کیا کہ یہ نسخہ اسی دانش گاہ کے کتب خانے سی سرقہ ہے، اور سید زادہ معین، غالب شناسی کا سکہ جمانے کی خاطر اسے اپنی دریافت وتحقیق کا ثمرہ بتاتا ہے۔ بھئی! یہ کیسی غالب شناسی ہے۔ ناشناسی، دنیا کی زندگی میں مقدر رہی، اب ناسپاسی مرنے کے بعد نصیب ہوئی۔ لوگ میرے کلام کے مجاور بن بیٹھے۔ دنیا میں فرید آباد کا کھتری بھی پیچھے پڑ گیا تھا۔ اب مر کے بھی چین نہ پایا۔ یہ سید زادہ میرے نام و کلام کے وسیلے سے شہرت اور رزق پاتا ہے اور ارباب اختیار سے ترفیع درجات کا سزاوار ٹھہرا ہے۔ مغل شاہوں کی بات چھوڑو، وہ کمال فن کے جویا اور قدر دان تھے۔

جب صاحبان عالیشان ہند میں آئے۔ سخن ریختہ سے ناآگاہی کے باوصف، علم و ادب کے سچے قدر دان تھے۔ وظیفہ و منصب دیکھ بھال کر دیتے تھے۔ یہ کیسا زمانہ ہے کہ سارق معتبر ٹھہرے، کم سواد محقق بن بیٹھے۔

اور ہاں میری جان عالی! حیران ہوں کہ اس سارے قضیے میں تو کیوں چپ ہے؟ سنا ہے کہ سخن وری میں تیرا بڑا نام ہے۔ تحقیق میں درک رکھتا ہے اور سیاست و سیادت میں کچھ کچھ خاندانی اثرات تجھ میں موجود ہیں۔ تجھ پر میرا حق فائق ہے۔ اس معرض میں، جہاں میں اب ہوں، عذاب و اذیت کے سامان کیا کم ہیں جو تمھاری دنیا سے بھی شر اور انگار بھیجے جاتے ہیں۔

اپنی نجات کا طالب
غالب

وقت اور زمانہ کا یہاں کوئی شمار نہیں، لہٰذا تاریخ نامعلوم

(حفیظ الرحمٰن خان۔ ''زاویے''۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' ملتان۔ ۲۷ جون ۲۰۰۰ء)

☆

چوری اور سینہ زوری

اشفاق احمد ورک

ہمارے نہایت محترم اساتذہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر تحسین فراقی، جن میں سے ایک میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کے نگران ہیں اور دوسرے میرے اعمال کے، لیکن جب سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی صدارت ملی ہے اور ڈاکٹر تحسین فراقی کا سپین میں قائم ہونیوالی اقبال چیئر کے لیے انتخاب عمل میں آیا ہے، یہ دونوں حضرات نہایت عدیم الفرصت ہو گئے ہیں۔ ہم نے ایک دن باتوں باتوں میں جناب ہاشمی صاحب سے اسی بات کا شکوہ کیا تو مسکرا کر کہنے لگے: بھئی! اصل بات یہ ہے کہ فراقی صاحب کو سپین ہو گیا ہے اور مجھے صدارت ہو گئی ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ گویا ایک کو 'س' اور ایک کو 'ص' ہو گیا ہے۔ جب یہ بات اپنے حکیم جی تک پہنچی تو انھوں نے ہمیشہ کی طرح بات کا بتنگڑ بناتے ہوئے کہا: بھائی میاں! یوں کہیں کہ ایک کو 'صواد' ہو گیا ہے اور ایک کو 'سواد' پڑ گیا ہے۔

سواد خیر ان دونوں حضرات کو تحقیق اور تنقید کا ایسا پڑا ہے کہ لگتا ہے انھوں نے اپنے بچوں کے نام بھی حروفِ تہجی کے اعتبار سے رکھے ہوں گے۔ یار لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے گھر آنے والے مہمانوں کی بھی 'ببلو گرافی' تیار کر رکھی ہے۔ مصر میں دمشق قحط پڑا تھا تو سنا ہے یار لوگوں نے عشق تک فراموش کر دیا تھا لیکن ان دونوں حضرات پر لکھنے پڑھنے کا ایسا عشق طاری ہے کہ یہ کھانا پینا تک فراموش کیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ تحقیق و تدقیق کے میدان میں یہ دونوں حضرات اردو ادب کے شہسواروں میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے نہ صرف اس شعبے میں معیار اور تسلسل کے ساتھ پیش قدمی جاری رکھی ہے بلکہ اس میدان میں در آنے والے موقع و مفاد پرست عناصر کی بھی نہایت سلیقے کے ساتھ نشاندہی و حوصلہ شکنی کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تو اپنی

طبعی صلح جوئی کی بنا پر خراب کارکردگی والوں کو محض گریبان میں جھانکنے کا مشورہ دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر تحسین فراقی، جنھیں حق گوؤں کے ہراول دستے میں شمار کیا جاتا ہے، وہ اس شعبے میں بددیانتی کے مرتکب افراد کو نہ صرف ان کے گھر تک پہنچا کے دم لیتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر ایسے ادبی مجرموں کا گریبان تھامنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس سلسلے کی تازہ ترین مثال ان کا ۷۲ صفحات پر مشتمل تحقیقی کتابچہ ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' ہے۔ یہ اصل میں ۱۸۵۲ء میں تصنیف ہونے والے کلام غالب کے ایک قلمی نسخے کی کہانی ہے، جس کا تعارف ڈاکٹر سید عبداللہ نے جولائی ۵۴ء کے ''ماہ نو'' کراچی میں کرایا تھا اور اسے نواب ضیاء الدین احمد خاں یا کسی شہزادے کے لٹے ہوئے خزانے کا در بے بہا قرار دیا تھا۔ اس نسخے کے بارے میں مزید توضیحات سید صاحب کے مولانا امتیاز علی عرشی اور ایس ایم اکرام کے نام لکھے خطوط میں بھی ملتی ہیں۔ نیز ایک معتبر محقق قاضی عبدالودود نے بھی 'نقوش' شمار ۶۹۔۷۰ بابت اکتوبر ۵۸ء میں بھی اسی نسخے پر 'مخطوطہ دیوان غالب' کے عنوان کے تحت تعارفی شذرہ لکھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا اور ایک عرصے تک اسی لائبریری میں موجود رہا۔ مذکورہ محققین نے بھی اس نسخے کی یونیورسٹی لائبریری میں موجودگی اور اس کی ہیئت سے متعلق کوائف بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے غائب ہو گیا۔ اس سلسلے میں سب سے چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ یہی نسخہ ۹۸ء کے آخر میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ'' کے نام سے نہایت خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گیا، جسے ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اپنے ذخیرہ غالبیات کی 'بیش قیمت متاع' قرار دے ڈالا بلکہ ساتھ ساتھ یہ انکشاف بھی فرمایا کہ انھیں یہ نسخہ ایک پرانی کتابوں کے کاروباری سے ملا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے بھی اس کے دیباچے میں اسے نواب ضیاء الدین احمد خاں یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گوہر گم گشتہ ہی گردانا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں، ویسے تو سیدین (سید عبداللہ اور سید معین) کے جملوں کی یہ یکسانیت ایک عام آدمی کو بھی چونکانے کے لیے کافی تھی لیکن یہاں تو معاملہ ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے محقق کی عقابی نظروں میں آ گیا،

جنھوں نے انتہائی باریک بینی اور عرق ریزی سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا۔ انھوں نے بے شمار حوالوں، دونوں مبینہ مخطوطوں کی عکسی نقول اور جید محققین کی آرا سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اصل میں پنجاب یونیورسٹی سے چرایا جانے والا نسخہ ہی ہے جسے تدوینی سینہ زوری کے ساتھ ہتھیانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح اصل صورت حال اس تحقیقی کتابچے کے بعد چھینٹوں اور داغوں سے بھری ہوئی نظر آنے لگی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے پاس ان تحقیقی موشگافیوں کا کیا جواب ہے اور ان کی طرف سے خاموشی یا نیم رضامندی کی صورت میں ادبی وڈیرے اس مرض کا کیا علاج تجویز کرتے ہیں؟

(اشفاق احمد ورک۔ ''قلمی دشمنی''۔ روزنامہ ''دن'' لاہور۔ ۳۱ مئی ۲۰۰۰ء)

☆

حصہ چہارم: متفرقات

اپنی بات

("تخلیق"، لاہور سے شائع ہونے والا ایک اہم اور معتبر ادبی رسالہ ہے۔ محترم اظہر جاوید صاحب (جو اِس رسالے کے ایڈیٹر ہیں) نے جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں "اپنی بات" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا، جس کا پورا متن پیش کیا جا رہا ہے۔)

"میں تخلیق پڑھنے والوں سے معذرت خواہ ہوں۔ ان شاعرات سے شرمسار ہوں جن کی ادبی دیدہ دلیری کا میں نے گزشتہ "اپنی بات" میں احوال بیان کیا تھا' اور ان پر انگلی اٹھائی تھی۔"

میرے خیال میں (اور بعد میں انجمنِ خیال میں آنے والے خطوط نے تائید کی) کہ ایسے واقعات ادب کو سیندھ لگانے کے مترادف ہیں، اور ادب اور ادیب کا معاشرے میں جو (تھوڑا بہت) احترام رہ گیا ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔

ابھی میری تحریر کی بازگشت جاری تھی کہ لاہور میں ایک کتاب کا چرچا ہوا۔ تحسین فراقی نے نہایت اعتماد سے کتاب چھاپ کر بے حد یقین سے معین الرحمٰن کے سرقے کا ذکر کیا ہے۔

تحسین فراقی کی تحقیق کے مطابق غالب کے دیوان کا وہ نسخہ، جسے معین الرحمٰن نے نادر "مخطوطہ" ظاہر کیا ہے، دراصل پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے چوری کیا گیا ہے۔

تحسین فراقی نے اپنے تئیں بہت سے ثبوت بھی پیش کیے ہیں۔

کسی بھی غیر جانب دار شخص کو اس واردات کو مان لینے میں تامل ہو سکتا ہے۔ معین الرحمٰن سینئر استاد ہیں۔ تحسین فراقی کے بارے میں اپنے پرائے سب کی یہی رائے ہے، وہ کسی ادبی دھڑے بندی یا یونیورسٹی اساتذہ کی کسی منفی سیاست میں شریک نہیں رہے۔ وہ اچھے شاعر اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ مرنجاں مرنج، وضع دار اور شریف النفس ہیں۔

معین الرحمٰن کے بارے میں میرے جیسے کم علم لوگوں کو یہی حسن ظن رہا ہے۔
میں اس واقعے پر شاید اظہار خیال نہ کرتا، مگر چند دن پہلے ایک قومی اخبار میں ملتان میں مقیم لطیف الزماں کا انٹرویو چھپا ہے۔ ایک زمانہ نہ صرف ان کی تحقیق وجستجو کا قائل ہے بلکہ انھیں غالب پر سند (اتھارٹی) کا درجہ دیا جاتا ہے۔
لطیف الزماں نے بھی تحسین فراقی کی حمایت کی ہے اور معین الرحمٰن کی دو چار اور ''چوریاں'' بھی گنوا دی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے' جہاں میں نے ندامت محسوس کی' کہ اگر ایک معتبر تعلیمی ادارے کے شعبہ اردو کا سربراہ کوئی ادبی گھپلا کر سکتا ہے ___ تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدا ہونے والی شاعرات پر کیا الزام ___ ؟
ان سے، اور ''تخلیق'' کے پڑھنے والوں سے معافی ___ سو بار معافی۔
میرا اس نسل سے تعلق ہے، جس نے ادب کے صحیح معنوں میں عالم، فاضل، جید اور نابغۂ روزگار شخصیات کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان میں بھی ادبی مناقشے چلتے تھے، مگر ایسی چوری چکاری، سرقہ اور دیدہ دلیری کی باس تک ان کی محفلوں اور ان کے آس پاس نہیں پھٹک سکتی تھی۔
دوستو! آؤ اب مل کر ادب کی صالح قدروں اور متین روایتوں کے لیے دعائے خیر کر دیں!

انا للہ و انا الیہ راجعون

اظہر جاوید

روشنی کا سفر، اندھیروں کا تعاقب

تسلیم احمد تصور

برسوں اُدھر کی بات ہے ''سورج'' کا پہلا اداریہ لکھا گیا۔ عنوان تھا ''روشنی کا سفر، اندھیروں کا تعاقب۔'' روشنی کا یہ سفر طلبہ برادری نے شروع کیا تھا۔ طلبہ کی طرف سے عوام کے لیے۔ پھر طالب علمی کا زمانہ تو گزر گیا مگر روشنی کا یہ سفر جاری رہا۔ روشنی جو سچائی ہے، زندگی ہے، محبت ہے۔

اور پھر........ ''سورج'' کے غالب نمبر کی اشاعت کا اہتمام ہوا۔ تیاریاں آخری مرحلے میں تھیں کہ عجب واقعہ ہوا۔ بھارت کے معروف غالب شناس آنجہانی پرتھوی چندر کی مایہ ناز تالیف ''جاگیر غالب'' ایک صاحب معین الرحمٰن، نے، جو گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے ہیں، اپنے نام سے شائع کر دی۔ ''سورج'' نے اس اندھیر گردی کا پردہ یوں چاک کیا کہ ''جاگیر غالب'' کا اصل نسخہ اصل مولف کے نام سے ''غالب نمبر'' میں شامل کر دیا۔ گو جعل سازی اور دیدہ دلیری کی یہ ایسی کھلی واردات تھی جس کی صفائی میں بظاہر کچھ کہنا ممکن نہیں تھا، پھر بھی بے ضابطگی کے اس مرتکب کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہے تو ''سورج'' کے صفحات اُس کے لیے حاضر ہیں۔

یہ سب کچھ ۱۹۹۶ء میں ہوا۔ وقت گزرتا رہا۔ موصوف سے جواب نہ بن پڑا۔ ہم نے بھی درگزر سے کام لیا کہ ہمارا مقصد محض ریکارڈ کی دُرستی تھا، کیچڑ اُچھالنا ہرگز نہ تھا۔

مگر صاحب علّت کوئی بھی ہو، بُری ہوتی ہے۔ ان دنوں معین الرحمٰن، ایک اور کرنی کے ہاتھوں کھنچے کھنچے پھرتے ہیں۔ ''دیوان غالب، نسخہ لاہور'' جو پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے چوری ہو گیا تھا، ''نسخہ خواجہ'' کے عنوان سے شائع کر کے اترا رہے تھے کہ ممتاز محقق ڈاکٹر تحسین فراقی نے جا پکڑا۔ خوب تھُو تھُو ہوئی۔ اسی لے دے میں ''جاگیرِ غالب'' کا تذکرہ بھی رہا۔ ہم نے ابتدا ہی میں معین الرحمٰن سے محض اس قدر

پوچھا تھا کہ ''جا گیرِ غالب'' کو ہتھیانے کا آپ کے پاس کیا اخلاقی جواز تھا؟ اس ایک سطری سوال کا ایک سطری جواب تو موصوف ہمیں آج تک بھجوا نہ سکے، مگر پوری کتاب لکھ ماری، جس میں ہمیں جاہل ٹھہرانے اور ''سورج'' کے ''غالب نمبر'' میں پروف کی غلطیاں گنوانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ کاش! وہ باتیں بنانے کے بجائے اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے اب بھی اعتراف جرم کر لیتے۔

مگر کہاں ----- کوئی ایک بات ہو تو کی جائے، جاگیر غالب، نسخۂ مسروقہ، بشریٰ باسط کا مقالہ، رشید احمد صدیقی کی تصویر۔ معلوم ہوا موصوف کا نامۂ اعمال ایسی بہت سی سیاہ کاریوں سے بھرا پڑا ہے۔ تمام زندگی یہی وطیرہ رہا۔ اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کے بجائے دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں سے پیٹ بھرا جائے....... سچ ہے، جھوٹی شہرت کی بھوک کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ خدا رحم کرے۔

برصغیر کے ممتاز ماہر لسانیات و غالبیات سید قدرت نقوی گزشتہ دنوں ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ ان کے بارے میں ہمارے دوست معروف قانون دان، کالم نگار اور شاعر ظفر علی راجا کی خوبصورت تحریر بھی شامل اشاعت ہے۔ جناب نقوی مرحوم کی آخری تصنیف وہ کتابچہ ہے جو انھوں نے ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ'' کے عنوان سے لکھا تھا اور جس کا جواب معین الرحمٰن پر آج بھی قرض ہے۔ ایسے بہت سے دوسرے قرضہ جات کی طرح جن کی ادائی ان سا تہی دامن کبھی نہیں کر سکتا۔

........''سورج'' زندگی کی علامت ہے اور زندگی کے تمام رنگوں کا ترجمان، پھر بھی زیرِ نظر شمارے کا غالب رنگ، غالب، قرار پایا ہے۔ غالب دوستوں کو مبارک ہو۔

(اداریہ ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ جنوری ۲۰۰۱ء)

☆

خلیل الرحمٰن داؤدی کے انٹرویو سے اقتباس

سوال: پاکستان میں غالب شناسی کے باب میں ہونے والے کام سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

جواب: جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت غنیمت ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے مرتبہ ''دیوانِ غالب، نسخۂ لاہور'' کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے جس بحث کا آغاز کیا، اس تسلسل میں جن معتبر شخصیتوں کی کاوشیں منظر عام پر آئیں، وہ سرمایۂ غالبیات میں گراں قدر اضافہ ہے۔ جناب لطیف الزمان خاں صاحب، ڈاکٹر عارف ثاقب صاحب، سید قدرت نقوی صاحب وغیرہ نے اپنی نگارشات سے اس بحث میں حصہ لے کر بڑا اطمینان بخش مواد پیش کیا ہے۔ پاکستان سے درجہ اول کے کم از کم تین غالب شناس ایسے پیدا ہوئے جن کی نظیر، وہ خود ہیں۔ وہ غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام اور مالک رام ہیں۔ وہ تینوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نئی نسل کے لکھنے والوں میں بھی بڑی صلاحیتیں موجود ہیں جو سامنے آ رہی ہیں۔ بالخصوص ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی پہلی کوشش میں ہی غالب شناسی کا لوہا منوا لیا ہے اور انھوں نے برسوں میں حاصل ہونے والی منزل کو ایک زقند میں ہی پالیا ہے، جس کے لیے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن لائق تحسین و تبریک ہیں کہ اگر ان کا دیوان غالب نسخہ لاہور منظر عام پر نہ آتا تو ڈاکٹر تحسین فراقی کو بھی غالب شناسی کے سلسلے میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملتا۔

سوال: ان دنوں پاکستان میں دیوانِ غالب کے ''نسخۂ لاہور'' کے حوالے سے بحث مباحثے کی فضا گرم ہے۔ اسی ضمن میں آپ اپنے موقف سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے سلسلے میں میری رائے کا اظہار ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب ''دیوان غالب نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' میں کر چکے ہیں جس کے جواب میں ایک کتابچہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن بعنوان ''دیوانِ غالب نسخہ خواجہ۔ صحیح صورتِ حال'' شائع فرما چکے ہیں، لیکن سید صاحب موصوف نے فراقی صاحب

کے بے شمار وزنی اعتراضات میں سے کسی ایک اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا ہے، بلکہ

جواب خط پہ وہ غور مسلسل
لکیریں سی بنا کر رہ گئے ہیں

البتہ ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے اعتراضات کی کلیتاً تائید کے علاوہ مزید اعتراضات وارد کرتے ہوئے ملک کے مقتدر ارباب فضل و کمال نے اعلائے کلمتہ الحق کے ضمن میں غالب شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مثلاً لطیف الزماں خاں صاحب، ڈاکٹر عارف ثاقب صاحب، سید قدرت نقوی صاحب وغیرہ کی نگارشات لائق داد ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ان میں سے کسی کا جواب نہیں دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے اعتراضات اس درجہ مدلل، مثبت اور مسکت ہیں کہ سید صاحب کے پاس ان کا کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ علمی دنیا کے بڑے بڑے جغادری محققین سے ہمدردی ہے جنھوں نے ''نسخہ خواجہ'' کی کاوش ترتیب و تدوین کو داد دیتے ہوئے معین صاحب کی شان میں جو قصائد لکھے تھے اور معین صاحب نے ایسے ۷۰،۷۵ ممتاز اہل قلم کی آراء کو جمع کر کے ''نسخہ خواجہ تحسین و تجزیہ'' کے عنوان سے اپنی مستقل تصنیفات و تالیفات میں شامل کر لیا ہے۔ معین صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اتنے سنگین خوفناک، اندوہناک، کربناک، افسوسناک اور شرمناک اعتراضات کی دھول جلد ہی بیٹھ جائے گی۔ لوگ بھول جائیں گے اور میری کتاب ''نسخہ خواجہ۔ تحسین و تجزیہ'' باقی رہے گی اور آئندہ نسلوں کو یہی ملے گا۔ نسخہ خواجہ کے سلسلے میں اپنی رائے کے اظہار کے لیے میں ''السابق الاول'' ہوں جس نے سب سے پہلے یہ انکشاف کیا تھا کہ سید معین الرحمٰن صاحب نے جو نسخہ مرتب کیا ہے، وہ پنجاب یونیورسٹی والا وہی نسخہ ہے جس پر سید عبداللہ نے ''ماہ نو'' میں مضمون لکھا تھا۔ سید معین الرحمٰن نے یہ نسخہ کسی کباڑی سے خریدنے کی جو کہانی گھڑی ہے، وہ کذب بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کہانی میں دیوانِ غالب کے متنازعہ مخطوطے کے علاوہ تین مطبوعہ اور دو دوسرے مخطوطات بھی تھے۔ حالانکہ ان پانچوں کتابوں کا دیوانِ غالب سے کوئی تعلق نہ تھا، اور نہ نسخہ خواجہ کی ترتیب و تدوین میں ان میں سے کسی کتاب کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے، لیکن اس کے باوجود سید معین الرحمٰن صاحب نے ان پانچوں کتابوں کو بھی نسخہ خواجہ کے آخر میں اپنے ماخذات میں شامل کیا ہے۔ غالباً سید صاحب ''ماخذ''

کے معنی نہیں سمجھتے ہیں۔ مطلقاً غیر متعلق کتابوں کو ماخذات کی فہرست میں صرف وہی شخص شامل کر سکتا ہے جو اصول ترتیب متن کی مبادیات سے بھی بے بہرہ ہو گا۔ لطف کی بات ہے کہ سید صاحب موصوف نے ان غیر متعلق ۵ کتابوں میں سے ایک مخطوطہ ''معارج النبوۃ'' کی نسبت تحریر فرمایا ہے: ۔

''۴۔ فارسی مخطوطہ، معارج النبوۃ، (قلمی ۱۴۸۶ء) ملا معین الدین واعظ کاشفی (وفات ۱۵۰۱ء)''

سید معین الرحمٰن صاحب نے ''معارج النبوۃ'' کے سلسلے میں صرف یہی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سید معین الرحمٰن صاحب مخطوطات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ معلوم نہیں ''معارج النبوۃ'' کے مخطوطے کو اتنا نادر کیوں سمجھا ہے۔ وجہ ندرت تو کوئی بتائی نہیں۔ انھیں غالبًا علم نہیں کہ'' معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ'' متعدد بار شائع ہو چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی بکثرت دستیاب ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کا کوئی قلمی نسخہ اس وقت اہم و نادر ہوتا ہے جب کوئی وجہ ندرت ہو۔ مثلاً بخطِ مصنف ہو، کسی نامور عالم یا ممتاز خطاط کے قلم کا شہکار ہو یا قدیم الکتاب ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ''معارج النبوۃ'' کے سلسلے میں سید صاحب نے ایسی کسی ندرت کی نشان دہی نہیں فرمائی ہے۔ حد یہ ہے کہ مولف کا نام بھی غلط لکھا ہے۔ اس سلسلے میں دو مختلف شخصیتوں کے ناموں کو خلط کر دیا ہے۔ ''معارج النبوۃ'' کے مولف کا نام معین الدین محمد المشتہر بہ معین مسکین فراہی متوفی ۹۰۷ھ یا ۹۱۰ھ باختلاف اقوال ہے۔ معین الرحمٰن صاحب نے مولف معین الدین کے نام کے ساتھ ''واعظ الکاشفی'' لکھا ہے۔ یعنی آدھا نام صحیح ہے اور آدھا غلط، جو ایک دوسری معاصر شخصیت ملا حسین واعظ الکاشفی متوفی ۹۱۰ھ مولفِ ''تفسیرِ حسینی'' کا ہے۔ اس کے نام سے واعظ الکاشفی، نکال کر معین الدین کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ معین الدین، صاحب'' معارج النبوۃ'' فراہی تھے، ہروی تھے لیکن کاشفی ہرگز نہیں تھے۔ کاشفی تو ملا حسین واعظ ہی ہیں، معین الدین نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''معارج النبوۃ'' کے سامنے بریکٹ میں ''قلمی ۱۴۸۶ء'' لکھا ہے۔ اس زمانے میں سنہ کتابت عیسوی نہیں بلکہ ہجری مروج و مستعمل تھا اور ہجری سنہ ہی لکھا جاتا تھا۔ بے شک ۱۴۸۶ء/ ۸۹۱ھ کے مطابق ہے جو'' معارج النبوۃ'' کا سال تصنیف ہے نہ کہ سنہ کتابت۔ ''معارج النبوۃ'' کا دنیا بھر میں کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے جو ۱۴۸۶ء مطابق ۸۹۱ھ میں کتابت کیا گیا ہو۔ سید معین الرحمٰن

صاحب نے سنہ تصنیف ۸۹۱ھ کو جنتری کی مدد سے یا کسی کتاب سے ۱۴۸۶ء بنا کر ''قلمی ۱۴۸۶ء'' لکھ دیا۔ اسی طرح سید صاحب نے ملا معین الدین کے سامنے بریکٹ میں (وفات ۱۵۰۱ء) لکھ دیا ہے۔

وہی اعتراض یہاں بھی ہے کہ مولف کی وفات ۹۰۷ھ لکھنے کے بجائے ۱۵۰۱ء، لکھ دیا ہے۔ مولف کی وفات ۱۵۰۰ء / ۹۰۷ھ یا ۱۵۰۴ء/ ۹۱۰ھ باختلاف اقوال ہے۔ حاصل یہ کہ سید معین الرحمٰن صاحب نے ''معارج النبوۃ'' کے مخطوطے کے سلسلے میں اس کی کوئی وجہ ندرت و اہمیت بیان نہیں کی ہے اور جو معلومات مہیا کی ہیں وہ غلط ہیں۔ دراصل سید صاحب کسی مخطوطے کو سمجھنے اور اسے مرتب کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں، اسی لیے ان کے مرتبہ ''نسخۂ خواجہ'' میں لغزشوں کی بھرمار ہے، جن کی نشان وہی متعدد اہل قلم کر چکے ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ جنوری ۲۰۰۱ء)

☆

لطیف الزماں خاں کے انٹرویو سے اقتباس

میں نے وہی کچھ کیا ہے، جو عشق کا تقاضا تھا

سوال: غالب کے نام پر چوتھی جعلسازی کیا ہوئی؟

جواب: غالب کے ساتھ چوتھی جعلسازی لاہور میں ہوئی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیوان غالب کے دو نسخے تھے۔ ایک ''نسخہ لاہور'' اور دوسرا ''نسخہ شیرانی۔'' یہ دونوں نسخے وہاں سے پراسرار طور پر چوری ہو گئے۔۱۹۸۳ء میں جب میں علی گڑھ گیا تو مجھے پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے بتایا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ایک ایسے دیوانِ غالب کو چھپوانا چاہتے ہیں، جو خواجہ منظور حسین کی ملکیت ہے۔ اسلوب احمد انصاری کا کہنا تھا کہ خواجہ منظور حسین ساری عمر علی گڑھ میں رہے، انھوں نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا کہ ان کے پاس غالب کا کوئی مخطوطہ یا دیوان موجود ہے۔ اس لیے ہم نے علی گڑھ سے وہ دیوان شائع نہ کیا اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے معذرت کرلی۔ یہاں سے مایوس ہونے کے بعد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اس دیوان کو ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ نسخہ دراصل پنجاب یونیورسٹی سے غائب ہونے والا ''نسخہ لاہور'' ہے، جس کا تعارف ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی اپنے متعدد مضامین میں کرا چکے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن جلد ہی ''نسخہ شیرانی'' بھی کسی اور نام سے سامنے لے آئیں گے۔ حال ہی میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے، جس کا نام ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ اصل حقائق'' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ''نسخہ خواجہ'' درحقیقت ''نسخہ لاہور'' ہی ہے، جسے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چرا لیا گیا تھا۔ میں ڈاکٹر تحسین فراقی کو اس جرأت مندانہ تحقیق پر داد دیتا ہوں۔

سوال: گویا کہ آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے تحقیقی جعل سازی کی ہے؟

جواب: صرف یہی نہیں، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اور بھی بہت سے کمالات دکھائے ہیں۔ مثلاً وہ خود کو رشید احمد صدیقی کا شاگرد کہتے ہیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی ایک تصویر پیش کرتے ہیں جو سراسر جعلی ہے، کیونکہ رشید احمد صدیقی کبھی پاکستان نہیں آئے اور معین الرحمٰن بھارت نہیں گئے، پھر یہ تصویر کہاں اور کیسے بنی؟ ''نذر نظیر صدیقی'' نامی کتاب میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے لکھا ہے کہ انھوں نے لکھنو، علی گڑھ اور الٰہ آباد کی جامعات میں تعلیم پائی۔ میرے نزدیک اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا، کیونکہ معین الرحمٰن کبھی بھارت گئے ہی نہیں تو انھوں نے وہاں سے تعلیم کیسے حاصل کرلی۔ معین الرحمٰن نے پرتھوی چندر کی کتاب ''جاگیر غالب'' کو بھی اپنے نام سے چھپوا لیا تھا، جس پر میں نے ماہنامہ ''سورج'' لاہور کے غالب نمبر میں یہ کتاب اصل حالت میں شائع کر دی، جس نے اس سرقے کا پول کھول دیا۔ میں نے ''خطوط رشید احمد صدیقی'' جلد دوم کے دیباچے میں لکھا ہے کہ معین الرحمٰن نے ایک طالبہ بشریٰ باسط کے مقالے ''ادا جعفری، شخصیت و شاعری'' کو اپنے نام سے ''نقوش'' میں شائع کرایا ہے۔ معین الرحمٰن ابھی تک اس کی تردید نہیں کر سکے۔ معین الرحمٰن نے ایک کمال یہ بھی کیا کہ رشید احمد صدیقی کے ان خاکوں سے جملے اڑا کر، جو انھوں نے وفات پا جانے والی مختلف شخصیات پر لکھے، رشید احمد صدیقی پر ان کی وفات کے بعد خاکہ لکھ دیا۔ معین الرحمٰن کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس میں اقتباسات تو رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے لیے گئے ہوتے ہیں، لیکن دستخط نیچے معین الرحمٰن کے نظر آتے ہیں، تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ وہ تحریریں ان کی ہیں۔

سوال: کیا آپ خود کو غالب اور رشید احمد صدیقی کا دفاعی خدمت گار سمجھتے ہیں؟

جواب: میں یہ بات علی الاعلان کہتا ہوں کہ مجھے غالب سے عشق اور رشید احمد صدیقی سے عقیدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی انھی دونوں شخصیات کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ غالب یا رشید احمد صدیقی کے نام پر ہونے والی جعل سازیوں کو منظر عام پر لانا اس لیے ضروری ہے کہ ادبی تاریخ کا چہرہ مسخ ہونے سے محفوظ رہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک شخص دستاویزی طور پر سرقے، جعلسازی اور دھوکہ دہی کا مرتکب ثابت ہو چکا ہے، لیکن نہ تو پنجاب یونیورسٹی کا چانسلر اس کے خلاف کوئی

کارروائی کرتا ہے اور نہ پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین اس سے باز پرس کرتا ہے کہ ادبی بددیانتی کرنے والا شخص کیونکر پبلک سروس کمیشن میں بیٹھ کر دیانتدارانہ فیصلے کر سکتا ہے۔

(مطبوعہ "میگزین" روزنامہ "پاکستان"۔ ۱۴ مئی ۲۰۰۰ء)

☆

ظفر علی راجا کے مضمون سے اقتباس

.... ان کی زندگی کا آخری غالب معرکہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ساتھ برپا ہوا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ۱۹۹۸ء میں دیوانِ غالب کے ایک مخطوطے کو ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ'' کے نام سے مدون کیا تو غالبیات کے بہت سے طالب علموں نے اس کام کی تحقیقی دیانت پر انگشت تنقید بلند کی اور موقف اختیار کیا کہ ''نسخۂ خواجہ'' دراصل پہلے سے دریافت شدہ ''نسخۂ لاہور'' ہی کا ایک مسروقہ ایڈیشن ہے۔ سید قدرت نقوی نے نسخہ خواجہ کو چیلنج کرنے والے احباب قلم خلیل الرحمٰن داؤدی، ڈاکٹر حنیف نقوی، رشید حسن خان اور تحسین فراقی کے موقف کی حمایت میں ایک طویل تحقیقی جائزہ سپرد قلم کرکے شائع کروایا۔ یہ کتابچہ ان کی موت سے چار ماہ قبل شائع ہوا تو انھوں نے اس کے اولین نسخوں میں سے ایک نسخہ بطور خاص کراچی سے میرے نام لاہور بھجوایا۔ قدرت نقوی نے اس تحقیقی کتابچے میں مضبوط ولائل کے ساتھ ''نسخۂ خواجہ'' کو ایک مصلحت آمیز اور فاش لغزش قرار دیا ہے۔

ابھی ملک بھر کے ادبی اور علمی حلقوں میں قدرت نقوی کے اس آخری غالب معرکے کی گونج ''غالب آگہی'' کے نئے مباحث کے دروازے کھول ہی رہی تھی کہ انھیں قدرت کی طرف سے آخری بلاوا آگیا۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ جنوری ۲۰۰۱ء)

☆

”غالب کے نام ایک خط“

مبین مرزا

.... ہاں آخر میں آپ کی تالیف قلب کے لیے یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ وہ جو نسخہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے ”نسخۂ خواجہ“ کے نام سے دریافت کیا ہے، اس پر یہاں خاصی لے دے ہوئی۔ اول اول اس کی پذیرائی ہوئی، ڈاکٹر معین الرحمٰن نے جو داد تحقیق دی، اس پر لوگوں نے خوب داد کے ڈونگرے برسائے، لیکن اسی دوران کسی طرف سے ایک آواز اٹھی کہ یہ نسخہ نئی دریافت نہیں تھا، مال مسروقہ ہے۔ اس پر پر یار لوگ خم ٹھونک کر تحقیق میں جٹ گئے۔ کئی ایک نے کام کیا اور سبھی کم و بیش ایک نتیجے پر پہنچے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ بھائی تحسین فراقی، کہ جامعہ پنجاب میں استاد ہیں اور استادوں کی جوتیاں سیدھی کیے اور محبتیں اٹھائے ہوئے ہیں، وہ بھی اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوئے۔ قیام لاہور کے زمانے سے ان سے گاڑی چھنتی ہے، میں ان کا مزاج آشنا ہوں۔ وہ محقق بھی ہیں اور منطقی بھی۔ سو انھوں نے تحقیق کے بعد اس نسخے کے نئی دریافت ہونے کے رو اور مال مسروقہ ہونے کے ثبوت میں ایک مدلل رسالہ رقم کیا، اور خوب رقم کیا۔ اہل نظر نے داد دی کہ بھئی واہ واہ! تحسین فراقی آپ سے یک گونہ محبت رکھتے ہیں اور سچ کہتا ہوں کہ انھوں نے اس تحقیق میں حقیقی محبت کا ثبوت دیا۔ وہ کام جو آپ کی آل اولاد میں (بشمول بھائی جمیل الدین خاں عالی اور میں) کوئی نہ کر سکا، وہ تحسین فراقی نے کیا؛ اور اپنوں سے بڑھ کر نبھائی۔ اس کے بعد ایک واقعہ اور ہوا۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے تحسین فراقی کے رسالے کے رو میں ایک رسالہ سپرد قلم کیا جو عذر گناہ کا مصداق ٹھہرا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تحسین فراقی کے مدلل اور تحقیقی دلائل

اور اعتراضات کا جواب کوسنوں اور طعنوں سے دیا۔ لیجیے! ایک موقع اور یاروں کے ہاتھ آ گیا۔ جو پہلے نہ ہوئی ، اب وہ تھڑی تھڑی بھی ہوئی، اور اب سنا ہے کہ ہندوستان سے بھی کچھ ایسے ثبوت فراہم کر لیے گئے کہ اس کے بعد تو کسی کو بھی تحسین فراقی کے موقف کو درست ثابت کرنے میں کوئی تامل نہیں رہے گا۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ فروری ۲۰۰۱ء)

☆

"انجمنِ تحفظ ناموسِ غالب و رشید احمد صدیقی" کی جانب سے سنہ ۲۰۰۰ء میں کچھ پمفلٹ اہل علم ادیبوں اور دانشوروں کو بھجوانے گئے۔ آج تک معین الرحمن ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ یہ پمفلٹ اہل علم و ادب کو دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں اور معین الرحمن کی جعلساری کا پردہ بھی چاک کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

اہل علم و ادب کو مژدہ ہو

اہل علم و ادب کو مژدہ ہو کہ پہلی بار ڈاکٹر معین الرحمٰن نے لب کشائی کی ہے اور ''دیوان غالب نسخہ خواجہ'' کے حوالے سے اٹھائے گئے سوالات اور کیے گئے اعتراضات کا ضمناً جواب دیا ہے، جو جواب کم اور جعل سازی کا اعتراف زیادہ ہے۔ اللہ عمر دراز کرے ڈاکٹر تحسین فراقی کی! کہ انھوں نے ادب پر اور تاریخ ادب پر احسان کیا اور ایک علمی و تحقیقی بحث کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''دیوان غالب نسخہ خواجہ'' جسے ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی جعلی سازی سے مرتب کر دیا ہے، کے جواب میں ایک مدلل اور نہایت واضح اعتراضات پر مبنی ایک مختصر کتاب تحریر کی، جس کا عنوان تھا ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق۔'' ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اِس کے جواب میں ایک کتابچہ تحریر کیا، عنوان تھا ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ صحیح صورتِ حال۔'' ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس کتابچے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے کسی اعتراض اور کسی سوال کا جواب واضح طور پر نہیں دیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے مدلل اور علمی انداز اپنایا، جبکہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے عامیانہ انداز اپناتے ہوئے منہ سے جھاگ اڑائی ہے۔ اپنے اس مختصر کتابچے کو ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ایک دفعہ پھر دوسروں کے اقتباسات سے بھر دیا ہے، اور جملۂ معترضہ کے طور پر اپنی چند سطریں بھی لکھ دی ہیں۔ دراصل معین الرحمٰن صاحب ''علمی دمے'' کے دائمی مریض ہیں۔ ایک جملہ لکھ کر ان کی سانس پھول جاتی ہے اور وہ فوراً کسی دوسرے کے اقتباس یا قول کا سہارا لیتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے ایک دمے کے مریض کو مصنوعی آکسیجن کا سہارا لینا پڑتا

ہے۔ معین الرحمٰن صاحب کی مرتبہ کتب کی ایک طویل نام نہاد فہرست میں سے اگر ان کے اپنے جملے نکالے جائیں تو شائد مشکل سے ایک ایسا ہی کتابچہ تیار ہو سکے گا جیسا انھوں نے ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' کے سلسلے میں تحریر کیا ہے۔ باقی ان کا سارا کام دوسروں کا کیا ہوا ہے جسے انھوں نے بار بار اپنی مرتبہ کتابوں میں قینچی اور گوند کی مدد سے لگایا ہوا ہے۔

ذرا ایک نظر ان کے مذموم کارناموں پر ڈال لیجیے۔ یہ کارنامے نہیں، اہلِ علم و ادب کے ذہنوں میں سلگنے والے سوال ہیں۔ کیا ڈاکٹر معین الرحمٰن پوائنٹ ٹو پوائنٹ ان کے جواب دیں گے؟

۱۔ ''دیوان غالب، نسخہ خواجہ'' کے سلسلے میں یہ تو معین الرحمٰن نے تسلیم کیا ہے کہ عرشی صاحب کا نسخہ عرشی طبع دوم ''اپنے مشمولات اور کوائف کی تفصیل کے اعتبار سے زیرِ نظر نسخہ خواجہ کے کم و بیش عین مطابق ہے۔'' ''قاضی عبدلودود نے مخطوطہ ''دیوان غالب'' (کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور) کے بارے میں جو تصریحات رسالہ ''نقوش'' (لاہور۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء) میں پیش کی ہیں، بڑی حد تک ''نسخہ خواجہ'' پر صادق آتی ہیں۔''

دراصل ''مخطوطہ دیوان غالب، کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور سے چوری ہو گیا اور ''نسخہ شیرانی'' بھی غائب ہو گیا۔'' ڈاکٹر معین الرحمٰن جسے ''نسخۂ خواجہ'' کہہ رہے ہیں، وہ دراصل مخطوطہ ''دیوانِ غالب'' کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور ہی ہے۔ کیا عجب کچھ عرصہ کے بعد ایک اور ''دیوانِ غالب'' مرتب کیا جائے اور وہ نسخہ شیرانی ہو۔ اب ایسی مشینیں آ گئی ہیں کہ کوئی بھی شخص باآسانی ''فتح دین'' کے نیچے دانش گاہ پنجاب لاہور کی مہر دیکھ اور پڑھ سکتا ہے۔ یہ غالبیات کے سلسلے میں سب سے بڑی اور تازہ جعلسازی ہے۔

۲۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے غالب کے چار جعلی خطوط بھی متعارف کروائے ہیں۔ یہ خطوط ان کے تعارف کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ جاوید طفیل صاحب ایڈیٹر ''نقوش'' نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پاس علائی کی ڈائری ہے۔ اس میں یہ چار خطوط موجود ہیں۔ آفاق حسین

آفاق نے ۱۹۴۹ء میں ''نادراتِ غالب'' کے نام سے خطوط کا مجموعہ شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ معین الرحمٰن کہتے ہیں کہ اگر ان کے متعارف کردہ خطوط جعلی ہیں تو ''نادراتِ غالب'' کے خطوط بھی جعلی۔ کہیے کیسا جواز ہے؟ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے ''غالب نامہ'' دلی میں، متعارفہ خطوط کے بارے میں سوال اٹھایا کہ source کیا ہے؟ فوراً ہی معین الرحمٰن کو ایک کباڑیہ مل گیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' کا source کوئی نامعلوم کباڑیہ ہے۔ کیا معین صاحب اتنا بھی نہیں جانتے کہ تحقیق میں دستاویزات پیش کرنے کے لیے شہادتوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ ورنہ تحقیق، تحقیق نہیں جعلی سازی شمار ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ معین صاحب کو کباڑیے کہاں سے مل جاتے ہیں؟ وہ کبھی تو خود کو گمنامی میں بیٹھ کر کام کرنے والوں میں شمار کرتے ہیں اور ہجوم سے گھبراتے ہیں اور کبھی یہ کہتے ہیں ''برسوں اپنے شوق کی چیزوں کی تلاش میں چلتے پھرتے کتابوں کے ان ڈھیروں کی خاک چھانی ہے اور گوہر مراد پائے ہیں۔'' کیا کسی نے انھیں اس طرح چلتے پھرتے اور خاک چھانتے دیکھا ہے؟ انارکلی کے فٹ پاتھ پر جمعہ اور اتوار کو گوہر مراد پانے والے نظر آ ہی جاتے ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا تو کتاب سے کوئی رشتہ، کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔ ''نسخۂ خواجہ'' اور خطوطِ غالب کے حوالے سے وہ کباڑیے کا نام اور پتا بتائیں گے؟

۳۔ پرتھوی چندر کی کتاب ''جاگیر غالب'' کو ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنے نام سے شائع کیا۔ لاہور سے شائع ہونے والے ''سورج'' کے ''غالب نمبر'' میں اصل ''جاگیرِ غالب'' شائع ہو چکی ہے۔ اسے دیکھ لیں اور اسی میں معین الرحمٰن کے نام لطیف الزماں خان کے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں۔ آج تک ڈاکٹر معین الرحمٰن کو ان کا جواب دینے کی ہمت اور اخلاقی جرات نہیں ہوئی۔

۴۔ ''غالب اور انقلابِ ستاون'' ڈاکٹر معین الرحمٰن کی کتاب نہیں ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے نہیں کیا۔ یہ ہمارا چیلنج ہے۔ اصل صورتحال یہ ہے کہ یہ ترجمہ پہلی بار دلی یونیورسٹی کے مجلّہ ''اردوئے معلیٰ'' غالب نمبر۲ میں شائع ہوا، جسے معین الرحمٰن نے

اپنے نام سے شائع کر لیا، اور یہ تاثر دیا کہ جیسے ''دستنبو'' کا ترجمہ انھوں نے کیا ہے۔ یہ کتاب غالب انسٹیٹیوٹ دلی سے بھی شائع ہوئی ہے، جس سے یہ عقدہ کھلا ہے کہ یہ ترجمہ نامور محقق رشید حسن خان صاحب کا کیا ہوا ہے۔ معین الرحمٰن نے جعل سازی سے اسے اپنے نام سے شائع کیا۔

غالب کو سمجھنا ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بس میں نہیں۔ وہ نہ تو شعر وزن میں پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی تفہیم کر سکتے ہیں۔ ایسا شخص غالب شناس ہونے کا دعوٰی کیونکر کرسکتا ہے۔ اردو کو چھوڑیئے! غالب کا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔ کیا معین الرحمٰن فارسی سمجھتے ہیں؟ اُن کے دور کے ایم۔اے۔ میں ۱۰۰ نمبر کے فارسی کے پرچے کا ہونا اور بات ہے، فارسی کو جاننا اور سمجھنا اور بات ہے۔ معین الرحمٰن صاحب فارسی کی الف ب نہیں جانتے۔ اگر جانتے ہیں تو وہ غالب کے فارسی کلام کی شرح تحریر کریں، اور اگر ہو سکے تو اردو کی بھی۔ غالب کی تفہیم میں کوئی تنقیدی مضمون لکھیں۔ محض لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین کو اکٹھا کر کے غالب شناس نہ بنیں۔

غالب کے بعد ڈاکٹر معین الرحمٰن کو رشید احمد صدیقی صاحب سے بھی عقیدت اور محبت ہے۔ ذرا اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ رشید احمد صدیقی نے جن مرحومین کے خاکے لکھے اور اظہار غم کیا، معین الرحمٰن نے رشید احمد صدیقی کی ایسی تحریروں سے جملے اڑائے، ایک عبارت ترتیب دی اور رشید احمد صدیقی کے انتقال پر اس عبارت کو اپنے نام اور حوالے سے چسپاں کر دیا۔

۲۔ رشید احمد صدیقی کی تصویر کے ساتھ اپنی تصویر جعل سازی سے بنائی اور مرحوم کی کتاب ''جدید اردو غزل'' کی پشت پر شائع کی۔ جب لوگوں نے احتجاج کیا تو اب معین الرحمٰن یہ کہہ رہے ہیں کہ ''میں نے رشید صاحب کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی تیار کی۔ اس پر مجھے قریب اور دور کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی داد ملی۔'' معین الرحمٰن صاحب چونکہ ایسا کام بڑی ہنرمندی کے ساتھ کر لیتے ہیں اس لیے انھیں ہمارا مشورہ ہے کہ وہ ''مادھوری ڈکشٹ'' کے ساتھ بھی اپنی ایک تصویر اسی طرح تیار کر لیں۔ انھیں قریب اور دور کے خوش ذوق

دوستوں اور خاص طور پر بزرگوں سے بڑی داد ملے گی۔ (افسوس! صد افسوس!)

۳۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی جہالت کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء میں رشید احمد صدیقی کا مضمون ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا'' شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ بے مثل عبارت ہے:

''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا
تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اردو اور تاج محل''

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے در مدح خود بقلم خود ایک انٹرویو تحریر کیا اور اس عبارت کو بجنوری سے منسوب کیا۔ یہ انٹرویو ''قومی زبان'' کراچی میں شائع ہوا۔ جس شخص کو یہ علم نہیں کہ یہ عبارت بجنوری کی نہیں، رشید احمد صدیقی مرحوم کی ہے، وہ رشید احمد صدیقی سے عقیدت کا اظہار کیا کرے گا؟ وہ رشید احمد صدیقی کو پڑھنے اور پڑھانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی!!

اب چند اور جعلسازیاں اور جہالتیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ نومبر ۱۹۹۸ء میں ایک کتاب شائع ہوئی۔ نام تھا ''نذر نظیر''۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۷۱ پر ڈاکٹر معین الرحمٰن کا مضمون بعنوان ''نظیر صدیقی بے مثل و بے نظیر'' شائع ہوا۔ مضمون یوں شروع ہوتا ہے: ''مجھے لاہور، الہ آباد، لکھنؤ اور بعض دوسری جامعات میں اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔'' ڈاکٹر معین الرحمٰن زندگی میں کبھی ہندوستان نہیں گئے، پھر انھوں نے علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ اور بعض دوسری جامعات میں اساتذہ سے کیسے پڑھا؟ کیا معین الرحمٰن بتائیں گے؟

۲۔ ایم۔اے۔ اردو کی طالبہ بشریٰ باسط کا مقالہ ''ادا جعفری شخصیت اور شاعری'' کو معین الرحمٰن نے ''نقوش'' میں اپنے نام سے شائع کیا۔ اس کا جو جواز انھوں نے اپنے تازہ کتابچے میں تحریر کیا ہے، وہ اخلاقی و قانونی اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ اگر اس مقالے کے کچھ ابواب ڈاکٹر معین الرحمٰن نے تحریر کیے (جس کا انھوں نے تاثر دیا ہے، ہر چند کہ وہ یہ لکھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے) تو پھر بھی انھوں نے جرم کیا ہے، کہ مقالہ لکھ کر دینا اساتذہ کا کام نہیں ہوتا۔ یہ ایسے ہی

ہے جیسے کمرہ امتحان میں استاد شاگرد کو پرچہ حل کروائے۔ مقالہ بھی ۲۰۰ نمبر کا ہوتا ہے اور امتحان کا حصہ ہوتا ہے۔ اور اگر وہ مقالہ طالبہ نے خود لکھا (جس پر اسے ایم۔اے۔ اردو کی ڈگری جاری ہوئی) تو ڈاکٹر معین الرحمٰن کا اسے اپنے نام سے شائع کروانا جرم ہے۔ کسی بھی صورت میں ڈاکٹر معین الرحمٰن بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو کو اس جرم کا نوٹس لینا چاہیے۔ ورنہ لوگ دوسروں کے مقالوں کو اپنے نام سے شائع کرواتے رہیں گے۔

یہ تو بڑی بڑی علمی جعل سازیاں ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن ہر قسم کی جعل سازی کا دوسرا نام ہے۔ گورنمنٹ کالج جیسے ادارے کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی لائبریری سے کتاب نکلوا کر وہیں فروخت کے لیے بھجوا دینا، گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو کے تحقیقی مجلّے ''تحقیق نامہ'' کو اپنی تصنیفات و تالیفات کی فہرست میں شامل کرنا، ''تحقیق نامہ'' شائع کرنے کے تمام اخراجات گورنمنٹ کالج لاہور کے۔ معین الرحمٰن اس خرچ سے ہونے والی کمپوزنگ اور جڑی ہوئی کاپیاں اڑا کر ایک کتاب بناتے ہیں۔ مضمون وہی جو ''تحقیق نامہ'' میں شائع ہوئے ہیں۔ مرتب کے طور پر اپنا نام لکھتے ہیں۔ کتاب شائع ہو جاتی ہے۔ خرچہ گورنمنٹ کالج لاہور کا، مضمون لوگوں کے، کتاب معین الرحمٰن کی۔ (''نقوش غالب'' مرتبہ ڈاکٹر معین الرحمٰن، اور ثبوت کے لیے ''تحقیق نامہ'' شمارہ ۳،۴: ۱۹۹۴ء، ۱۹۹۵ء)۔ کیا یہ جعل سازی نہیں؟

سرکار کی طرف سے انھیں دس بیس ہزار کی رقم امداد کے طور پر ملتی ہے، وہ اپنے کارناموں میں اسے ''صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی'' کہتے ہیں، اور یہ تاثر دیتے ہیں جیسے یہ ''صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی'' ہو۔ کیا انھیں ''صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی'' مل چکا ہے؟ یہ سوال محترم محمد حسین ملک سے بھی ہے جنھوں نے روزنامہ جنگ ۲۰ مئی ۲۰۰۰ء میں ان کی مدح میں کالم لکھا۔ محمد حسین ملک صاحب کے بقول وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے ''دل کی کتاب'' پر تبصرہ کر دیا ہے۔ بقول ان کے وہ ایم۔اے۔ اردو بھی ہیں، مگر اس کالم کے آخر میں جو شعر درج ہے، وہ بھی بے وزن ہے: ''کبھی کبھی اسے پڑھا کیجیے'' کی بجائے ''گاہے گاہے اسے پڑھا کیجیے'' موزوں

ہے۔ محمد حسین ملک صاحب اسے درست کر لیں۔ ان کے استاد اسے درست نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا اپنا ادبی وزن درست نہیں ہے۔ انھیں صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی بھی نہیں ملا۔ ان کی تو کارکردگی ہی مشکوک ہے۔

اہل علم کو مژدہ ہو کہ اب خاموشی کا پردہ چاک ہو گا اور علم و ادب کے ساتھ جعل سازی کرنے والا ہر جعل ساز پیوند خاک ہو گا!

منجانب!

انجمنِ تحفظِ ناموسِ غالب و رشید احمد صدیقی

☆

محققینِ اردو کے لیے خوشگوار خبر

باوثوق ذرائع سے علم ہوا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے چرایا ہوا دیوان غالب کا نسخۂ لاہور (جسے وہ ابھی تک نسخۂ خواجہ کہہ رہے ہیں) وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کو واپس کر دیا ہے۔ واپسی کا طریقہ معین صاحب کا اپنا روایتی طریقہ تھا۔ سنا ہے نسخے کو سجا بنا کے واپس کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے ۲۳ اگست ۲۰۰۰ کو اس نسخے کی واپسی کے بعد روزنامہ ''دن'' لاہور میں جو کالم لکھا اس کی یہ سطور بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہیں: ''کیا کوئی کسی اغوا شدہ لڑکی کو اس کے باپ کے گھر اس طرح لے جاتا ہے کہ وہ دلھن بنی ہوئی ہو جبکہ اس کے ساتھ دو بچے بھی ہوں۔'' دیوان غالب، نسخۂ لاہور اغوا شدہ دلھن تھی جسے واپس کر دیا گیا ہے۔ محققینِ اردو کے لیے تحقیق کے در وا ہوتے ہیں۔ سچ ثابت ہونے کی گھڑی آن پہنچی۔ پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی رپورٹ وائس چانسلر صاحب کو پہنچ گئی ہے۔ الزام ثابت ہو چکا ہے۔ جرم ثابت ہونے کو ہے۔ نسخے کی واپسی کے وقت تصویریں کھینچی گئیں۔ سب جانتے ہیں کہ معین صاحب کو تصویریں ''بنانے'' کا بہت شوق ہے۔ رشید احمد صدیقی کے ساتھ ان کی تصویر کھینچی نہیں گئی تھی، بنائی گئی تھی۔ سنا ہے نسخے کی واپسی کے وقت معین صاحب کے ساتھ عبدالجبار شاکر صاحب بھی تھے۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ عبدالجبار شاکر صاحب بھی ایسے کاموں میں مہارت رکھتے ہیں۔ حضرات! ایک کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ کتاب کا نام ہے ''پاکستان لوٹنے والے۔'' مصنف مجاہد حسین ہیں۔ اس کتاب کو پہلی بار ادارہ تخلیقات لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب کے اب تک کل پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن پرنٹ لائن لاہور سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۰۵ پر یہ عنوان ہے ''پنجاب پبلک لائبریری کو کس نے لوٹا۔'' صفحہ ۱۰۸ تک مطالعہ فرمائیں۔ عبدالجبار شاکر کی حقیقت کھل جائے گی۔ پاکستان لوٹنے والوں کی اس کہانی میں عبدالجبار شاکر صاحب کا بھی ذکر ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ یہ ذکر بھی لائبریری سے نادر نسخے چوری کرنے کے حوالے سے

ہے۔ اب ایک مخطوطہ چوری کرنے والا، مخطوطہ چوری کرنے والے کا ساتھ نہ دے تو کیا کرے؟ چنانچہ اگر شاکر صاحب معین صاحب کے ساتھ گئے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیونکہ معین صاحب کے ساتھ کوئی ایسا آدمی تو نہیں جا سکتا تھا جس نے ماضی میں کوئی مخطوطہ چوری نہ کیا ہو۔ بہرکیف اب ''دیوانِ غالب، نسخہ لاہور'' برآمد ہو چکا ہے۔ محققینِ اردو کے لیے راستہ کھل گیا ہے۔ مخطوطہ شناس حضرات لائبریری میں اسے دیکھ سکتے ہیں اور اس حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں کہ وہ بزرگوں کا متعارف کروایا ہوا ''نسخۂ لاہور'' ہے یا معین الرحمٰن کی جعل سازی سے مرتب کیا گیا ''نسخۂ خواجہ''۔ عبدالجبار شاکر صاحب چونکہ ڈائریکٹر لائبریریز پنجاب بھی ہیں، لہٰذا معین الرحمٰن کے مرتب کردہ ''دیوان غالب، نسخۂ خواجہ'' کے جعلی نسخے کی فروخت میں بھی وہ معاون ثابت ہوئے۔ اس نسخے کی فروخت سے جو رقم معین الرحمٰن نے حاصل کی وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اعلیٰ حکام کو واپس لینی چاہیے اور انھیں اس کے مزید ایڈیشن شائع کرنے سے منع کرنا چاہیے، کیونکہ قانونی طور پر معین الرحمٰن یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر اس کا ایک صفحہ بھی شائع نہیں کر سکتے۔ اگر یونیورسٹی حکام نے اس طرف فوری توجہ نہ کی تو مداحینِ غالب، عدالت سے رجوع کریں گے۔

محققین اردو کے لیے ایک خوشگوار خبر یہ بھی ہے کہ ''ادا جعفری، شخصیت اور شاعری'' کے موضوع پر لکھے جانے والے ایم اے اردو کی طالبہ بشریٰ باسط کے مقالے (جسے معین الرحمٰن نے اپنے نام سے شائع کر لیا تھا) پر بھی تحقیقات مکمل ہو چکی ہیں۔ ہمارا یونیورسٹی حکام سے مطالبہ ہے کہ ان دونوں علمی جرائم کے حوالے سے معین الرحمٰن کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی جائے۔ جیسا کہ ادیب اور دانشور حضرات اس کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی کتاب ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' صفحہ ۶۰ کے آخر پر یہ امید ظاہر کی تھی: ''رہی یہ بات کہ اس قلمی نسخے کی بازیافت کب تک ممکن ہے، سو اس باب میں غالب کا یہ شعر بڑی امید دلاتا ہے

دیکھیے پاتے ہیں ''عشاق'' بتوں سے کیا ''فیض''
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے''

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کو مبارک ہو کہ اُن کی جدوجہد رنگ لائی اور غالب

کے عشاق نے بتوں سے فیض حاصل کر لیا۔ دیوان غالب نسخہ لاہور کی بازیافت ہوئی۔
دم توڑتی ہوئی بیسویں صدی کا یہ آخری برس اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے!

منجانب
انجمنِ تحفظِ ناموسِ غالب و رشید احمد صدیقی

☆

پنجاب یونیورسٹی رجسٹرار کے متنبہ کرنے کے باوجود

''نسخۂ خواجہ'' ڈی لکس ایڈیشن کی مذموم اشاعت

ایک اطلاع کے مطابق ڈاکٹر معین الرحمٰن (صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور) نے ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ'' (جو درحقیقت ''نسخۂ لاہور'' ہے) کے متنازعہ نسخے کو ڈی لکس ایڈیشن کا روپ دے کر پھر شائع کر دیا ہے۔ اس نسخے کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد جو ہنگامہ اُٹھا تھا، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی حکام نے واضح طور پر معین الرحمٰن کو ہدایات جاری کی تھیں کہ اب وہ اس نسخے کا ایک صفحہ بھی یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر شائع نہیں کر سکتے، مگر ان احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے معین الرحمٰن نے اسے شائع کیا۔ اس بات کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ یہ ڈی لکس ایڈیشن شائع ہونے کے بعد پاکستان کے کسی بک سٹال پر فروخت کے لیے نہیں رکھا گیا۔ صرف چند لوگوں کو اعزازی طور پر بھجوایا گیا ہے، یا بیرونِ ملک فروخت کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق عبدالوہاب خاں سلیم (جو ان دنوں نیویارک امریکا میں مقیم ہیں اور جن کے مالی اشتراک کے ساتھ ڈی لکس ایڈیشن شائع ہوا ہے) اس نسخے کی فروخت کر رہے ہیں جس کی قیمت -/1490 روپے رکھی گئی ہے۔

عبدالوہاب خاں سلیم کے حوالے سے حیرت انگیز معلومات سامنے آئی ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ان دنوں لائبریری اسسٹنٹ تھے جب یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری کیا گیا۔ اس قیمتی نسخے کے یونیورسٹی لائبریری سے غائب ہو جانے کے حوالے سے ایک اور کردار بے نقاب ہوتا ہے۔ اب معین الرحمٰن اور عبدالوہاب خاں سلیم مل کر اس نسخے سے کثیر رقم کما رہے ہیں۔ وہ رقم جو دراصل پنجاب یونیورسٹی کا حق ہے۔

سوال یہ ہے کہ معین الرحمٰن نے اس ڈی لکس ایڈیشن کو فروخت کے لیے پاکستان

کے کسی بک سٹال پر کیوں نہیں دیا؟ صرف اس لیے کہ یونیورسٹی حکام نے اس کی دوبارہ اشاعت پر پابندی لگائی تھی اور معین الرحمٰن کو ڈر ہے کہ کہیں یونیورسٹی حکام اس کی اشاعت پر نوٹس نہ لے لیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اپنے ایک تازہ بیان میں (جو روزنامہ ''پاکستان'' لاہور میں ۱۷ جنوری ۲۰۰۱ء کو جلی حروف میں شائع ہوا) یہ اعتراف کیا ہے کہ معین الرحمٰن نے دیوانِ غالب کا اصل مخطوطہ مجھے پیش کرتے ہوئے مجھے دھوکے میں رکھا اور یہ کہا کہ یہ میری دریافت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ معین الرحمٰن نے علم و ادب کے ساتھ بے وفائی کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے مخطوطے کا بغور جائزہ لیا تو اس میں واقعی ٹمپرنگ کی گئی تھی۔ وائس چانسلر صاحب کے اس اعتراف کے بعد دیوان غالب نسخہ خواجہ کے ''نسخہ لاہور'' ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا اور اس میں بھی کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ یہ یونیورسٹی ہی کا مسروقہ نسخہ ہے جو معین الرحمٰن سے برآمد ہوا ہے۔ یونیورسٹی حکام کو ڈی لکس ایڈیشن کی اشاعت پر فوری نوٹس لیتے ہوئے معین الرحمٰن کے خلاف باضابطہ طور پر مقدمہ درج کروانا چاہیے۔

ڈی لکس ایڈیشن کے حوالے سے معین الرحمٰن کی تازہ بدحواسیاں اور اپنے جرم کے اعتراف کے متعدد شواہد بھی منظر عام پر آئے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ چوری کرنے والا اپنے جرم کے نشانات ضرور چھوڑ جاتا ہے یا چھوڑتا رہتا ہے۔ یہ تازہ بدحواسیاں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ''دیوانِ غالب، نسخہ ٔ خواجہ'' کے پہلے ایڈیشن (جسے مکتبہ اعجاز لاہور نے شائع کیا) میں صفحہ نمبر ۲۲ کی اختتامی سطور چھیلی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہاں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایکسیشن نمبر ۶۸۱۲ تھا۔ یہ چھیلی ہوئی سطور واضح طور پر اس پہلے ایڈیشن میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ڈی لکس ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کے برعکس معین الرحمٰن نے صفحہ نمبر ۲۲ کی کھرچی ہوئی جدولوں کو دوبارہ بنا دیا ہے۔ گویا اب اس تازہ ایڈیشن میں چھیلی ہوئی سطور پُر کر دی گئی ہیں تاکہ قارئین کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ یہاں جعل سازی کی گئی ہے۔ معین الرحمٰن نے ان دونوں نسخوں کے اس اختلاف کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ کیا یہ ان کا اعتراف جرم نہیں ہے؟ اگر نہیں تو کیا وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ پہلے ایڈیشن

میں سطور کیوں کھرچی گئی ہیں اور ڈی لکس ایڈیشن میں کیوں انھیں برابر کر دیا گیا ہے؟

۲۔ معین الرحمٰن نے اس نئے ڈی لکس ایڈیشن کے دیباچے، حواشی اور فارسی متن کے ترجموں میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے تمام اعتراضات کو قبول کرتے ہوئے تصحیح کر دی ہے۔ کیا یہ ان کا اعترافِ جرم نہیں ہے؟ اس کے بعد اس کتابچے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے جو ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچے کے جواب میں انھوں نے لکھا؟

۳۔ ڈی لکس ایڈیشن میں معین الرحمٰن نے پہلے ایڈیشن کے برعکس صرف اصل متن دیا ہے، نستعلیق کتابت نہیں دی۔ یہ صرف اس لیے کہ معین الرحمٰن نے نستعلیق کتابت دیتے ہوئے بے پناہ غلطیاں کی تھیں۔ کیا یہ ان کا اعترافِ جرم نہیں؟

۴۔ نئے ایڈیشن کے آخر پر ۵ صفحات پر مشتمل کسی سے لکھوایا ہوا معین الرحمٰن کا مضحکہ خیز انگریزی دیباچہ بھی شامل ہے، تاکہ بیرون ملک لوگ اسے پڑھ سکیں، جہاں یہ فروخت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ دیباچہ پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے۔

۵۔ اس تازہ ایڈیشن پر اشاعت کی تاریخ اگست ڈالی گئی ہے جو غلط ہے۔ نسخہ کہیں نومبر میں شائع ہوا۔

۶۔ پہلا ایڈیشن مکتبہ اعجاز لاہور سے شائع ہوا۔ یہ تازہ ایڈیشن الوقار پبلی کیشنز لاہور (معین الرحمٰن کا ذاتی اشاعت کا ادارہ) سے شائع ہوا۔ یہ پہلے ایڈیشن کے برعکس ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یعنی اسے مختصر کر دیا گیا ہے۔ کیا اس کا تیسرا ایڈیشن اتنا مختصر ہوگا کہ یہ نظر بھی نہیں آئے گا؟

قارئین!

ڈاکٹر معین الرحمٰن سے سیدھے سیدھے یہ تین سوال ہیں۔

۱۔ انھوں نے تازہ ایڈیشن میں صفحہ نمبر ۲۲ کی اختتامی سطور کو اپنے پہلے ایڈیشن کے برعکس پُر کیوں کیا؟

۲۔ انھوں نے اپنے پہلے دیباچے میں ترمیم کیوں کی؟ اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کو بغیر حوالہ دیے دور کیوں کیا؟

۳۔ تازہ ڈی لکس ایڈیشن پاکستان میں کیوں دستیاب نہیں ہے؟

☆ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے انصاف کی توقع ہے۔
☆ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے فوری اقدام کی اپیل ہے۔
☆ اہلِ علم و ادب سے جائزہ محاسبے کی اپیل ہے۔

منجانب
انجمنِ تحفظِ ناموسِ غالب و رشید احمد صدیقی

☆
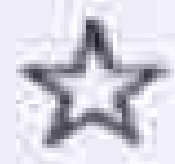
پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے خلاف تحقیقات کا حکم دیدیا

یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہونے والا دیوانِ غالب کا نادر مخطوطہ معین الرحمٰن تک کیونکر پہنچا؟

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود نے گورنمنٹ کالج لاہور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر معین الرحمٰن کے خلاف تحقیقات کا حکم دے دیا ہے تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ دیوانِ غالب کا نادر مخطوطہ، جو یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہوا تھا، ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پاس کیونکر پہنچا۔ باوثوق ذرائع کے مطابق وائس چانسلر اس صورتِ حال پر خاصے پریشان ہیں کہ علمی و ادبی حلقوں میں یہ تاثر مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ یونیورسٹی حکام مخطوطے کی چوری کے واقعے کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جنرل صاحب کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے مجھ سے غلط بیانی کرتے ہوئے مسروقہ نسخہ یہ کہہ کر یونیورسٹی کے لیے عطیہ کیا کہ یہ ان کی ذاتی ملکیت ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ۱۹۹۸ء کے اواخر میں دیوانِ غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ ''نسخۂ خواجہ'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ نسخہ دراصل وہی قلمی نسخہ تھا جس پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے ۱۹۵۴ء میں ''ماہ نو'' میں ایک مضمون لکھا تھا۔ چار سال بعد اس نسخے کا روٹو گراف قاضی عبدالودود لاہور آ کر لے گئے تھے۔ اسی نسخے کو بعدازاں ممتاز غالب شناس عرشی رامپوری نے دیوانِ غالب کے ''نسخہ لاہور'' کے نام سے موسوم کیا تھا اور اپنے مرتبہ نسخہ عرشی میں اس کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔

یہ قلمی نسخہ ایک مدت تک پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی زینت رہا، تا آنکہ اسے

ایک گھناؤنی سازش کے تحت وہاں سے غائب کرایا گیا اور دو برس پہلے اسے معین الرحمٰن نے ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ اس صورت حال کا بروقت نوٹس لیتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں نہایت مضبوط دلائل سے ثابت کر دیا کہ معین الرحمٰن نے جس قلمی نسخے کو''نسخہ خواجہ'' کے نام سے شائع کیا ہے، وہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ نسخہ تھا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا کہ معین الرحمٰن اس سے پہلے بھی کئی بے ضابطگیاں کر چکے ہیں۔ کئی برس پہلے انھوں نے آنجہانی پرتھوی چند کی ''جاگیر غالب'' ہتھیالی تھی اور اسے لاہور سے شائع کر دیا تھا۔ وہ بشریٰ باسط کا مقالہ ''ادا جعفری'' بھی اپنے نام سے رسالہ ''نقوش'' میں شائع کر چکے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے آنجہانی پرتھوی چندر کی طرح معروف مزاح نگار رشید احمد صدیقی مرحوم کو بھی نہیں بخشا اور ان کی تصویر کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر ایک جعلی تصویر تیار کی، جو موصوف کی ایک کتاب ''جدید اردو غزل'' کے پس ورق پر شائع ہو چکی ہے۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کے تعلیمی ادارے سے وابستہ ایک استاد دوسروں کے علمی کاموں کو اپنے نام شائع کرتا ہے اور اس کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔ وائس چانسلر صاحب لائق مبارک باد ہیں کہ اب انھوں نے اس شرمناک بے ضابطگی کا نوٹس لیتے ہوئے معین الرحمٰن کے خلاف تحقیقات کا ارادہ کیا ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ جنوری ۲۰۰۱ء)

☆

دیوانِ غالب کا ''نسخۂ لاہور''

ڈاکٹر تحسین فراقی

روزنامہ ''پاکستان'' کی ۲۵ اگست ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں ایک دو کالمی خبر شائع ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کالج کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر معین الرحمٰن نے دیوان غالب کا ایک نادر قیمتی مخطوطہ، جو ان کے ذاتی ذخیرے میں محفوظ تھا، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو ہدیے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس موقع پر وائس چانسلر اور بعض دیگر حضرات نے معین الرحمٰن صاحب کی اس پیش کش کو پرزور الفاظ میں سراہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دو کالمی خبر میں بعض حقائق کو بری طرح مسخ کیا گیا ہے۔ اس لیے میں ذیل میں اپنی چند معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ محترم چیف ایڈیٹر! آپ چونکہ صحافت کی اس زرّیں روایت کے امین ہیں جو حق گوئی اور آزادی رائے کو ہر چیز پر مقدم سمجھتی ہے، لہٰذا میں امید کرتا ہوں کہ میری یہ معروضات آپ کے روزنامے میں شائع ہو جائیں گی۔

۱۔ آپ کے روزنامے میں دیوانِ غالب کے جس قلمی نسخے کو معین الرحمٰن صاحب کے ذاتی ذخیرے کی ملکیت قرار دیا گیا ہے، وہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا۔ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیوان غالب کے دو ہی قلمی نسخے تھے۔ ایک ''نسخہ شیرانی'' جو وہاں موجود ہے۔ دوسرا یہی نسخہ جسے ممتاز غالب شناس امتیاز علی عرشی نے ''نسخۂ لاہور'' قرار دیا تھا۔ یہی ''نسخۂ لاہور'' اب ''نسخۂ خواجہ'' کی نقاب پہن کر ظاہر ہوا ہے۔ یہ نسخہ جونہی شائع ہوا خلیل الرحمٰن داؤدی اور ہندوستان کے ممتاز محققوں رشید حسن خان اور ڈاکٹر حنیف نقوی نے اسے فوراً پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ یعنی ''نسخۂ لاہور'' قرار دیا۔ یہ نسخہ لائبریری سے چوری کیا گیا یا کرایا گیا۔ اس کے آخری صفحے پر یونیورسٹی کی مدوّر مہر تھی جس پر چیپی لگا کر اسے چھپا دیا گیا اور مخطوطے کے صفحہ ۲۲ پر جہاں یونیورسٹی

لائبریری کا ایکسیشن نمبر تھا اسے چھیل کر مٹا دیا گیا۔ معین الرحمٰن نے تازہ ستم یہ کیا کہ اس قلمی نسخے کو لیمی نیٹ کرا کر اور رنگ بائنڈنگ کے ساتھ لائبریری کو واپس کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مدور مہر پر لگی چٹ اتاری نہیں جا سکتی اور یوں مخطوطے کی اصلیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنے کتابچے ''دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ اصل حقائق'' میں قوی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ معین الرحمٰن جس ''دیوان غالب'' قلمی کو اپنے ذخیرے کی قیمتی متاع قرار دیتے ہیں، وہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا نسخہ تھا۔ یہ نسخہ چونکہ معین الرحمٰن صاحب کے پاس سے برآمد ہوا ہے لہٰذا وہ تعریف اور تحسین کے بجائے جواب دینے کے پابند ہیں۔ معین الرحمٰن صاحب نے یہ نسخہ لائبریری کو لوٹا کر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ اب اس کا ایک ڈیلکس ایڈیشن شائع کرنے والے ہیں۔ میری وائس چانسلر صاحب پنجاب یونیورسٹی سی گزارش ہے کہ وہ انھیں ایسا کرنے سے روکیں کیونکہ اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر کسی قیمتی قلمی نسخے کا ایک صفحہ بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ خبر میں معین الرحمٰن صاحب کو حمید احمد خاں، سید وقار عظیم اور خواجہ منظور حسین کی قلمی روایات کا امین قرار دیا گیا ہے۔ ایسا کہنا دراصل حمید احمد خاں، سید وقار عظیم اور خواجہ منظور حسین کی روحوں کو اذیت دینے کے مترادف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں کوئی شخص بھی اس فارسی مصرع کا مصداق نہیں رہا کہ ''چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔'' حال ہی میں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے حکم پر معین الرحمٰن صاحب کے خلاف یونیورسٹی کے ایک نہایت سینئر استاد نے انکوائری کی ہے۔ اس انکوائری میں ایک طرف تو یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دیوان غالب یہ قلمی نسخہ سو فیصد پنجاب یونیورسٹی ہی کا نسخہ ہے جو یہاں سے غائب ہوا یا کرایا گیا تو دوسری طرف یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ معین الرحمٰن نے اپنی ایک شاگرد بشریٰ باسط کو جنوری ۱۹۹۱ء میں ایم اے (اردو) کا مقالہ بعنوان'' ادا جعفری، شخصیت اور شاعری'' لکھ کر دیا۔ انکوائری کے حقائق کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے بہت سے دستاویزی ثبوت بھی انکوائری رپورٹ کے ساتھ منسلک کیے گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص اپنی ایک شاگرد کو ایم اے کا دو سو

نمبر کا ایک مقالہ لکھ کر جعل سازی کرے، جو شخص پنجاب یونیورسٹی کے قلمی نسخے کو اپنا ثابت کرنے کے لیے اس پر چیپیاں لگائے، جو شخص رشید احمد صدیقی کی تصویر کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر شائع کرے، جو شخص یہ کہے کہ وہ علی گڑھ، الٰہ آباد اور دیگر کئی ہندوستانی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا ہے درآں حالیکہ وہ کبھی ہندوستان نہ گیا ہو، جو شخص عاصمہ وقار کے مضمون نچے (مطبوعہ ''ارتکاز'' اکتوبر ۱۹۹۰ء) کو ماہنامہ ''علامت'' لاہور نومبر ۱۹۹۵ء میں لفظ بہ لفظ اپنے نام سے شائع کر لے اور حد تو یہ ہے کہ جو شخص ہندوستان کے پرتھوی چندر کی پوری کتاب ''جاگیر غالب'' اپنے نام سے شائع کر لے، وہ شخص مذکورہ بالا معزز اور قابل فخر ادبی شخصیات کی روشن روایات کا امین کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسے شخص کے خلاف پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو نوٹس لینا چاہیے۔ کیونکہ انکوائری رپورٹ ان کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔

خدارا ایک ایسے شخص کو، جو اساتذہ کی کمیونٹی کی عزت کو خاک میں ملا رہا ہے اور جو گورنمنٹ کالج جیسے ممتاز ترین اعلیٰ ادارے کی روشن علمی روایات کو داغدار کر رہا ہے، اپنے اخبار کے ذریعے پروموٹ نہ ہونے دیجیے۔

(ڈاکٹر تحسین فراقی۔ نقطہ نظر۔ روزنامہ ''پاکستان'' لاہور۔ ۴ ستمبر ۲۰۰۰ء)

☆

انجمنِ خیال

ماہ نامہ ''تخلیق'' لاہور میں شائع ہونے والے خطوط کے اقتباسات

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور کے اداریے سے تحریک پاتے ہوئے بہت سے اہل علم دوست احباب نے اظہر جاوید صاحب کو خطوط لکھے جو'' تخلیق'' لاہور اگست ۲۰۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔ یہاں ہم اس قضیے سے متعلق اُن علم دوستوں کی آراء درج کر رہے ہیں جن کا ایک نظر مطالعہ، ارباب علم کی تشویش بھی ظاہر کرتا ہے اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بارے میں لوگوں کی آراء کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

محمد خالد اختر (کراچی) کے خط میں سے اقتباسات۔

> ''ہمارے بے چارے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ان سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا کہ ان کی پگڑی اتاری جا رہی ہے۔ میں اس ماجرے کی اصل حقیقت سے بے علم ہوں۔ اگر یہ مخطوطے سے سرقہ یا پلے گرزم کی بات ہے تو............ یہ ایک معصومانہ بھول چوک ہے جسے معاف کر دینا چاہیے۔'' (اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۰۸)

> ''مناسب تو یہی تھا کہ ایک ذمہ دار پروفیسر ہوتے ہوئے وہ لائبریری کے قواعد کا لحاظ کرتے اور اُسے باقاعدہ ایشو کراتے۔'' (ایضاً)

> ''میں نے کہا میں نہیں جانتا کہ معین الرحمٰن صاحب سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے اور اِس معاملے کے اصل واقعات کیا ہیں۔'' (ایضا)

غلام الثقلین نقوی صاحب نے جون ۲۰۰۰ء کے اداریے ''اپنی بات'' کے حوالے سے یہ

لکھا۔

''جون کے شمارے کا مطالعہ حسبِ معمول ''اپنی بات'' سے کیا۔ اس کے ردِعمل میں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں! بس آپ کے ساتھ مل کر ادب کی صالح قدروں اور متین روایتوں کے لیے دعائے خیر ہی مانگ سکتا ہوں۔'' (اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۱۴)

''اداریے میں آپ نے جس صورت حال کا ذکر کیا، وہ نہایت گھمبیر ہے۔ میں نے جب اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی تو دل نہیں مانتا تھا۔ خدا کرے کہ یہ جھوٹ ہی ہو۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور ''راوی'' کے تعلق کے حوالے سے دل بہت دُکھا۔''

(محمد جواد حسن۔ اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۲۵)

جمیل یوسف نے مری سے لکھا:

''تخلیق کا شمارہ جون ۲۰۰۰ پیش نظر ہے۔ اِس دفعہ ''اپنی بات'' میں آپ نے ملک کے موقر ترین تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو کے سربراہ کا علمی ملمع جس خوبصورتی سے اتارا ہے، میں اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو بات پطرس بخاری نے بعض طالب علموں کے بارے میں کہی تھی کہ وہ تعلیم و تدریس کے ہنگاموں میں خود کو اس طرح مامون و محفوظ رکھتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے، یہ بات اب اکثر پروفیسروں پر صادق آتی ہے...... میں سمجھتا ہوں وہ گڑ اور گھی بیچنے والے، پروفیسر سید معین الرحمٰن سے اچھے ہیں۔ اُنھیں اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا احساس ہے۔ وہ اسی کام میں لگے ہوئے تھے جس کے صحیح معنوں میں اہل تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے پرانے مخطوطے چرا کر اپنے نام سے تو نہیں چھپوا رہے تھے۔'' (اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۲۹، ۱۳۰)

پروفیسر بزمی صاحب نے لکھا:

''آپ نے ''اپنی بات'' میں پھر اسی دکھ کا اظہار کیا ہے..... جس طرح آپ نے ان شاعرات کو معاف کر دیا ہے' اسی طرح جناب معین الرحمٰن صاحب کو معاف فرما دیں کہ یہ مرض لا علاج ہے۔''

(اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۳۱، ۱۳۲)

ڈاکٹر عارف ثاقب نے ''تخلیق'' اگست ۲۰۰۰ء میں محترم اظہر جاوید صاحب کے اداریے ''اپنی بات'' بابت جون ۲۰۰۰ء سے تحریک پاتے ہوئے ایک طویل خط لکھا۔ خط کا پورا متن یہ تھا۔

محترم اظہر جاوید صاحب! آداب!

تازہ ''تخلیق'' بابت جون ۲۰۰۰ء اپنے روایتی حسن انتظام کے ساتھ موصول ہوا۔ آپ کا تحریر کردہ اداریہ ''اپنی بات'' مختصر سہی مگر آپ نے جس طرح ادب کی صالح اقدار کی پامالی اور ان کے ناپید ہو جانے پر اظہار افسوس کیا ہے، وہ اہل علم و ادب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ کاش سچ بولنے اور لکھنے کا دعویٰ کرنے والے ادیب اور دانشور مسئلے کی نزاکت کو سمجھیں اور مصلحت کی حدوں سے باہر نکل کر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

محترم لطیف الزماں خاں اور استاد محترم ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کی جن ''چوریوں'' کا اشارہ دیا ہے، وہ محض الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں ہیں بلکہ مبنی بر صداقت ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ بہت سے لوگ اپنی بعض مجبوریوں کے باعث خاموش ہیں، مگر آخر کب تک؟ آج وہی لوگ اپنی رائے کا اظہار کرنے بھی لگے ہیں اور باقاعدہ ایک تحریک کی صورت وجود میں آچکی ہے۔ یہ تحریک کسی سے ذاتی دشمنی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ علم و ادب کی تاریخ کی بقا کے لیے ہے۔

پیرو مرشد! ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کھلم کھلا علمی و ادبی چوریاں کی ہیں۔ لوگوں کی تحریروں کو اپنے نام سے شائع کروایا ہے۔ اپنے نام نہاد منصب کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے چند ہمنوا پیدا کیے ہیں۔ یہ تمام باتیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ جو ادیب' دانشور' محقق اور نقاد چاہے دیکھ سکتا ہے' پڑھ سکتا ہے' اور فیصلہ کر سکتا ہے۔ میں آپ کے

اداریے سے تحریک پاتے ہوئے چند نکات اٹھا رہا ہوں۔ ان تمام کے باقاعدہ ریکارڈ موجود ہیں۔ کون شخص ان سے منکر ہو سکتا ہے؟

1- ڈاکٹر معین الرحمٰن کا مرتب کردہ تازہ ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ'' دراصل پنجاب یونیورسٹی لاہور سے چوری کیا گیا ''نسخہ لاہور'' ہے۔ نسخہ عرشی کے آخری صفحے کا عکس ملاحظہ کریں۔ معین الرحمٰن نے مدوّر مہر کے اوپر ''فتح دین، فتح دین'' کی چیپی لگائی۔ نسخہ خواجہ کے آخری صفحے کا عکس ملاحظہ فرمائیں۔ (نسخہ خواجہ۔ صفحہ ۱۲۷) کیا یہ آنکھ والوں کو دکھائی نہیں دیتا؟ نسخہ خواجہ میں صفحہ نمبر۲۲ کی اختتامی سطور چھیل دی گئی ہیں۔ یہاں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ''نسخہ لاہور'' کا ایکسیشن نمبر تھا۔ کیا یہ تبدیلی لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی؟

2- غالب کے جعلی خطوط ڈاکٹر معین الرحمٰن نے متعارف کروائے۔ ہندوستان تک میں واویلا ہوا۔ یہاں چند لوگ ان کے اس کارنامے کی تعریف کر رہے ہیں۔ ان خطوں کا کوئی اصل ثبوت معین صاحب کے پاس نہیں ہے۔ کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟

3- پرتھوی چندر کی مرتب کردہ کتاب ''جاگیر غالب'' کو معین صاحب نے اپنے نام سے شائع کیا۔ کیا لوگوں کو علم نہیں۔ ''سورج'' کے غالب نمبر میں لطیف الزماں خاں کے جو خطوط بنام معین الرحمٰن اور ڈاکٹر وحید قریشی شائع ہوئے ہیں' ان کا جواب یہ اصحاب کیوں نہیں دیتے؟

4- ''غالب اور انقلاب ستاون'' (دستنبو کا ترجمہ) دو بار ہندوستان میں شائع ہوا۔ پہلی بار دلی یونیورسٹی کے مجلّہ ''اردوئے معلّٰی'' غالب نمبر۲ میں اور دوسری مرتبہ غالب انسٹیٹیوٹ دلی سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ معروف محقق رشید حسن خان صاحب کا کیا ہوا ہے۔ معین الرحمٰن نے اسے اپنے نام سے شائع کیا۔ آخر کیوں؟ کیا لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا؟ کیا یہ کھلم کھلا چوری نہیں؟

۵- رشید احمد صدیقی کی تحریروں کو معین الرحمٰن صاحب نے اپنے نام سے شائع کیا۔ معین الرحمٰن صاحب کا نام لینے والے جن محققین کو اعتراض ہے، وہ ''خطباتِ رشید احمد صدیقی'' مرتبہ لطیف الزماں خاں (مطبوعہ دانیال کراچی) کا دیباچہ

''آئینہ کیوں نہ دوں'' پڑھیں اور پھر جواب دیں کہ کیا معین الرحمن صاحب نے رشید احمد صدیقی کی تحریریں اپنے نام سے شائع نہیں کیں؟ اس دیباچے میں تقابلی اقتباسات موجود ہیں۔ وہ تو یہ لوگ پڑھ ہی سکتے ہیں۔

۶۔ رشید احمد صدیقی کی تحریر کو وہ بجنوری کی تحریر کہتے ہیں اور لوگ پھر بھی انھیں محقق کہتے ہیں۔ (ملاحظہ کریں ''علی گڑھ میگزین'' ۴۹۔۱۹۴۸ء میں رشید احمد صدیقی کا مضمون ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا'' اور ڈاکٹر معین الرحمن کا انٹرویو مطبوعہ ''قومی زبان'' کراچی)۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا مبلغ علم کتنا ہے۔

۷۔ کتاب ''نذر نظیر'' کے صفحہ ۲۷۱ پر معین صاحب لکھ رہے ہیں کہ وہ لاہور، علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ اور بعض دوسری جامعات میں اساتذہ سے پڑھے ہیں۔ یہ کیسا غضب ہے؟ جو شخص زندگی میں کبھی ہندوستان نہیں گیا، وہ ان یونیورسٹیوں میں کیسے پڑھا؟ البتہ جہاں سے انھوں نے ڈگریاں حاصل کیں، ان شہروں کا ذکر نہیں۔ مثلاً کراچی، حیدرآباد۔

۸۔ رشید احمد صدیقی کے ساتھ انھوں نے جعلی تصویر بنائی جس کا انھوں نے اعتراف بھی کر لیا ہے۔ یہ کیا تاثر دینے کی کوشش ہے؟ کوئی محقق نہیں بولا، سوائے لطیف الزماں خاں کے۔

۹۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی طالبہ بشریٰ باسط کا ایم۔اے۔ اردو کا مقالہ ''ادا جعفری، شخصیت اور شاعری'' کو معین صاحب نے اپنے نام سے ''نقوش'' لاہور میں شائع کرایا۔ کیا یہ بات ریکارڈ پر نہیں ہے؟ کیا جواز پیش کریں گے محققین؟ اور کیا قانون ہے پنجاب یونیورسٹی کا؟

۱۰۔ محترم اظہر جاوید صاحب! حد دیکھیے! ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک نادر خط پہلے ''ارتکاز'' کراچی میں عاصمہ وقار کے نام کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہیں اس کے وضاحتی حواشی میرا اضافہ ہیں۔ ''علامت'' لاہور سے وہی خط ڈاکٹر معین الرحمن متعارف کرواتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس کے وضاحتی حواشی میرا اضافہ ہیں۔ محققین اس خط کو آمنے سامنے رکھیں، ایک لفظ کا فرق نہیں ہے۔ صرف متعارف کروانے والے نام کا فرق ہے۔ غضب خدا کا۔ کیا یہ چوری اور جعل

سازی نہیں ہے؟ اس خط سے اردو تحقیق میں کیا اضافہ ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔ جو شخص اتنی سی تحریر اپنے نام سے شائع کروا سکتا ہے، وہ بڑی بڑی تحریروں کو کیا چھوڑے گا؟

تحقیق جن اصول وضوابط اور اخلاقیات کا تقاضا کرتی ہے، وہ معین صاحب میں سرے سے موجود نہیں ہیں۔ انھیں محقق اور غالب شناس کہنا تحقیق کی تاریخ پر داغ لگانا ہے۔ میں نے خود انھیں کہیں غالب شناس لکھا ہے مگر میں صورت حال سے بے خبر تھا۔ اب مجھے علم ہے تو میں یہ لکھ رہا ہوں کہ وہ محقق نہیں ہیں۔ کتنے ہی لوگ دنیاوی معاملات کے باعث مجبور ہیں اور بول نہیں سکتے۔ معین الرحمٰن صاحب نے ان کی زباں بندی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ اپنے حق میں لکھواتے ہیں، محض اپنے عہدے کی بنا پر۔ لوگوں کی تحریریں بغیر ان سے اجازت لیے وہ مرتب کرتے ہیں۔ اب کیا مجھ جیسا طالب علم انھیں یہ بتائے گا کہ یہ تحقیقی بد اخلاقی ہے۔ آج انھیں ان کی حیثیت سے ہٹا دیا جائے تو انھیں کوئی ایک کلمہ خیر کہنے والا نہیں ملے گا۔ وقت اس بات کو بہت جلد ثابت کر دے گا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کا مسئلہ ذاتی نہیں، علمی و ادبی ہے۔ میں بصد احترام بڑے بڑے محققین اور نقاد مثلاً استاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، قابل صد احترام میرے دادا استاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب، مشفق و مہربان محترم مشفق خواجہ صاحب اور دیگر اہل علم و ادب سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس اہم معاملے پر کسی بھی وقت مکالمہ رکھیں، جہاں دلائل اور شہادتوں سے ثابت کیا جائے گا کہ معین الرحمٰن صاحب دوسروں کی تحریریں، بلکہ پوری کی پوری کتابیں اپنے نام سے شائع کرتے ہیں۔ اگر لطیف الزماں خاں، ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر اجمل نیازی جیسے اہل علم و ادب جھوٹ کہہ رہے ہیں تو ان کا محاسبہ ہونا چاہیے اور اگر ان کا کہا سچ ثابت ہوتا ہے تو تاریخِ ادب، معین الرحمٰن پر جعل سازی اور چوری کا لیبل لگائے۔ اس میں اتنا واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لکھے ہوئے کا جواب تو دینا پڑتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

محترم اظہر جاوید صاحب! میں جانتا ہوں آپ کسی ادبی گروہ بندی کا شکار نہیں ہیں۔ آپ برسوں سے ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں، بغیر صلے کی تمنا اور ستائش کی پروا کے۔ بہت سے مواقع پر آپ نے ادبی جہاد بھی کیا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ موجودہ

عہد میں آپ جیسے لوگ تو آنکھ والوں کو دکھائی نہ دیں اور معین الرحمٰن صاحب جیسے نام نہاد محققین کی چند لوگ پذیرائی کرتے رہیں۔ کیا یہ ادب پر اور تاریخ ادب پر ظلم نہیں؟ باوجود اس کے کہ وہی لوگ نجی محفلوں میں معین الرحمٰن کے خلاف بیان بھی دیں۔ کیا یہ منافقت نہیں؟ یہ میرا ادب کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے سوال ہے۔ مجھے محققین اردو سے جواب لے کر دیں۔ آپ بڑے ہیں اور میں یہ تقاضا آپ سے کر سکتا ہوں۔ چلیں! مان لیا سب لوگ جھوٹ کہہ رہے ہیں' معین الرحمٰن صاحب سچ کہہ رہے ہیں۔ وہ کسی ادبی فورم پر آ جائیں۔ کچھ ثبوت لے کر ہم لوگ بھی آ جاتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ جھگڑا تو جھوٹ اور سچ کا ہے۔ کوئی ذاتی تو ہے نہیں!

خط کچھ طویل ہو گیا۔ میں معذرت چاہتا ہوں، مگر آنے والی صدی کو یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ ماضی کی مسخ ادبی تاریخ کا راز کیا تھا۔ ابھی اور بھی بہت سے شواہد منظر عام پر آنے والے ہیں۔ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ حق کو، عدل کو صاحب اولاد ہونا چاہیے کیونکہ ظلم کوچہ و بازار میں بچے جَن رہا ہے، مگر حق بات کہنے میں انھیں خود تردّد ہے۔ آپ نے تو "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھ دیا۔ ادب کی صالح قدروں اور متین روایتوں کے لیے دعائے خیر بھی کی۔ ہم بھی تو خیر کی دعا مانگتے ہیں۔ اسی لیے تو شر کو شر کہہ رہے ہیں!

نیاز مند! ڈاکٹر عارف ثاقب

ابرار عابد صاحب نے لکھا:

> ''آپ نے معین الرحمٰن صاحب کے سرقے کو بھی ادبی حلقوں تک پہنچایا۔ میں تو اِسے کارِ خیر سمجھتا ہوں کہ کم از کم پتا تو چلے کہ ادب میں کیا ہو رہا ہے اور سستی شہرت اور جھوٹی عزت کے حصول کے لیے کیا کیا حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ.''

(اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۳۶)

قیصر نجفی صاحب نے یہ لکھا:

> ''معین الرحمٰن کے حوالے سے ایک ادبی بددیانتی کا انکشاف حیران کن بھی ہے اور لمحہ فکریہ بھی۔ ''چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔'' اگر

پروفیسر صاحب کی علمی و ادبی سطح کے لوگ اس نوع کی ادبی تکفیر کا ارتکاب کر سکتے ہیں تو پھر عام شاعر و ادیب یا محقق کے ادبی ایمان کی پختگی کی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے۔ تحسین فراقی اور لطیف الزماں کے حرف کو ان کی غیر جانب داری اور اصابت رائے کے سبب ادبی دنیا میں جو اعتبار حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ آپ کے حوصلے کی بھی پذیرائی فرض خیال کرتے ہیں کہ جنھوں نے بلا خوف و خطر ایک بہت بڑے ادبی گھپلے کی نشاندہی کر دی ہے۔''

(اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۳۸)

عبدالقیوم نے کراچی سے لکھا:

''اپریل ۲۰۰۰ء کے شمارے میں آپ کی ''اپنی بات'' کی بدولت جون کے شمارے میں وہ بہت سے پردے اٹھا دیے گئے، جن کی اوٹ میں بیٹھ کر ''ادبی احترام کے حقدار'' ناجائز ذرائع استعمال کر کے واہ واہ سمیٹنے کی خاطر خود اپنی ہی شخصیت میں دراڑیں ڈالنے کے مرتکب ہو رہے تھے۔'' (اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۴۶)

حمایت علی شاعر نے لکھا:

''اداریے میں معین الرحمٰن کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا۔ لطیف الزماں میرے زمانۂ طالب علمی کے دوست ہیں۔ اُنھیں ہمیشہ حقیقت کی جستجو رہی ہے۔ اس لیے کئی لوگ اُن سے خفا بھی رہے۔ تحسین فراقی ایک معتبر شخصیت ہے۔ لطیف الزماں نے بھی اُن کی حمایت کی ہے تو بات حتمی ہے۔'' (اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۵۱)

اگست ۲۰۰۰ء کے ''تخلیق'' کے شمارے میں لطیف الزماں خاں صاحب کا بھی ایک طویل خط شائع ہوا۔ خط کا پورا متن حسب ذیل ہے:

محب مکرم، السلام علیکم!

۲۰ جون کو میں اور محترم ثاقب صاحب ''نقوش'' کے دفتر میں جاوید طفیل صاحب سے محو گفتگو تھے۔ پہلے معین صاحب اور پھر نثار احمد فاروقی کا ذکر نکل آیا۔ پہلے تو مدیر ''نقوش'' نے فاروقی صاحب کو کہا He is the meanest of mankind ، پھر ڈاکٹر خلیق انجم کا پورا قول دہرایا اور جب میں نے کہا، وہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے آپ کے والد مرحوم سے، آپ کی والدہ صاحبہ اور میری موجودگی میں انیس ہزار روپے لیے تھے تو وہ ایک دم بلند آواز سے گویا ہوئے کہ آپ انیس ہزار کی بات کرتے ہیں، وہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ وصول کر چکے ہیں ــــــ پھر جاوید طفیل صاحب نے عجیب بات بتائی ــــــ ''نقوش اوارڈ'' کے لیے نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر گیان چند جین صاحب دونوں لاہور آئے ــــــ فاروقی نے جاوید صاحب سے کہا: ''تم نے میرے مقابلہ میں ایک ہندو کو دس ہزار روپے دیے۔'' ایڈیٹر ''نقوش'' نے کہا: ''آپ دس ہزار مجھ سے لے لیں'' ــــــ جاتے وقت پانچ ہزار وصول کیے تو ٹلے۔

۲۲ جون کی صبح کو طوفان باد و باراں ــــــ آنکھ کھل گئی، بجلی غائب ہو گئی۔ میں دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم طفیل آ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ہم دونوں مرحوم طفیل صاحب کی باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ طفیل صاحب کے انتقال کے بعد نثار احمد فاروقی کسی کام سے آئے، قیام اِن کے ہاں تھا، مگر دو لفظ مرحوم کے بارے میں نہ کہے۔

یہ سطور میں نے اس لیے لکھی ہیں کہ معین الرحمٰن صاحب کے نام جو خط میں نے لکھا وہ دراصل فاروقی صاحب کا اصل چہرہ دکھانے کے لیے لکھا تھا ــــــ یہ اس میں اضافہ ہے۔

''نقوش'' کے دفتر سے اٹھے تو ثاقب صاحب آپ کے دفتر پہنچے۔ آپ نے جس محبت، شرافت اور کشادہ دلی سے مجھے خوش آمدید کہا، اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے بتایا تھا کہ معین صاحب نے دو خط اور بھیجے تھے ــــــ آپ نے موضوع بھی بتایا۔

حسب وعدہ میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو خط کا عکس بھیج رہا ہوں۔ سید اکبر علی ترمذی صاحب کی کتاب ''نامہ ہای فارسی غالب'' کا ترجمہ میں نے کیا۔ ''مکتوبات

غالب" کے نام سے شائع ہوا ــــ خلیق انجم صاحب کی رائے آپ پڑھ لیجیے۔
معین الرحمٰن صاحب نے "دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ ــــ صحیح صورت حال" میں لکھا:

"میرے لیے رشید صاحب کی تحریریں دستور العمل اور رہنمائے حیات کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے، اور دوسروں کے بھی، اچھے برے کارناموں اور رویوں کا جواز اور جواب مجھے رشید صاحب سے مل جاتا ہے۔ وہ میرے لیے کیا کچھ نہ تھے ــــ میری زمین، میرا آسمان، میرے نگہبان، میری ساری کائنات تھے وہ!" (صفحہ۲۳)

یہ تو مجھے اب معلوم ہوا کہ "برے" کارنامے بھی ہوتے ہیں۔ میں پوری عبارت پر تبصرہ نہ کروں گا۔ رشید صاحب کو "کائنات" لکھنے والے معین صاحب نے مرحوم پر جو ظلم توڑا، وہ یہ کہ رشید صاحب نے مولانا سلیمان اشرف' علامہ اقبال' مولوی عبدالحق' جواہر لعل نہرو' نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب' اپنے عزیز ترین دوست ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور دیگر اکابرین کے انتقال پر جن الفاظ میں اظہارغم کیا ــــ تمام جملے قینچی سے نکالے، ایک عبارت ترتیب دی اور جب رشید صاحب کا انتقال ہوا تو اس عبارت کو انھی پر چسپاں کر دیا ــــ ملاحظہ کیجیے. "آپ بیتی رشید احمد صدیقی ــــ حیات، افکار اور فتوحات۔ مرتبہ معین الرحمٰن۔ ۱۹۸۳ء"

رشید صاحب کے ساتھ اپنی جعلی تصویر بنوائی اور اب فرماتے ہیں ــــ "اس پر مجھے قریب اور دور کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی داد ملی۔" ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیے۔

مجھے رشید صاحب سے بڑی عقیدت ہے۔ میں نے مندرجہ ذیل اداروں میں گوشہ رشید بنوایا:

۱۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان ــــ اردو فکشن، تاریخ، تنقید اور رسائل کا ذخیرہ۔
۲۔ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کراچی یونیورسٹی۔
۳۔ مدینۃ الحکمت کراچی ــــ میرے لے کر تا ایں دم، دواوین اور شعری مجموعے

''گوشہ رشید'' میں محفوظ ہیں۔

۴۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ ـــــ پاکستانی مطبوعات کا ذخیرہ۔

۵۔ آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے گوشہ رشید میں سب سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ہمارے رشید صاحب کو اقبال سے بڑی محبت تھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اقبال پر شائع ہونے والی ہر کتاب، جو بازار میں مل جائے، بھیج دوں۔ ہمارے ملک کے ادارے ـــــ مقتدرہ، مجلس ترقی ادب لاہور' اقبال اکیڈمی لاہور' بزم اقبال لاہور' مغربی پاکستان اکیڈمی لاہور' انجمن ترقی اردو کراچی ان اداروں کی تمام مطبوعات ''گوشہ رشید'' میں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ رشید صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف شائع کرا چکا ہوں:

۱۔ عزیزانِ علی گڑھ ـــــ آخری خطبہ

۲۔ خطبات رشید احمد صدیقی

۳۔ گنج ہائے گراں مایہ۔ حصہ دوم

۴۔ سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں

۵۔ خطوط رشید احمد صدیقی۔ جلد اول

۶۔ خطوط رشید احمد صدیقی۔ جلد دوم

۷۔ خطوط رشید احمد صدیقی۔ جلد سوم

۸۔ مرشد ذاکر صاحب' ہمارے ذاکر صاحب

۹۔ غالب نکتہ داں

۱۰۔ پیام اقبال

۱۱۔ خطوط رشید احمد صدیقی۔ جلد اول۔ دوسرا ایڈیشن

۱۲۔ میزان نثر۔ جلد اول

۱۳۔ میزان نثر۔ جلد دوم

میزان نثر۔ جلد سوم پریس میں ہے۔ چوتھی جلد آئندہ دسمبر تک، اور زندگی ہے تو پانچویں جلد آئندہ سال جون تک چھپ جائے گی۔

اظہر صاحب! دعا کیجیے کہ میں رشید صاحب کی تمام تحریریں کتابی شکل میں چھپوا

سکوں اور ''گوشہ رشید'' میں کتابوں کی تعداد اتنی ہو کہ کسی اور کے نام کے گوشے میں اتنی کتابیں نہ ہوں۔ پروفیسر نورالحسن خاں صاحب لائبریرین کی تحریر کا عکس بھیج رہا ہوں۔

فراق صاحب کے ایک مصرعہ میں ایک لفظ کی تبدیلی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

ہم سے کیا ہو سکا ''عقیدت'' میں

پروفیسر نورالحسن صاحب یونیورسٹی لائبریرین کی تحریر A.M.U News & Views Vol. 4. No. 2 (Rasheed Numbrer) October 30,1995 میں شائع ہوئی ہے۔

آپ کا مخلص! لطیف الزمان
(ملتان)

☆

کچھ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی صفائی میں

ڈاکٹر تحسین فراقی اس قدر برہم ہیں کیوں؟
شائع غالب کا ہوا دیوانِ مسروقہ تو کیا؟
جیسے تیسے چھپ گیا دیوانِ غالب اور اک
یوں اگر نشہ کسی کا، ہو گیا پورا تو کیا؟
خیر سے "دیوانِ غالب" کا مرتب تو وہ ہے
مصرعِ موزوں اگر وہ پڑھ نہیں سکتا تو کیا؟
کیا زیاں تیرا ہے، اے پنجاب یونیورسٹی!
ایک مخطوطہ اگر کوئی اڑا لایا تو کیا؟
"نسخۂ لاہور" آخر "نسخۂ لاہور" ہے
سادہ لوحی سے وہ سمجھے "نسخۂ خواجہ" تو کیا؟
اشتیاق افزا، حجاب یار ہوتا ہے بہت
مہر نے اوڑھا ہے "فتح دین" کا پردہ تو کیا؟
"حضرت مر" کی ہیں توفیقات اس سے بھی فزوں
ہے غلط املا تو کیا، کج ہے اگر انشا تو کیا؟
"م ر" کے اصل چہرے کی زیارت تو ہوئی
کچھ ملال انگیز ہے سارا یہ افسانہ تو کیا؟
راستی کا یہ زمانہ ہی نہیں جعفر بلوچ
تو نے سچ بولا تو کیا اور تو نے سچ لکھا تو کیا؟

(جعفر بلوچ)

(روزنامہ "جنگ" لاہور۔ ۲ مئی ۲۰۰۰ء)

ترانہ تبریک

(پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے ایک گم شدہ قلمی اور نادر نسخہ ''دیوانِ غالب'' کی سراغ یابی پر)

باغِ معنی میں یہ کیا تازہ شگوفہ کھل گیا
نغمہ پیرا ہیں طیور، آزارِ جان و دل گیا
ہو مبارک تجھ کو اے پنجاب یونیورسٹی!
لائبریری کا تری، ''دیوانِ غالب'' مل گیا
مال برآمد ہوا ہے ایک عادی چور سے
للہ الحمد! اس طرح زخمِ بہاراں سِل گیا
جب تعاقب چور کا تحسین فراقی نے کیا
پاکبازانِ ادب کا غنچۂ دل کھِل گیا
رنگے ہاتھوں یوں جنابِ وزد جب پکڑے گئے
غلغلہ اس کا بہر مجلس، بہر محفل گیا
'خارزار نقد میں موصوف آ الجھے ہیں پھر
زخم پھر ''جاگیرِ غالب'' کا پرانا چھل گیا
کوئی دیکھے ایک چھوٹے سے دھماکے کا اثر
جس سے جعل و سرقہ ووزدی کا ایواں ہل گیا
کارخانے جھوٹ کے، سب جل کے خاکستر ہوئے
جب مرا مصرع ہدف پر بن کے میزائل گیا

(ہاتف زعفرانی)

(روز نامہ ''پاکستان'' لاہور۔ ۲۸ مئی ۲۰۰۰ء)

مسروقہ مخطوطۂ دیوانِ غالب کی سراغ یابی پر

عصر نو! یہ رنگ تیرا قابلِ افسوس ہے — جو بھی کرگس ہے، بزعمِ خویش، وہ طاؤس ہے

صورتاً جو خوش نما ہے، سیرتاً معکوس ہے — ظاہراً جو ہم نفس ہے، باطناً جاسوس ہے

اور ہے ناگفتہ بہ علم و ادب کا حال تو — اس سے ہاتف زعفرانی اور بھی مایوس ہے

علم و انشا کے جہاں میں ہے بہر سو کج روی — شہرِ غفلت میں مگر یہ جرم نامحسوس ہے

بلدۂ لاہور کا سنیے ذرا اک واقعہ — ایک ایسا واقعہ جو غیرت کابوس ہے

وہ جو ہے اس شہر کی پنجاب یونیورسٹی — باعثِ تخلیقِ صد خیام و بطلیموس ہے

ایک خطی نسخہ دیوانِ غالب تھا یہاں — لائبریری جس کو کہتی تھی "مرا ناموس ہے"

ہوگیا گم ناگہاں مخطوطۂ دیواں وہی — سانحہ یہ کتنا درد آگیں ہے اور منحوس ہے

"م، ر" نے نسخہ مسروقہ شائع کروایا — گویا اب یہ نسخہ اس کا خرقۂ سالوس ہے

ڈاکٹر تحسین فراقی نے کیا یہ راز فاش — قد سارق سے بڑا چوری کا یہ ملبوس ہے

"م، ر" ہے اپنے فن کا مجتہد، یادش بخیر — ہر اچکا اور ٹھگ، اس شخص کا پابوس ہے

اس نے ہتھیائی تھی اک "جاگیرِ غالب" قبل ازیں — پی چکا یہ آنجہانی پرتھوی کا جوس ہے

کتنے چہرے ایک چہرے میں دکھائی دے گئے — مالِ مسروقہ بھی جیسے گردشِ فانوس ہے

جب کہی تاریخ ہاتف نے تو تمہیداً کہا — اے خدا! تو دیر گیر و قاہر و قدوس ہے

نسخۂ مملوکۂ پنجاب یونیورسٹی

"نسخۂ مسروقۂ گنجینۂ مانوس" ہے

ہاتف زعفرانی

(مجلّہ "زہاب"۔ شمارہ نمبر ۵ ستمبر ۲۰۰۰ء)

حصہ پنجم: ضمیمہ

(الف) ''دیوانِ غالب، جرمن ایڈیشن'' پر محققانہ نظر — رفاقت علی شاہد

(ب) ''روزنامہ'' پاکستان'' میں شائع ہونے والی خبر کا عکس

''دیوانِ غالبؔ۔ جرمن ایڈیشن'' پر محققانہ نظر

رفاقت علی شاہد

''دیوانِ غالب'' کی جیبی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا، جب ڈاکٹر ذاکر حسین نے برلن (جرمنی) سے نسخ ٹائپ میں ''دیوان غالب'' کا جیبی ایڈیشن شائع کیا۔ زیرِ تبصرہ اشاعت، مبیّنہ طور پر اسی ایڈیشن کو بنیاد بنا کر وجود میں لائی گئی ہے۔ نسخہ ہٰذا کے ٹائٹل اور سرورق پر ''دیوانِ غالب۔ جرمن ایڈیشن'' لکھا گیا ہے اور پیش لفظ نگار نے واضح کیا ہے کہ اشاعت ہٰذا کے ذریعے ڈاکٹر ذاکر حسین کے شائع کردہ جیبی ''دیوانِ غالبؔ'' کو ہی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا ''پیش لفظ'' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے تحریر کیا ہے۔ زیرِ نظر اشاعت میں ''دیوانِ غالبؔ'' کا فارسی دیباچہ اور اس کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ ترجمہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے کیا ہے۔

اشاعت ہٰذا پر تحقیقی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں غلطیوں کی بھرمار ہے، جب کہ خوبیاں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتیں۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ چند بڑی غلطیوں کی نشاندہی کروں گا۔

۱۔ نسخہ ہٰذا کو ''جرمن ایڈیشن'' لکھا گیا ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس جرمن ایڈیشن کا عکس بھی اس نسخے میں شامل ہونا چاہیے تھا جسے اس اشاعت کی بنیاد بنایا گیا ہے، جبھی یہ اشاعت ''جرمن ایڈیشن'' کہلانے کی حق دار تھی۔

۲۔ جدید مشینی کتابت کرانے سے اس ایڈیشن کی وہ انفرادیت برقرار نہ رہی جو جرمن ایڈیشن کے نسخ ٹائپ میں تھی۔ چنانچہ اگر اسے ''جرمن ایڈیشن'' نہ سمجھ کر ''دیوانِ غالب'' کی عام اشاعت تصور کیا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ اس کی جانب خود ''پیش لفظ'' نگار بھی اشارہ کرتے ہوئے یہ لکھ چکے ہیں کہ: ''اس نئی صورت میں

یہ ''جرمن ایڈیشن'' کب رہا؟ اسے ''دیوانِ غالب، کلاسیک ایڈیشن'' کہنا زیادہ حسبِ حال اور برمحل ہوگا۔''

۳۔ اس اشاعت کو ''جرمن ایڈیشن'' کہا گیا، لیکن ''جرمن ایڈیشن'' کا عکس اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ ایسی صورت میں، کم از کم، یہ ضروری تھا کہ ''جرمن ایڈیشن'' کے طرزِ املا، مشمولات اور مروجہ ''دیوانِ غالبؔ'' سے موازنہ کر کے اختلافاتِ متن کو واضح کیا جاتا۔ مذکورہ امور پر مشتمل ایک تحقیقی تفصیلی جائزہ بھی شامل اشاعت ہو سکتا تھا، اور متن کے اندر، حواشی کے ذریعے، مذکورہ وضاحتیں بھی ہونی چاہئیں تھیں۔ اس طرح کم سے کم جرمن ایڈیشن کے متنی خدوخال کا کسی حد تک اندازہ ممکن تھا۔ موجودہ صورت میں ان سب کا نہ ہونا بھی اس اشاعت کے استناد پر انگشت نمائی کرتا ہے۔ جرمن ایڈیشن کے سہل الحصول نہ ہونے کے باعث موجودہ صورت میں ہمارے پاس موازنے کا کوئی طریقہ نہیں کہ آیا اس اشاعت کا متن، جرمن ایڈیشن کے مطابق ہے یا نہیں۔

۴۔ کتاب میں کتابت کی بے شمار غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ متنِ دیوان میں بھی کافی غلطیاں پائی جاتی ہیں، لیکن ''پیش لفظ'' میں کتابت کی غلطیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔

۵۔ املا اور رموزِ اوقات کا خیال نہیں رکھا گیا۔ شاعری کے متون میں عموماً اور کلامِ غالبؔ میں خصوصاً املا اور رموزِ اوقات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ رموزِ اوقات کے بغیر اوّل تو شعر کی درست طور پر خواندگی ہی ممکن نہیں، اس سے بڑھ کر، بعض اوقات، اس التزام کے بغیر شعر بھی مہمل ہو جاتا ہے۔ غالبؔ کے طرزِ املا پر معروف محقق رشید حسن خاں کی پوری کتاب منظرِ عام پر آچکی ہے (''املائے غالب'' غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء۔ نیز ادارۂ یادگار غالب، کراچی۔۲۰۰۰ء)۔ ''دیوانِ غالب'' کی اشاعت میں اسے پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

۶۔ متن میں کئی مصرعے وزن سے خارج ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے ۱۹۲۵ء کے جرمن ایڈیشن کو نظر ثانی کے بغیر ہی جدید کتابت کرا کے شائع کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ

سے کچھ پرانی اور کچھ نئی خرابیاں متن میں پیدا ہو گئی ہیں۔ سہوِ کتابت اور نظر ثانی نہ ہونے کی وجہ سے کئی الفاظ کی صورتیں بدل گئی ہیں۔ اس وجہ سے کئی مصرعے وزن سے خارج ہو گئے ہیں۔ اشاعت سے قبل جرمن ایڈیشن پر نظر ثانی کرنی ضروری تھی۔

۷۔ ''پیش لفظ'' نگار نے لکھا ہے کہ جرمن ایڈیشن پہلے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا اور اس کی دوسری اشاعت ۱۹۲۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ ''نسخۂ جرمن'' اس وقت میرے پیشِ نظر نہیں، لیکن ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے ''غالب ببلیو گرافی'' (علی گڑھ، ۱۹۷۴ء) میں جرمن ایڈیشن کے طبع اول کا سنہ ۱۹۲۵ء اور طبع دوم کا سنہ ۱۹۲۶ء دیا ہے۔ غالبیات کے دیگر محققین بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ پہلی اشاعت ڈاکٹر ذاکر حسین کی مساعی سے منظرِ عام پر آئی، جب کہ دوسری اشاعت کی فرمائش پر ہوئی۔

۸۔ متن میں ''ضمیمے'' کے مآخذ کی وضاحت نہیں کی گئی، جو نہایت ضروری تھی۔ یہ بھی واضح نہیں کہ یہ ضمیمہ کس نے مرتب کیا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے لکھا ہے کہ آغا امیر حسین (ناشر) نے ضمیمے کا اضافہ کیا ہے، گویا یہ ضمیمہ آغا امیر حسین کا مرتب کردہ ہے، لیکن اوّل تو خود آغا امیر حسین کی کوئی وضاحت اس سلسلے میں نہیں ملتی۔ دوسرے خود ضمیمے کے حواشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضمیمہ خود ڈاکٹر معین الرحمٰن کا مرتب کردہ ہے۔ ضمیمے کے بعض حواشی ان کے مرتبہ دیوانِ غالب اور دیگر کتب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ضمیمے کے ص ۲۹۶ پر مندرج کلام کے سلسلے میں ''بیاض نواب علاء الدین احمد خاں علائی'' کا حوالہ ملتا ہے، اور ڈاکٹر معین الرحمٰن اپنی بعض کتب میں یہ لکھ چکے ہیں کہ یہ بیاض ان کی ملکیت ہے۔ اس سے بہ ظاہر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ضمیمہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ہی مرتب کردہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے آغا امیر حسین کے کھاتے میں کیوں ڈالا؟ اس کی وجہ نظر بہ ظاہر درج ذیل بیان کی جا سکتی ہے۔

۹۔ ضمیمے کے کلام کے سلسلے میں استناد کی کوئی بحث نہیں۔ یہ واضح نہیں کہ ضمیمے کا کلام کن مآخذ سے حاصل کیا گیا اور آیا یہ مستند ہے یا نہیں۔ غالباً اسی خامی کی بنا پر

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ضمیے کی ترتیب کی ذمہ داری خود اُٹھانے کے بجائے اس کا ملبہ آغا امیر حسین پر ڈال دیا ہے، اور خود اس معاملے سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کی ہے۔

۱۰۔ اب میں زیرِ نظر ''دیوانِ غالب'' کے سلسلے میں دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں۔ ''دیوانِ غالب'' کا یہ ''جرمن ایڈیشن'' بھی اسی قضیے کا حصہ ہے جو ''دیوانِ غالب'' کے مبینہ ''نسخہ خواجہ'' کی اشاعت سے شروع ہوا، اور یہ قضیہ ابھی تک تازہ ہے۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے ۱۹۹۸ء میں ''دیوانِ غالب'' کے ایک مخطوطے کا عکس شائع کیا اور خواجہ منظور حسین کی نسبت سے اسے ''نسخہ خواجہ'' گردانا۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ یہ نسخہ ان کا ہے۔ اس اشاعت میں انھوں نے غالب کے فارسی دیباچۂ دیوان کا ترجمہ بھی شامل کیا اور لکھا کہ انھوں نے ترجمہ تشکیل دیا ہے یعنی دیباچۂ دیوان کے دیگر تراجم سامنے رکھ کر ایک نیا ترجمہ تشکیل دیا ہے۔ ظاہر ہے ترجمہ کرنے اور ترجمہ تشکیل دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ترجمہ مذکور کے لغوی و معنوی تسامحات کا تحقیقی محاکمہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے کتابچے بعنوان ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق'' میں تفصیل سے کیا ہے۔ کتابچے کے پہلے حصے میں انھوں نے ٹھوس شواہد کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ مبینہ ''نسخہ خواجہ'' اصل میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا گم شدہ نسخہ ہی ہے جسے غالباً مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے یونیورسٹی لائبریری سے غائب کرا کر حاصل کیا گیا۔ کتابچے کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے مبینہ ''نسخہ خواجہ'' کی علمی حیثیت کا محاکمہ کیا ہے۔ اسی کے ذیل میں انھوں نے مذکورہ فارسی دیباچے کے ترجمے کے تسامحات کی نشان دہی کر کے درست صورتیں تحریر کیں۔ نتیجتاً ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ڈاکٹر تحسین فراقی کی تصحیحات کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے تشکیل کردہ ترجمے میں تصحیحات کرلیں، لیکن اپنی کم ظرفی کے سبب نہ تو ڈاکٹر تحسین فراقی سے استفادے کا اعتراف کیا اور ان سے استفادہ کرنے پر ان کا شکریہ ہی ادا کیا۔

مذکورہ بالا نظرِ ثانی شدہ ترجمہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ''دیوانِ غالب'' (مبینہ ''نسخہ

خواجہ'') کے اس ڈی لکس ایڈیشن میں شامل کیا جو ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔ یہی ترجمہ پیشِ نظر ''دیوانِ غالب، جرمن ایڈیشن'' میں شامل ہے اور اسے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے کھاتے میں ڈالا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ کتاب میں بہ طور مترجم ان کا نام اُن کے ایما سے ہی شامل کیا گیا ہوگا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی فارسی دانی کا پول تو ڈاکٹر تحسین فراقی پہلے ہی کھول چکے ہیں۔ اپنے کتابچے میں انھوں نے ٹھوس شواہد کے ذریعے واضح کر دیا ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن تو فارسی زبان کے اتنے ماہر بھی نہیں کہ فارسی عبارت کی خواندگی ہی صحیح طور سے کر سکیں۔ وہ فارسی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کے اہل کہاں ہیں۔ جب کہ زیرِ نظر نسخے میں واضح طور پر تحریر ہے، بلکہ دو جگہ تحریر ہے، کہ غالب کے فارسی دیباچۂ دیوان کا ترجمہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے کیا ہے۔ اس سے پہلی نظر میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ فارسی سے اُردو میں ترجمہ نہیں کر سکتے۔ فطری طور پر، اس امر کا واضح اظہار ڈاکٹر معین الرحمٰن کو، پہلے ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کا مدلل و مفصل جواب دے کر کرنا چاہیے تھا۔ اسی مقصد کے لیے تو انھوں نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچے کے جواب میں ایک کتابچہ بعنوان ''دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ صحیح صورتِ حال'' لکھا، لیکن اس میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کا مدلل اور شافی جواب دینے میں ڈاکٹر معین الرحمٰن بُری طرح ناکام رہے۔ اُن کا یہ کتابچہ کوسنوں اور بدعاؤں کا مجموعہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن سنجیدہ علمی حلقے میں اس کا بار پانا ممکن نہیں۔ یوں ڈاکٹر تحسین فراقی کے مدلل اعتراضات کا تسلی بخش جواب نہ دے کر ایک طرح سے انھوں نے ان اعتراضات کی صحت تسلیم کر لی۔ اس پر مزید ستم یہ کیا کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کی روشنی میں فارسی دیباچہ غالب کے اردو ترجمے (تشکیل کردۂ خود) کی تصحیح بھی کر ڈالی اور یہ تصحیح شدہ ترجمہ مبینہ ''نسخہ خواجہ'' کے ڈی لکس ایڈیشن میں بھی شامل کر دیا۔ ان ٹھوس شواہد سے یہ اظہر من الشمس ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے اس اعتراض پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ وہ فارسی زبان سے نابلد ہیں۔ ایسی صورت میں غالب کے فارسی

دیباچہ دیوان کے اُردو ترجمے کو اپنے کھاتے میں ڈالنا شدید قسم کی ہٹ دھرمی اور مثبت ادبی اقدار کی پاسداری سے ڈاکٹر معین الرحمن کی بغاوت پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔

۱۱۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے اپنے ''پیش لفظ'' کے ص۱۱ پر دعویٰ کیا ہے کہ غالب کے فارسی دیباچہ دیوان کی ''مشینی کمپوزنگ میں کئی سہو در آئے ہیں۔ انھیں زیرِ نظر (تازہ) ایڈیشن میں مصدقہ ماخذ (مآخذ) سے درست کر دیا گیا ہے'' لیکن اول تو انھوں نے ان مآخذ کی وضاحت نہیں کی جن کی مدد سے مذکورہ فارسی دیباچے کا متن دست کیا گیا۔ غالباً ڈاکٹر معین الرحمن کے نزدیک اس التزام کی کوئی اہمیت نہیں، حالانکہ تحقیق و تدوینِ متن کا یہ بنیادی تقاضا ہے۔ دوسرے۔ درستی کی اصل صورت یہ ہے کہ ۲ صفحات کی ۳۶ سطور کے اس فارسی دیباچے میں ۲۲ غلطیاں موجود ہیں جو ''مصدقہ مآخذ'' کے ڈھول کا پول کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی ''دیوان غالب، جرمن ایڈیشن'' کی یہ اشاعت غیر مستند، غیر اہم، باطل دعووں کی کھتونی اور بے پروائی کا شاہ کار ہے۔ اس اشاعت میں ایسی ایک خصوصیت بھی نہیں جس کی وجہ سے اسے اہمیت دی جا سکے۔ اشاعت ہٰذا کی واحد خوبی بھی پیش لفظ نگار یہ لکھ کر جھٹلا چکے ہیں کہ

> ''اس نئی صورت میں یہ ''جرمن ایڈیشن'' کب رہا؟ اسے ''دیوانِ غالب، کلاسیک ایڈیشن'' کہنا زیادہ حسب حال اور برمحل ہوگا۔''
>
> (ص۱۲۔ ''پیش لفظ'')

(غیر مطبوعہ)

☆

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے

ادبی تاریخ کے بڑے فراڈ کی تحقیقات کا حکم دیدیا

گورنمنٹ کالج شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر معین الرحمن نے غالب سے نسخہ لاہور کو نسخہ خواجہ بنادیا

لاہور (خبر نگار خصوصی) پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود نے پنجاب کی ادبی تاریخ کے ایک بڑے فراڈ کی تحقیقات کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر معین الرحمن نے دیوان غالب کا نسخہ لاہور اپنے نام سے "نسخہ خواجہ" کا نام دے کر شائع کرا کے نہ صرف مجھے دھوکا دیا بلکہ علم و ادب کے ساتھ بھی بے وفائی کی وہ پیر اور منگل کی

بقیہ نمبر 49 صفحہ 6 پر ملاحظہ فرمائیں

روزنامہ پاکستان
۱۷ فروری ۱۹۹۹ء

49 بقیہ فراڈ

درمیانی شب گورنر ہاؤس میں ایک عشائیے کے موقع پر روزنامہ پاکستان سے گفتگو کر رہے تھے وائس چانسلر نے کہا ڈاکٹر معین الرحمن نے مذکورہ نسخہ یہ کہہ کر میرے حوالے کیا تھا کہ یہ ان کا دریافت کردہ مخطوطہ ہے جسے وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے لئے عطیہ کر رہے ہیں اس خاص موقع کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں تو بعض علم دوست حلقوں اور افراد نے میری توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ غالب کے دیوان کا یہ نسخہ تو پہلے ہی جامعہ پنجاب کی ملکیت ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہو گیا تھا انہوں نے بتایا کہ میں نے مذکورہ مخطوطے کا بغور جائزہ لیا تو اس میں واقعی ہیرپھیر کی گئی تھی یاد رہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن نے نسخہ خواجہ کے نام سے غالب کا نایاب دیوان شائع کر کے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ مخطوطہ انہیں برسوں پہلے ایک کباڑیے کی دکان سے ملا تھا لیکن بعض محققین کے انکشاف پر وہ پریشان ہو گئے اور انہوں نے نسخہ بطور عطیہ جامعہ پنجاب کی لائبریری کے لئے وائس چانسلر کو دے دیا یہ امر قابل ذکر ہے کہ چند سال پہلے بھارت کے معروف غالب شناس پرتھوی چند کی تالیف "جائزہ غالب" بھی ڈاکٹر معین الرحمن نے اپنے نام سے شائع کر دی تھی۔
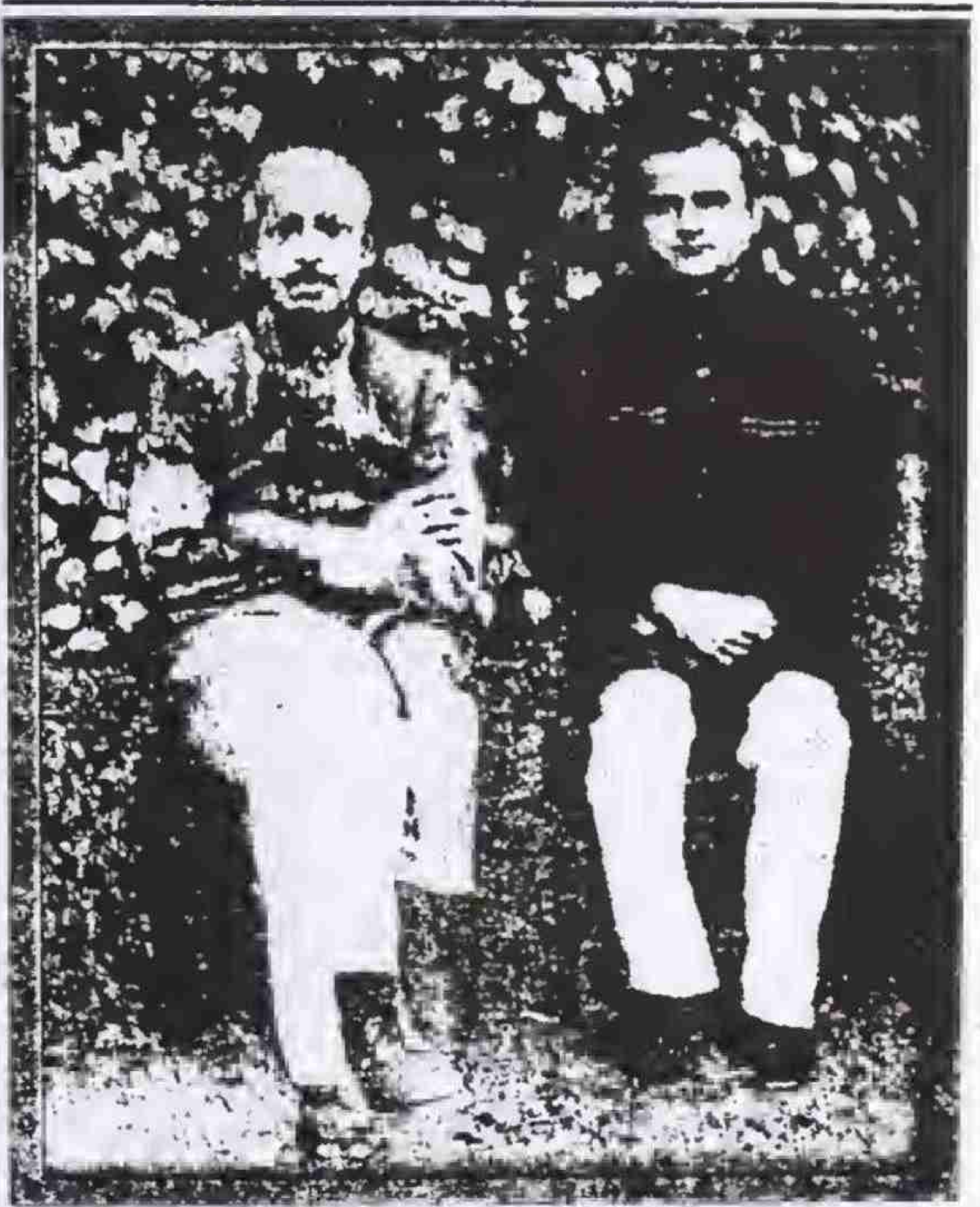
رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن جن کی آپس میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی

چند مشاہیر کی آراء

''تحسین کا کتابچہ ''اصل حقایق'' دقیق اور عالمانہ تحقیق کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ تحسین کے کتابچے کے آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے نسخے' عرشی صاحب اور قاضی عبدالودود کے نسخے اور نسخۂ خواجہ کے بعض صفحات کے جو عکس دیئے ہیں' ان کی وحدت و یکسانی کو بھانپنے کے لیے کسی ماہر تحریر کی ضرورت نہیں' ایک عطائی بھی بیک نظر پہچان سکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسخے کے عکس ہیں۔

تحسین نے فارسی متن کی قرأت اور اردو ترجمے میں جو تصحیحات تجویز کی ہیں وہ مایۂ فخر ہیں۔''

(ڈاکٹر گیان چند)

''معین الرحمٰن کا نسخہ مشکوک تو تھا ہی۔ لکھنؤ میں حنیف نقوی ملے تھے۔ کہتے تھے یہ وہی قدیمی نسخہ ہے تحسین فراقی نے بہت محنت کر کے بات قطعی طور پر ثابت کر دی۔ معین کی لغزش پر افسوس ہوا۔ اس سے پہلے انہوں نے پرتھوی چند فوٹو گرافر کی ''جاگیر غالب'' پر قبضہ کرنا چاہا تھا۔ بعد میں مان لیے کہ وہ پرتھوی چند کی کتاب تھی۔''

(ڈاکٹر گیان چند)

''مخطوطہ دیوان غالب کھلا ہوا چوری کا مال ہے۔ آخر یہ مصرع بے معنی تو نہیں۔ چہ دلاور است ''

(رشید حسن خاں)

''ہمالیہ پہاڑ جیسے تین شواہد ایسے ہیں جنھیں اپنی جگہ سے جنبش دینا محال ہے اور وہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ وہی دیوان ہے جسے سید عبداللہ صاحب اور امتیاز علی عرشی صاحب نے ملاحظہ فرمایا تھا۔''

''ص ۲۲ شاید پنجاب یونیورسٹی لائبریری نے نمبر اندراج کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اس صفحے یعنی صفحہ ۲۲ پر نمبر کھرچا گیا ہے۔ آخری صفحے پر اسی جگہ مہر ثبت تھی جو ڈاکٹر تحسین فراقی کے پیش کیے ہوئے عکس میں صاف ہے۔ اس جگہ ''فتے دین'' کی چٹ لگی ہوئی ہے۔ اسے ہٹا کر کمپیوٹر کی مدد سے سراغ رسانی ممکن تھی۔''

(ڈاکٹر نور الحسن نقوی)

''سیّد صاحب موصوف نے فراقی صاحب کے بے شمار وزنی اعتراضات میں سے کسی ایک اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا ہے بلکہ ؎

جواب خط پہ وہ غور مسلسل　　　　لکیریں سی بنا کر رہ گئے ہیں

البتہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کی کلیتہً تائید کے علاوہ مزید اعتراضات وارد کرتے ہوئے ملک کے مقتدر ارباب فضل وکمال نے اعلائے کلمۃ الحق کے ضمن میں غالب شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ سیّد صاحب کسی مخطوطے کو سمجھنے اور اسے مرتب کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ اسی لیے ان کے مرتبہ نسخۂ خواجہ میں لغزشوں کی بھرمار ہے۔''

(خلیل الرحمٰن داؤدی)

علم و عرفان پبلشرز

C-7 ماتھر سٹریٹ لوئر مال روڈ لاہور فون: 7352332

E-mail: waqas_g_1999@yahoo.co.uk